سرسید کے افکار و نظریات پر مبنی خصوصی شمارہ

نذرِ سرسید

سرسید ہال (شمالی) کا عصری ترجمان

مدیر

توصیف بریلوی

نائب مدیر

ظہیر حسن ظہیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

سرپرست

شیخ الجامعہ

پروفیسر طارق منصور

نگراں

پروفیسر عرشی خان

(پرووسٹ)

مدیر

توصیف بریلوی

نائب مدیر

ظہیر حسن ظہیرؔ

مجلس ادارت

- ابراہیم افسر
- عبدالرحمٰن
- سید محمد عقیل
- عباس رضا
- عبدالقوی
- غلام سرور
- ریاض احمد

مجلس مشاورت

- پروفیسر صغیر افراہیم
- پروفیسر طارق چھتاری
- پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی
- پروفیسر مولا بخش اسیرؔ
- ڈاکٹر راشد انور راشدؔ
- ڈاکٹر زبیر شاداب
- معید رشیدی

مضمون نگار کی آرا سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

پبلشر: کتابیہ انٹرنیشنل (علی گڑھ، یوپی)

www.urduchannel.in

فہرست

○ پیغام	پرووسٹ	9
○ پیغام	ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ	10
○ اداریہ	مدیر	11

مضامین

۱	ہندوستان کی عورتوں کی حالت	سرسید احمد خاں	13
۲	عورتوں کے حقوق	سرسید احمد خاں	17
۳	سرسید کے حالات	جے. کینیڈی	12
۴	حیات سرسید: چند نمایاں پہلو	راج موہن گاندھی/ترجمہ: شمسی طہرانی	31
۵	سرسید کی اولین صحافتی کاوشیں	پروفیسر شافع قدوائی	37
۶	سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	41
۷	سرسید کا خط کرنل گراہم کے نام	پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی	53
۸	مضامین سرسید کی عصری معنویت	ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی	61
۹	معمار قوم سرسید احمد خاں	رانا عبدالرزاق خان	68
۱۰	مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں سرسید.....	ابراہیم افسر	72
۱۱	سرسید اور قوم کا درد نہاں	عباس رضا	81
۱۲	احیائے فکر سرسید: وقت کا اہم تقاضا	سید محمد عقیل	86
۱۳	سرسید کا خواب	نازمین	91
۱۴	سرسید کی صحافت نگاری	محمد عالم	95
۱۵	سرسید کی دینی وابستگی	شمشاد بی	100

www.urduchannel.in

۱۶	سرسید کا تعلیمی نقطۂ نظر اور تہذیب الاخلاق	معصوم زہرا	104
۱۷	طلاق ثلاثہ سرسید کی نظر میں	توصیف بریلوی	108
۱۸	سرسید اور تحریک نظم جدید	محمد شاہد	114
۱۹	سرسید کا سفر مدرسۃ العلوم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تک	محمد فرحان دیوان	121
۲۰	اردو سفرنامہ اور سرسید کا مخصوص زاویۂ فکر	حنا فردوس	128
۲۱	سرسید کا تصور تعلیم	ریاض احمد	133
۲۲	سرسید کی تصنیف 'آثار الصنادید'.....	عبدالرازق	138
۲۳	سرسید عصر حاضر میں مریض ملت کا معالج اعظم	ریاض احمد وانی	144
۲۴	سرسید احمد خاں اور ہماری ذمہ داریاں	غلام سرور	150
۲۵	سرسید احمد خاں: حیات اور کارنامے	ارشد رفیق	153
۲۶	رسالہ اسباب بغاوت ہند	نثار یاض	156
۲۷	سرسید احمد خاں کی تاریخی حسیت	تصنیف عزیز	161
۲۸	سرسید کے تعلیمی تصور میں تعلیم نسواں کے عناصر	ناہیدہ خاتون	165
۲۹	رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا.....	فرحان خان	169
۳۰	مقاصد سرسید اور عداوت فرنگ	محمد سفیان احمد	174
۳۱	چمن سرسید اور عہد حاضر میں اس کی معنویت	نیاز الحق	180
۳۲	سرسید احمد خاں: ایک شش جہات شخصیت	حارث حمزہ لون	184
۳۳	سرسید احمد خاں اور خطبات احمدیہ	خیر الدین اعظم	195
۳۴	اردو زبان کے فروغ میں سرسید کی حصہ داری	فوزیہ ارشاد	200
۳۵	سرسید کا سفرنامہ 'مسافران لندن'	محمد کامران علی خاں	205
۳۶	سرسید- سدا بہار شخصیت	کہکشاں ظہور	210
۳۷	علی گڑھ تحریک اور سرسید کی گوناگوں خدمات	مسرت حمزہ لون	213
۳۸	سرسید کی ضرورت عہد حاضر میں	محمد ناظم	223
۳۹	ایک لازوال شخصیت: سرسید احمد خاں	ادیبہ صدیقی	225

www.urduchannel.in

منظومات

- راشد انور راشدؔ
- اعجاز عبید
- نیاز جیراجپوری
- معید رشیدی
- انورؔ وارثی
- عامرؔ ربانی
- الیاسؔ چشتی
- سرور ساجدؔ
- اسلمؔ ایڈوکیٹ
- شارقؔ عدیل
- زبیر شاداب
- ظہیر حسن ظہیرؔ
- محمد سالمؔ

افسانے

بن باس کے بعد	احمد رشید (علیگ)	237
کاشی واس	وسیم حیدر ہاشمی	244
پیسے ٹائٹس	ڈاکٹر محمد مستمر	248
دہشت گرد کون	عبدالرحمٰن	253

www.urduchannel.in

ساجن سنگھ، بی.ایف.اے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

انتساب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نوجوان نسل کے نام

جو

سرسید کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر
کرنے میں ہمہ وقت کوشاں ہے

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

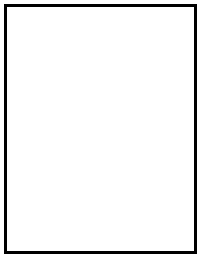

پیغام

یہ جان کر دلی مسرت ہو رہی ہے کہ سرسید ہال (شمالی) کا سالانہ جریدہ خصوصی شمارے کی شکل میں ''**نذرِ سرسید**'' کے نام سے منظر عام پر آ رہا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہالوں میں اس طرح کے ادبی و ثقافتی رسائل ہر سال پابندی سے شائع ہوتے ہیں، جس سے طلبا کی تخلیقی کاوشوں اور فکر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مستقبل کے لیے بھی تحریک و تربیت ملتی ہے۔ اس طرح کی ادبی سرگرمیاں آگے کافی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

جن مقالہ نگاروں اور تخلیق کاروں نے اس رسالے میں قلمی تعاون کیا، ان کا بہت بہت شکریہ اور نوجوان ادیب توصیف بریلوی (مدیر) کو اس رسالے کے لیے دلی مبارکباد۔ ساتھ ہی ان کی مجلس مشاورت اور مجلس ادارت میں شامل اساتذہ کرام و دیگر حضرات کا بھی تہہ دل سے شکریہ! کہ جن کی کوششوں اور مشوروں نے رسالہ کے حسن و وقار میں اضافہ کیا۔ شکریہ!

پروفیسر عرشی خان
(پرووسٹ)
ایس.ایس. ہال (شمالی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

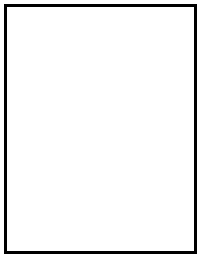

پیغام

توصیف بریلوی صاحب!

آپ کا خط پا کر دلی مسرت ہوئی۔ خدا آپ کو صحت کے ساتھ سلامت رکھے اور ترقی مسلسل عطا فرمائے، آمین۔ میں عادت کے خلاف ذرا دیر سے جواب دے رہا ہوں۔ دراصل میری کوشش تھی کہ صدیوں میں پیدا ہونے والے مصلح و قائد دور اندیش سرسید احمد خاں کے بارے میں تعمیل ارشاد کر سکوں۔ کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو سرسید ایسی ایک اور شخصیت میسر آ جاتی تو جہالت کا جو اندھیرا اور قتل و غارت ہمیں آج کل درپیش ہے اس سے چھٹکارا مل جاتا۔ تعصب و تفرقہ کی تاریکی چھٹ جاتی اور ہم ترقی یافتہ امت ہوتے!

آپ کی مخلصانہ یاد فرمائی اور دعوت میرے لیے باعث افتخار ہے۔ میں نے کوشش کی مگر ان دنوں بوجوہ لکھنا پڑھنا ترک ہے اور میں آپ کے احباب قلم کے ساتھ شرکت مجلّہ سے معذور ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔ اسی تفصیل کو کافی جانیے گا۔ میں آپ کو مدیر منتخب ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے معاونین و رفقا کار کے ساتھ کامیاب ہوں اور سرسید احمد خاں پر ایسے معیاری مضامین کا گلدستہ پیش کر سکیں جو ایک تابناک مثال ثابت ہو، آمین۔

ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ

24 Park Hill Drive, Bradford,

B.D. 8, O.D.F. (U.K.)

www.urduchannel.in

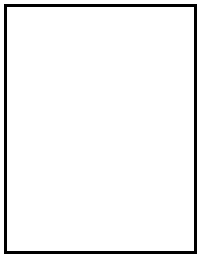

اداریہ

یہ تلخ حقیقت ہے کہ گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا لیکن ہمیں اس گزرے ہوئے وقت کا افسوس کرنے کے بجائے اس سے سیکھنا چاہیے۔ آگے بڑھنے ہی میں فلاح ہے کیوں کہ جمود ہماری قوت ارادی کے لیے بے حد مضر ہے۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ دو چار اور سرسید پیدا ہو جاتے تو ہماری قوم کی حالت بہتر ہو جاتی۔ اس ضمن میں کہنا چاہوں گا کہ سرسید اور ان کے رفقا نے قوم کے لیے جو کیا وہ ایک عظیم کارنامہ ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے جس کا یہاں پیش کرنا ممکن نہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے طور پر اپنا کام کیا، اب ہمیں اپنے طور پر اپنا کام ایمانداری سے کرنا چاہیے اور مقصد کے حصول کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہنا چاہیے کیوں کہ اسلاف کے کارناموں کو صرف یاد کرنے سے نہیں بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہی ہم کامیابیوں سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ ہم علیگ ہیں تو ہمیں یہاں سے اٹھنے والے ابر کا حصہ بن کر سارے جہاں پر برسنا چاہیے۔

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا

ہمیں اپنی فکر کو عالمی سطح پر بلند کرنا ہوگا تب کہیں جا کر خواب سرسید شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ یہاں صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ قربانی، ایثار اور خدمت کا جذبہ بلا مذہب و ملت کی تفریق کے جو سیکھنے کو ملا ہے ہمیں اس پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی جذبے کے ساتھ ہم اپنی قوم اور ملک کی خدمت کر پائیں گے۔

یہ خصوصی شمارہ سرسید احمد خاں کی ۲۰۰ ویں یوم پیدائش کے موقع پر اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ محبان

www.urduchannel.in

سرسیداس سے استفادہ کریں گے اور سرسید کے افکار وخیالات کومزید وسعت وہمہ گیری عطا کریں گے۔

اس شمارے میں سرسید پرمختلف نوعیت کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری اور افسانے بھی ہیں۔ شمارے میں شامل سبھی اہل قلم کا دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے وقت پر اپنے مضامین بھیجے۔ مجلس ادارت اور مجلس مشاورت میں شامل تمام اساتذہ کرام و دیگر ساتھیوں کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں بالخصوص استاد محترم پروفیسر مولا بخش کا احسان مند ہوں جن کی معاونت اور حوصلہ افزائی سے میری مشکلیں آسان ہوئیں۔ ان سبھی کی محنت کا ثمرہ آج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ نائب مدیر ظہیر حسن ظہیرؔ صاحب کا شکریہ بجالانا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس رسالہ کی اشاعت میں شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور رسالے کی اشاعت میں ہمیں ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

مدیر
(توصیف بریلوی)
سرسید ہال (شمالی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

سرسیداحمدخاں

ہندوستان کی عورتوں کی حالت

جب کہ ہندوستان کے مردوں کی حالت بلحاظ معاشرت بدرجہ غایت قابل اصلاح ہے تو ہندوستان کی عورتوں کی حالت دیکھا چاہیے کیا ہوگی، کیونکہ عقلی روشنی میں عورتیں بہ نسبت مردوں کے قطعاً ناقص مجہول ہوئی ہیں اور باوجود اس نقصان کے علمی روشنی سے ان کو اس قدر بھی بہرہ نہیں ہے جس قدر کہ ہندوستان کے مردوں کو ہے جس کے سبب سے وہ اپنی طرز معاشرت میں اس مخلوق کے مشابہ ہیں جو انسان کی صورت میں مخلوق ہوئی ہے اور سیرت انسانی سے معرا ہے۔ اگر ان کو ایک ایسے طائر کے ساتھ تشبیہ دی جاوے جو بچپن میں گرفتار قفس ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے، کیونکہ جس طرح وہ جانور باوجود طائر ہونے کے اُڑنے کی کیفیت نہیں جانتا اسی طرح یہ باوجود انسان ہونے کے آثار انسانیت سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے خیالات میں اس قدر تیرگی ہوتی ہے کہ وہ بہت کم، بلکہ بالکل کسی چیز کی اصلی کیفیت اور اس کی مناسب تدبیر کو نہیں سمجھ سکتیں اور ان کے خیالات میں ایک ہولناک ابتری ایسی ہے کہ اس کے تصور سے وحشت معلوم ہوتی ہے اور باوجود ان تمام خرابیوں کے ان کی جبلت میں اپنے قدیمی اطوار کی پابندی ایسی ہے کہ اس پابندی کو موت و حیات پر بدرجہا فائق سمجھتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہندوستان کے مردوں کی وہ کوشش جو وہ اپنے انتظام خانہ داری اور حسن معاشرت کی امید سے کرتے ہیں، بالکل رائیگاں جاتی ہے اور ان کے اصرار اور سخت پابندی مردوں کی تدبیر پر غالب آجاتی ہے اور جو امور کہ خاص عورتوں کی ذات سے متعلق ہیں اور ان میں مردوں کو دخل نہیں ہے، اس درجہ ابتر ہوتے ہیں کہ ان کے خیال کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں بہ نسبت ان کے عجائب پرستی زیادہ ہے اور بجائے علمی خیالات کے اعتقاد کی غلطی میں زیادہ پڑی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی قدیمی رسم کے متغیر کرنے سے کچھ اسی لیے متنفر نہیں ہوتیں کہ وہ اس کو اپنی قدیمی عادت کے خلاف سمجھتی ہوں، بلکہ وہ اپنے ذہن میں بعض تغیرات کو موت و حیات کا باعث سمجھتی ہیں۔ وہ اپنی موت، زندگی اور رنج و غم و خوشی و خرمی میں اپنی پرانی رسوم کو زیادہ موثر سمجھتی ہیں اور یہ جانتی ہیں کہ ان رسوم کی تبدیلی سے ایک مصیبت کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ وہ امراض کو بھوت اور

www.urduchannel.in

آسیب کا اثر سمجھتی ہیں اور اسی وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ مرض کے علاج کی طرف عاقلانہ طور سے متوجہ ہوں، اول جھاڑ پھونک اور نذر و نیاز سے کام لینا جانتی ہیں۔ اگر ان کے ہاں کوئی ضرورت بشری پیش ہوتو وہ اصل تدبیر کو چھوڑ کر غل شور اور منت اور اٹھاؤنی سے کام لیتی ہیں، مثلاً اگر ان کے گھر میں کوئی زچہ ہوتو بجائے اس کے کہ وہ آسانی سے بچہ پیدا ہونے کی فکر کریں ایک بیہودہ مجمع سے زچہ کو گھیر کر اپنی معمولی رسموں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور جو صدمہ اس زچہ پر ان کی بیہودہ رسم سے ہوگا اس کی ہرگز پروا نہیں کرتیں اور جو دستور ولادت کے اوقات میں ان کے جہل سے مقرر ہو رہے ہیں اگر ان کو کوئی عاقل زچہ پر رحم کر کے دفع کرنا چاہے تو قیامت تک اس کو نہیں مانتیں۔ دوا اور غذا میں وہ ہرگز کسی حکیم یا ڈاکٹر کی مداخلت کو پسند نہیں کرتیں اور انھیں اپنے پرانے دستوروں کے موافق کام کرتی ہیں۔ اگر زچہ صدمے سے بے ہوش ہو جاوے تو وہ فوراً گنڈا فلیتہ کرنے کی جانب متوجہ ہو جاتی ہیں اور گو اسی حالت میں زچہ تمام ہو جاوے، مگر ان کے خیال کو تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایک شائستہ ملک کی عورت نے جو کسی ہندوستانی عورت کی ولادت کی کیفیت دیکھی ہے اس کو اس نے قلمبند کیا ہے، چنانچہ ہم بھی اس کو ملاحظہ ناظرین کے واسطے نقل کرتے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اس کے دیکھنے سے ہمارے ناظرین اخبار کو اس بات کا اندازہ معلوم ہو جاوے گا کہ ہندوستان کی عورتوں کی حالت اور ناواقفیت کس درجے ہے اور اس کے سبب سے تمام ہندوستان کیسی خطرناک حالت میں ہے۔ بجائے اس بات کے کہ چند عورتیں مجتمع ہو کر کسی کام کو اسلوب کے ساتھ کر سکیں اور اپنے کرنے کے کاموں میں وہ مثل انسان کے کوئی کام کر سکیں، یوں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا مجمع ایک سخت مصیبت اور ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ انتظام خانہ داری میں ایک معاون سمجھی جاویں، اور مخالف سمجھی جاتی ہیں اور بجائے اس بات کے کہ وہ کسی کام میں مشورہ کار ہوں، اور مخالف اور بے جا ضد سے کام کو خراب کر دیتی ہیں۔ دوا یا غذا یا لباس کی تدبیر سے اکثر محض ناواقف ہوتی ہیں اور ایک پرانے قاعدے کی نہایت پابند ہوتی ہیں۔ یہ سب اسی جہل کا سبب ہے جو آج کل ہندوستان کی عام عورتوں میں بدرجہ غایت پھیلا ہوا ہے اور جس کے سبب سے ہندوستان کے مردوں کو ایک وحشی کے ساتھ زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور جس کی بدولت ان کی زندگی اور موت اور شادی و غم اور صحت و مرض سب بے لطف ہیں۔ اب ہم اس کیفیت کو نقل کرتے ہیں جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے:

> ''میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ رانی جننے کو ہے اور بہت گھبرا رہی ہے۔ اس کی ساس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ اے میم صاحبہ! میری بہو کو ایک رات اور ایک دن سے اسی طرح درد لگے ہوئے ہیں پر جننے کا کوئی طور معلوم نہیں ہوتا اور رانی کے شوہر کے مرنے کے وقت جیسا شور و غل تھا ویسا ہی شور و غل اب

www.urduchannel.in

بھی عورتیں اس کے گرد جمع ہوکر کر رہی ہیں اور دس بارہ عورتیں اس زچہ کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی اپنی کہہ رہی ہیں۔ایک کچھ کہتی ہے تو دوسری کچھ۔ایک کہتی ہے کہ زچہ بیٹھ جاوے اور دوسری کہتی ہے کہ نہیں۔ایک کہتی ہے کہ وہ ٹہلے، دوسری کہتی ہے کہ نہیں۔ایک کوئی ٹوٹکا کرتی ہے تو دوسری گڑھ کھلاتی ہے اور رانی بیچاری ان کی ایسی حرکتوں سے جاں بہ لب ہے اور کچھ خبر نہیں ہے۔اگر کوئی اس وقت چھینک دیتا ہے تو وہ ایک کام کو کرتے کرتے چھوڑ دیتی ہیں۔اگر چھپکلی بولے تو کام چھوڑ دیتی ہیں، بندر کا منھ دیکھ لیں تو سفر نہیں کرتیں۔چاند گہن کے دن کسی چیز کو نہیں کاٹتیں۔غرضیکہ رانی نے دو تین مہینے پہلے اپنی ساس سے یہ کہا تھا کہ کل کی رات ایک اُلو بولتا ہوا میرے سر پر سے اڑتا ہوا چلا گیا تھا۔پس اس کی ساس کو اس وقت وہ بات یاد آئی اور وہ کہنے لگی کہ جب تک وہ چڑیا پھر نہ لوٹے گی اس وقت تک بچہ پیدا نہ ہوگا۔دوسری نے کہا کہ نہیں، کسی نے اس پر جادو کیا ہے۔اس بات کے سنتے ہی سب عورتیں کہنے لگیں کہ ہاں ضرور یہی بات ہے۔غرضیکہ یہ سب باتیں ہو رہی تھیں اور کوئی اس زچہ کی تباہ حالت کا خیال نہ کرتا تھا۔ایک عورت کہیں سے پڑھا ہوا تیل اور پانی اس کے واسطے لائی اور زچہ کو پلانا چاہا۔اس وقت زچہ نے تنگ آ کر مجھ سے کہا کہ اے میم صاحبہ! تم مجھ کو یہ تیل پانی نہ پینے دو ورنہ میرا حال تباہ ہو جاوے گا۔تب میں نے کہا کہ تمھاری ایسی بیہودہ تدابیر سے کچھ کام نہ ہوگا۔تم اس وقت اس کو کچھ کھانے کو دو، تاکہ اس میں کچھ طاقت ہو۔یہ بات سن کر اس کی ساس ناراض ہوئی، مگر میں نے غصے سے کہا کہ تم نہایت نادان ہو اور یہ کہہ کر میں نے تھوڑا سا شوربا اس کو پلایا۔سب عورتیں خفا ہو کر کہنے لگیں کہ یہ دستور تو صاحب لوگوں کا ہوتا ہے ہمارے ہاں اس کا کیا کام ہے۔اس سے زچہ مر جاتی ہے۔مگر میں نے کسی کی نہ سنی اور شوربا پلا ہی دیا کہ اس کے سبب سے اس کو بہت طاقت ہوئی اور اس کو ہوش آ گیا۔علاوہ اس سے ان نادان

www.urduchannel.in

عورتوں نے اس کو تین گھنٹے تک گھٹنوں کے بل بٹھلا رکھا تھا جس کے سبب سے وہ تھک گئی تھی۔ پس میں نے دایہ سے کہا کہ اس کو لٹا دو۔ اس بات سے دایہ نہایت ناخوش ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس سے کچھ ہرج نہیں ہے، ولایت میں سب عورتیں اسی طرح جنتی ہیں۔ اس کے جواب میں دایہ نے کہا کہ صاحب ولایتی عورتوں میں اور دیسی میں بڑا فرق ہے۔ اپنا اپنا دستور ہے۔ مگر میں نے نہ مانا اور اس کو کروٹ سے لٹا دیا۔ اسی اثنا میں میری نظر رانی کے پیٹ پر گئی تو میں نے دیکھا کہ اس بیچاری کے پیٹ پر ایک کپڑا نہایت کس کر باندھ رکھا ہے جس کے سبب سے وہ جن نہیں سکتی۔ میں نے اس کپڑے کو کھول دیا تو سب عورتیں کہنے لگیں کہ اب خیر نہیں، بچہ اوپر چڑھ جاوے گا، مگر خدا کی قدرت سے کپڑے کے کھولتے ہی بچہ پیدا ہو گیا۔''

اب اس تمام کیفیت کے دیکھنے سے اس بات کا یقین ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی عورتوں کی کیا حالت ہے اور ان کے ایسے جاہلانہ خیالات کیسے مضرت کا باعث ہیں۔

ایک اور عجیب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب ولادت میں کچھ دیر ہو جاتی ہے تو عورتیں اس کے قریب شور وغل کرتی ہیں اور بندوق پٹاخے چلاتی ہیں اور یہ خیال کرتی ہیں کہ بچے نے زچہ کی آنت پکڑ رکھی ہے، اس آواز سے وہ چھوڑ دے گا تو درد میں کمی ہو جاوے گی۔ پس یہ بھی ایک عجیب روشنی ان کے خیال کی ہے جو افسوس کے لائق ہے۔

○

www.urduchannel.in

سرسیداحمدخاں

عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔ اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لیے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپے کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔ باایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی بڑی حامی کار ہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لایعقل اور لاشے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبدل ہوجاتی ہے۔

وہ کسی قسم کے معاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لیے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلاشوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہوسکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائیداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے بقبضہ شوہر آجاتی ہے۔

جو جائیداد کہ عورت کو وراثتاً قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تاحین حیات قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا محاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لایعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کرسکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کرسکتا ہے۔

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کرسکتی۔

www.urduchannel.in

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لیے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کرسکتی۔

۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائیداد کا ایک بل پیش ہوا تھا اس میں صرف یہ بات رکھی گئی تھی کہ وہ قانون جس کے ذریعے سے بعد شادی کے عورت ہی جائیداد سے محروم ہوجاتی ہے منسوخ کیا جاوے۔

آنریبل مسٹر رسل گرنی ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون کا پیش کیا تھا، اس وقت انھوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ حال کے قانون کے بموجب جو کچھ جائیداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت ولیاقت سے کہتی ہے بعد شادی کے وہ اس کا نہیں رہتا۔ سب پر شوہر مالک ہوجاتا ہے۔ پس شادی کا اثر اس عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائیداد کا اثر ہوتا ہے۔

اس گفتگو پر تمام ہاؤس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے آنریبل مسٹر رسل گرنی کی تائید کی۔ پس انگلستان کے قانون کا عورتوں کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

ذکر مسلمانی قانون کا نسبت عورتوں کے

اب خیال کرو کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس طرح عزت دی گئی ہے اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کیے گئے ہیں۔

حالت نابالغی میں جس طرح مرد اسی طرح عورت بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصور ہے، الا بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار اور ہر ایک معاہدے کے لائق ہے۔

جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار ہیں۔ جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائیداد کی خود مالک اور مختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی ذات اور اس کی جائیداد ان معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جوابدہ ہے جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائیداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے محاصل کی لینے

www.urduchannel.in

والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کرسکتی ہے اور اس پر بھی دعویٰ ہوسکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے اور جو چاہے اس کو بیچ کرتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائیداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کرسکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائیداد میں سے بہ ترتیب وراثت ورثہ پاسکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کرسکتا ہے حاصل کرسکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں وہی سزائیں پاسکتی ہے جو مرد پاسکتا ہے۔

کوئی قید خاص عورت پر بجز اس کے جو خود اس نے بسبب معاہدہ نکاح کے اپنے پر قبول کی ہیں یا اس تفاوت ستر عورت میں جو نیچر، یعنی قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو۔ پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے، حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کی ہے اس میں کچھ یہی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں کیا ہے، کیونکہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں جس قدر کہ تفریط ہے اسی قدر تربیت یافتہ ملک میں افراط ہے اور جو حد کہ شرع نے مقرر کی ہے اور جہاں تک کہ انسان اس پر غور کرسکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لاسکتا ہے بلاشبہ وہی حد نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس مقام پر جو ہم کو بحث ہے وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت اور تواضع اور خاطر داری اور محبت اور پاس خاطر اور ان کی آسائش اور آرام اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گزار تصور کریں ان کو اپنا انیس اور جلیس اور رنج و راحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور ان کو اپنی باعث مسرت اور تقویت کے سمجھنے پر بحث ہے۔ بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا۔

جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقینی ان کی غلطی ہے، بلکہ ہندوستان میں جس

www.urduchannel.in

قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرتا ہے، اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ معہذا بڑا باعث اس کا ان سولیزڈ، یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا، اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچایا ہے اور مسلمانوں نے باوجودیکہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے بہتر اور عمدہ تھا، مگر انھوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے، الا ماشاءاللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔ پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھاویں۔

○

www.urduchannel.in

جے. کینیڈی*
ترجمہ سید جمیل نقوی

سرسید کے حالات

سرسید احمد نے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں انتقال کیا اور 'پانیر' کی رائے کے مطابق ان کے ساتھ ایک حد درجے مفید اور بارآور سیاسی قوت کا خاتمہ ہوگیا جس نے اس صدی کے ربع آخر میں ہندوستانی مسلمانوں میں حرکت پیدا کی۔ ان کا خاص کارنامہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام تھا۔ ان کی وفات کے بعد شمالی ہند کے مسلمانو کے سامنے سب سے بڑا سوال ان کے مستقبل کا تھا کیونکہ ایسے لوگ تو تھے جو ان کے کام کو جاری رکھ سکتے تھے، لیکن ان جیسی شخصیت کا نعم البدل نظر نہ آتا تھا۔ مرحوم سے میری گہری واقفیت تھی اور سطور ذیل میں ان کے کاموں اور شخصیت کے متعلق میں اپنے تاثرات پیش کروں گا۔

سرسید نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال علی گڑھ میں گزارے۔ یہ دیہاتی وضع کا خاموش شہر آگرے اور دلّی کے درمیان واقع ہے اور اس کی شہرت ایم اے او کالج... کی منت کش ہے لیکن ایک صدی پیشتر اس مقام کو خاص فوجی اہمیت حاصل تھی۔ ایک زمانہ میں ڈی بوائن کی مرہٹہ سپاہ ٹڈی دل کی طرح اس مقام پر چھا گئی تھی اور یہاں کی فضا اسلحہ کی جھنکار سے گونج اٹھی تھی۔ فرانسیسی انجینئروں نے قصبے کے شمال کے دلدلی علاقے میں اپنا مشہور قلعہ تعمیر کیا تھا۔ لارڈ لیک نے طوفانی حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور مرہٹہ فوج کو منتشر کر دیا۔ علی گڑھ میں امن وسکون کا دور واپس آ گیا اور یہ مقام اپنی پرانی حیثیت پر آ گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں کی دلدل خشک ہوگئی اور یہ علاقہ ایک سنسان بنجر میدان میں تبدیل ہو گیا جسے عرض کی طرف سے لہریادار خندقیں قطع کرتی تھیں اور جس کی سطح پر نمک کے سفید ذروں کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس بنجر میدان کے خاتمے پر کالج کا وسیع احاطہ واقع ہے جو تین اطراف میں باغات اور سول اسٹیشن سے گھرا ہوا ہے۔ کالج کی تعمیر ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی۔ اس عمارت کی محرابیں، ہال، کمرے اور ستون ہسپانوی ساخت کے ہیں۔ وسط کی دو عمارتیں

* جے. کینیڈی (J. Kennedy) کا انگریزی مضمون لائیٹر کے انگریزی مجلّہ 'امپیریل اینڈ ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو' (لندن) میں شائع ہوا، جلد ۶، شمارہ ۱۱-۱۲ (بابت جولائی-اکتوبر ۱۸۹۸ء)۔ اردو ترجمہ از سید جمیل نقوی

www.urduchannel.in

عمارتیں یعنی کالج ہال اور مسجد دوسری عمارتوں سے بلند تر ہیں اور مسجد میں کالج کا بانی سرسید احمد، مورخ، عالم دین، مقرر، سیاست داں، زیر خاک محو استراحت ہے۔ اس عمارت کا طرز تعمیر اس کے بانی کی ذہنی خصوصیت کا عکس دکھاتا ہے یعنی وسعت، سادگی اور خشک متانت کا حامل ہے۔

سید صاحب عام طور سے انھیں اسی طرح مخاطب کیا جاتا تھا، سے میری پہلی ملاقات ۱۸۸۷ء کے موسم بہار میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات سے مجھے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ بیس سال سے مسلسل میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ سنتا رہا تھا۔ کچھ تو ان کے مقلدین سے اور اس سے بھی زیادہ ان کے مخالفین سے جن میں وہ بوڑھے بزرگ اشخاص شامل تھے جو یا تو عمر میں ان سے بڑے تھے یا ان کے ہمعصر تھے مگر ان کی جدت طرازیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ سرسید نے اپنی ابتدائی زندگی میں مذہب میں جو نئی نئی باتیں نکالیں، ان کی وجہ سے ان کی کافی مخالفت پیدا ہوگئی تھی۔ بہت سے لوگ انھیں ملحد سمجھتے تھے اور یہاں تک کہا جاتا تھا کہ علمائے مکہ نے ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا، لیکن جس زمانہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی، ان کے کچھ مخالف تو ختم ہو چکے تھے اور کچھ مغلوب ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے مفاد سے ان کی وابستگی اور خدمات سے ہر شخص واقف ہوگیا۔ وہ مسلمانوں کے لیڈر تسلیم کر لیے گئے تھے اور اگر ان کے مذہبی خیالات اور رائیں مشکوک یا مشتبہ ہوتی تھیں تو لوگ اس باب میں خاموشی اختیار کر لیتے اور خلاف شریعت کہنے سے گریز کیا جانے لگا۔

۱۸۸۷ء میں سرسید احمد نے کالج کے قریب ہی ایک اینگلو انڈین وضع کے بنگلے میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مجھے اس بنگلے کے اندرونی کمرے میں لے جایا گیا جو کافی کشادہ مگر تاریک تھا۔ یہ کمرہ یورپین انداز پر آرائش کیا گیا تھا۔ فوراً ہی سید صاحب بھی مشرقی لباس میں ملبوس اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک قوی الجثہ درمیانی قد و قامت کے بزرگ تھے مگر عمر اور مطالعہ نے آخر زمانہ میں ان کی کمر میں کسی قدر خم پیدا کر دیا تھا۔ ان کا سر بہت بھاری تھا۔ البتہ چہرہ زرد تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ان کی آواز نمایاں طور پر شیریں اور صاف تھی۔ پہلی نظر میں جو خصوصیات توجہ کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، وہ ان کا وقار اور اخلاق تھا۔ اس کے بعد تو مجھے ان کے ساتھ ایک عرصے تک کام کرنا پڑا اور مختلف حیثیتوں سے انھیں دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ درباروں میں، مجالس میں تقریر کرتے ہوئے، وائسرائے اور لیفٹیننٹ گورنروں کی تواضع کرتے ہوئے، کالج کی صدارت کرتے وقت، نجی زندگی میں کھانے کی میز پر یا مطالعے میں محو، مگر ہر موقع پر ان کا وقار اور اخلاق یکساں نظر آیا۔ عقلمند، معتدل، صاف گو، نڈر اور مضبوط انسان تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ میرے پسندیدہ ترین لمحات وہ ہوتے تھے، جب میں انھیں تنہا پاتا تھا۔ وہ عموماً عہد ہومر کے شاہ بسلیس کے انداز میں اپنے عصا پر جھکے ہوئے معماروں کی نگرانی میں مصروف ہوتے، کیونکہ وہ خود ہی بڑی حد تک کالج کے نقشہ کش بھی

www.urduchannel.in

تھے اور معمار بھی، کبھی میں انھیں مطالعہ کے کمرے میں کتابوں پر جھکا پاتا تھا۔ ایک شام خاص طور پر میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ اس دن سید صاحب سے بعد مغرب ملنے گیا تھا۔ وہ اپنے مختصر سے پیش دالان میں جہاں پڑھنے لکھنے کا کام کیا کرتے تھے، سامنے میز پر لیمپ روشن تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں سے سامنے کا باغ اور رات کا اندھیرا اچھی طرح نظر آتا تھا۔ ایک ملازم سفید کپڑوں میں ملبوس برآمدے کے سایہ میں سو رہا تھا۔ روشنی کا ایک سیلاب ان کے بھاری سر اور برف کی مانند سفید داڑھی پر پڑ رہا تھا اور وہ ایک طالب علم کی طرح عربی مابعد الطبیعیات کی بھاری بھرکم جلد پر جھکے ہوئے تھے۔ اپنا قلم رکھ کر مجھ سے کہا کہ غروب آفتاب کے بعد میں دنیا کے تفکرات سے آزاد ہو کر ان عظیم دماغوں سے رابطہ قائم کرنا پسند کرتا ہوں، جنھیں مرے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس وقت وہ ایک عرب فلسفی پر تنقید لکھ رہے تھے۔

سرسید احمد ۱۸۱۷ء میں شرفا کے ایک زوال پذیر خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی کئی پشتیں اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں گزر گئی تھیں۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد مغل دربار میں صوبہ داری اور قضا کے مناصب پر فائز ہوئے۔ یہ عہدیداروں کا خاندان جاگیرداری طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ جب مغلوں کی بادشاہت قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تک محدود ہو گئی تو اس خاندان کی مالی حالت پر بھی اس کا اثر پڑا۔ مغل دربار کی شان و شوکت صرف دکھاوے کی رہ گئی۔ بازاری، چالاک، سازشی قسم کے لوگ بھرے تھے، مگر انہی میں درباریوں کا ایک گروہ اب بھی بادشاہ کا جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، جاں نثار تھا۔ انھوں نے بادشاہی کی پرانی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ابھی دور گذشتہ کی عظمت اور شوکت کی یاد ان کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ مرد اگرچہ تقدیر کی گردش میں آ گئے تھے، مگر ان کے تیوروں میں وہی وقار تھا۔ اسی طرح عورتیں تربیت یافتہ اور مہذب تھیں۔ باپ اپنی لڑکیوں کو پڑھاتے تھے۔ بیٹے اپنی ماؤں کا حکم مانتے تھے۔ علم ایک خاص حلقے تک محدود تھا۔ سرسید نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام تعلیم و تہذیب کے اسی محدود حلقہ میں بسر کیے اور اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے دوستوں کی وجہ سے سرسید کی تربیت دہلی کی روایات کے مطابق ہوئی۔ اس کی بدولت انھیں شستہ ہندوستانی زبان پر خاص قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ بلکہ آگے چل کر ان کی شخصیت میں جو ایک سادہ وقار اور قدیمانہ اخلاق نظر آتا تھا، وہ بھی بچپن کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا۔

سرسید احمد کو اپنے عالی خاندان پر فخر تھا۔ اپنی ابتدائی تصانیف میں اس کا ذکر انھوں نے فخریہ انداز میں کیا ہے اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ اس پر زور دیتے رہے۔ ان کی رائے تھی کہ اعلیٰ سرکاری خدمتوں پر جن ہندوستانیوں کو ملازم رکھا جائے، وہ لازماً خاندانی لوگ ہونے چاہئیں۔

ایک مرتبہ ایک انگریز اپنے شریف رشتہ داروں کا ذکر فخریہ کر رہا تھا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے انگریز حاکموں

www.urduchannel.in

کے خاندانی حالات کا کوئی علم نہیں۔ جب تک ایک انگریز حکومت کی کرسی پر متمکن رہتا ہے۔ ہمارے لیے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا خواہ وہ کسان کا بیٹا ہو یا کسی امیر لارڈ کا لیکن ہندوستان میں ہم ایک دوسرے کی خاندانی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، اس لیے ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ ہمارے سروں پر کسی مجہول النسل شخص کو مسلط کر دیا جائے۔

سرسید جوان ہوئے تو ان کی کمزور مالی حالت نے انھیں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا، مگر ان کے خاندانی سابقہ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ سرکاری ملازمت تلاش کریں۔ اکیس سال کی عمر میں وہ منصف کی حیثیت میں محکمہ عدالت سے منسلک ہوئے اور تیس سال کی ملازمت کے بعد سب آرڈینیٹ جج کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ہندوستان کی سب ججی انگلستان کی قصباتی عدالت کی ججی کے برابر ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سرسید نے انگریز مرد اور عورتوں کی جان باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر بڑی خدمت انجام دی۔ کچھ مدت وہ وائسرائے کی مجلس وضع قانون کے ممبر رہے۔

مگر سرسید کی شہرت کا مدار ان کی سرکاری حیثیت پر بالکل نہیں۔ وہ ملک میں مصنف اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے ممتاز ہوئے۔ ان کا طرز تحریر سادہ مگر پرزور تھا۔ ان کی تحریریں مغلق اور غریب عربی الفاظ سے جو اس زمانے کا عام انداز تھا، خالی ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین سبق آموز حکایتوں اور پرمغز ضرب الامثال سے لبریز ہوتے تھے۔ وہ ایک زبردست مقرر تھے اور اپنی قوت تقریر سے دیسی مجمعوں میں آگ لگا سکتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک موقع پر حیدر آباد کے مسلمان جوش میں بھر کر اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور نعرہ لگاتے ہوئے ان کے سامنے تلواریں کھینچ لی تھیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ان کی مصروفیات بیشتر علمی رہیں۔ تاریخ اور دینیات سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ہندوستان اور عرب کے مسلمانوں کے ابتدائی حالات کی تحقیق کا انھیں بے حد شوق تھا۔ قطب مینار کے کتبوں کی نقل کرنے کے لیے وہ اس کی خطرناک منڈیروں سے ایک ٹوکری لٹکا کر اس میں بیٹھ جاتے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے قطب الدین کے دہلی فتح کرنے کی صحیح تاریخ کا تعین کیا تھا۔ آثار قدیمہ کے بعض دیگر حقائق بھی انھی کی بدولت روشنی میں آئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے انھیں سیاسی لیڈر بنا دیا۔ اس تاریخ کے بعد سے اگرچہ انھوں نے اپنی پرانی دلچسپیوں کو پورے طور پر خیرباد تو نہیں کہا مگر اپنی زیادہ قوت مسلمانوں اور انگریزوں کی باہمی غلط فہمیاں رفع کرنے میں صرف کی۔

سید صاحب سب سے پہلے ایک مسلمان تھے اور وہ ہر چیز پر اسے مقدم رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں مسلمان قوم زوال کی انتہائی پستیوں تک پہنچ چکی تھی۔ نادر شاہ کا حملہ ہو چکا تھا۔ افغانوں اور مرہٹوں نے مغل سلطنت کو پورے طور پر تباہ کر دیا تھا۔ جس وقت ملک انگریز کے قبضہ میں آیا تو یہاں نفاق، لاقانونیت اور انتشار کا دور

www.urduchannel.in

دورہ تھا۔شمالی ہند کے مسلمانوں کی طاقت ختم ہو چکی تھی اور وہ قوت کے مرکز سے علیحدہ کٹ گئے تھے۔ان پر بے حسی اور سستی کا غلبہ تھا۔وہ اپنا وقت زیادہ تر اپنی جاگیروں یا قصباتی مکانوں میں گزارتے تھے۔ان کی آمدنی روز بروز گھٹ رہی تھی۔اسی نسبت سے حوصلے بھی دم توڑ رہے تھے۔علم سے انھیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ ماضی پر نظر ڈالتے تھے تو نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی تھیں اور حال کے آغوش میں ناگواری اور تلخی کے سوا کچھ نہ تھا۔سرسید کو اس صورت حال پر بڑا رنج تھا۔انھوں نے حالات کے بدلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔خدا نے انھیں زبردست حوصلہ اور بے مثال قوت برداشت سے متصف کیا تھا۔ان کی ذہنی فضا بہت وسیع تھی،مگر مذہب کے معاملے میں وہ بڑے کٹر تھے۔ان کی دور بیں نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔

یہ نیا دور اپنے آغوش میں بہتر امکانات کو لیے ہوئے ہے۔عرب حکمرانوں اور فلسفیوں نے عہد ماضی میں مغربی علوم سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔دور حاضر کے مسلمان بھی اپنے آبا کی طرح سب کچھ حاصل کر سکتے تھے۔مغرب کی نئی تہذیب میں بہت سی قابل تعریف باتیں تھیں۔ان کی روشنی میں مسلمان خود کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی بہت کچھ اصلاح کر سکتے تھے اور اس سے انھیں کافی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔چنانچہ سرسید نے اپنی زندگی ایک ایسا درمیانی راستہ تلاش کرنے کے لیے وقف کر دی جہاں دونوں قومیں اور تہذیبیں گلے مل سکیں۔دوسروں نے اختلافی امور کو نمایاں کیا تھا۔ وہ مشترک پہلوؤں پر زور دیتے تھے۔اپنے نظریات کو سیاسیات پر منطبق کرنے سے پہلے سید صاحب نے ان نظریوں کو مذہب کے شعبے میں داخل کیا اور انھوں نے مجھے خود بتایا تھا کہ انہی وجوہ سے انھوں نے عہد نامہ عتیق و جدید کا مطالعہ کیا تھا۔وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔قرآن کو وہ غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کرتے تھے اور سختی کے ساتھ اس کے احکام کی پابندی کرتے۔ وہ ایسے مقاصد کے لیے بھی جنھیں خود جائز سمجھتے تھے، لاٹری نکالنا روا نہ رکھتے تھے۔کالج کی تقریبات میں کبھی شراب نہیں دیکھی گئی۔قرآن کی پابندی کے ساتھ وہ ان حدیثوں پر بھی عمل کرتے تھے جو ان کے مذہب کے فطری ذہنی احساس پر یا تاریخی تنقید پر پوری اترتی تھیں،لیکن ان بنیادوں پر اور ان حدود سے آگے انھوں نے اپنی عقل کو آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔انھوں نے اہل کتاب کی مشترک خصوصیات سے کافی بحث کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں اور ہمعصروں نے ایک طویل عرصہ تک انھیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھا کیونکہ ان کے نزدیک وہ ایک 'خطرناک عقلیت پسند' تھے جس کی منطق اگرچہ بظاہر بالکل درست نظر آتی تھی،مگر اس سے ان کی نسل کے واجب التعظیم مگر جامد عقائد پر ضرب پڑتی تھی۔

سید صاحب کہتے تھے کہ بے خبری دین کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہے۔ہندوستان کی برطانوی سیاست بھی بے خبری کے عیب کا شکار ہے۔ رعایا اپنے حکمرانوں سے ناواقف ہے، اسی لیے اسے ان پر بھروسہ نہیں۔حکمران رعایا کے

www.urduchannel.in

مطالبات اور شکایات سے بے خبر ہیں۔ غدر میں یہ حقیقت نمایاں طور پر ثابت ہوگئی تھی، چنانچہ سید صاحب نے حکمرانوں اور رعیت کے اس بُعد کو دور کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ انھوں نے اپنے ابنائے ملک پر زور دیا کہ وہ اپنے حکمرانوں پر بھروسہ کریں اور انگریزوں پر زور دیا کہ وہ اپنی رعایا کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حکومت میں انھیں مناسب حصہ دیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا تھا کہ وہ انگریز سے صلح کریں، کیونکہ مسلمانوں اور انگریزوں میں بادشاہی کی خُو بُو مشترک ہے۔ دونوں اہل کتاب ہیں اور دونوں کے مذاہب میں ایک قریبی تعلق ہے۔ وہ صفائی کے ساتھ اس اتحاد کو تسلیم کر کے ہی ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے استیلا سے خود کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ ایم.اے.او. کالج علی گڑھ سید صاحب کے ان مقاصد کا حامل تھا۔ بڑی حد تک اسے آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونہ پر قائم کیا گیا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ حالات مساعدت کریں تو اسے ترقی دے کر اینگلو محمڈن یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ اس کالج میں طلبا کو اپنے استادوں کی نگرانی میں رہنا پڑتا تھا۔ انگریز پروفیسر انڈر گریجویٹ طلبا کے ساتھ رہتے سہتے تھے۔ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانے کھاتے۔ ساتھ پڑھتے اور کھیلتے۔ یہ خیال نیا بھی تھا اور دلیرانہ بھی کیونکہ ۱۸۷۵ء میں سرسید کے خیالات کو بغیر بحث و جرح کے آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ کفار کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے کا خیال چونکانے والا ضرور تھا، لیکن برطانوی حکومت اور حکومت حیدرآباد نے سرسید کی بڑی مدد کی۔ اس وقت صوبہ مغربی و شمالی کے لیفٹیننٹ گورنر سر جے اسٹریچی تھے جو سرسید کے گہرے دوست تھے۔ سرسید کے چند مخلص رفیق جن میں سے بعض اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے تھے، حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ سرسید احمد نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کر کے اپنے کالج کے لیے چندہ جمع کیا، لیکن بڑے اور خاص عطیات برطانوی حکومت اور حکومت حیدرآباد ہی سے ملے۔

غرض اسی طرح روپیہ حاصل کیا گیا اور کالج کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اب موزوں اساتذہ کی بہم رسانی کا مسئلہ درپیش تھا۔ سرسید اپنے ذاتی اثر سے بہترین دیسی پروفیسر حاصل کر سکتے تھے، مگر انگریز پروفیسران کی اسکیم کا لازمی جزو تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ موزوں انگریز پروفیسر کیونکر حاصل کیے جائیں مگر سرسید اس میں بھی کامیاب ہوئے۔ بے شمار دشواریوں اور کئی سال کی کوششوں کے بعد انھیں اپنے مطلب کا پرنسپل مل گیا۔ نئے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک ایک سرگرم، مستعد اور ہمدرد نوجوان تھے۔ ان میں سیکھنے اور حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ انھوں نے سید صاحب کے نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں وہ اکثر سید صاحب سے بھی بہتر ثابت ہوئے۔ یکسوئی اور مقصد کے ساتھ بے نفس وابستگی میں وہ اپنے راہنما سے رتّی بھر بھی کم نہیں تھے۔ جلد ہی ان کے درمیان باپ بیٹوں کے سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ نئے پرنسپل کی راہ میں بہت سی مشکلات تھیں۔ سید صاحب میں کاروباری صلاحیت کا فقدان تھا۔ کالج کے نظما کی مجلس مستقل نظم و ضبط کے معاملات میں مداخلت کرتی تھی اور میں نے سنا ہے کہ اندرونی طور پر کالج

www.urduchannel.in

میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ مسٹر بیک نے قابل اور ہمدرد انگریز نوجوانوں کا اسٹاف اپنے چاروں طرف جمع کر لیا۔ نظم وضبط قائم کیا۔ دفتری نظام درست کیا اور طلبا کو روزانہ نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ جس منشی نے پہلے پہل اس حکم پر عمل کرانے کی کوشش کی تھی، طلبا کا ہجوم اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ مسٹر بیک انگریزوں میں بھی سید صاحب کے سب سے بڑے ترجمان کی حیثیت اختیار کر گئے۔ غرض اس تجربے کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی ابھارنے میں مسٹر بیک نے سید صاحب کی خاص مدد کی۔ اگر کالج کی بنا کا خیال خود سرسید کا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعد میں اس کی کامیابی سید صاحب کے بعد خاص طور پر مسٹر بیک کی رہین منت ہے۔

سید صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ یونیورسٹی بنانے کے لیے علی گڑھ کا انتخاب محض ایک اتفاق کا نتیجہ ہے، لیکن آگے چل کر یہ انتخاب بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ آگرہ یا دہلی جیسے مرکزی مقامات پر کالج کی خصوصیت دوسری دلچسپیوں میں دب جاتی، لیکن علی گڑھ میں اسے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ علی گڑھ اس اعتبار سے بھی خصوصیت کے ساتھ خوش قسمت واقع ہوا ہے کہ یہاں دیسی شرفا کے متعدد خاندان آباد ہیں۔ ان خاندانوں کا اچھا خاصا اثر ورسوخ ہے۔ زیادہ تر یہ مسلمان ہیں۔ صدیوں سے یہاں با اثر اور متمول مسلمانوں کے خاندان رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان خاندانوں کی نئی نسلیں فراخ دل بھی ہیں اور روشن خیال بھی۔ سید صاحب سے انھیں ایک ذاتی ربط وتعلق بھی تھا اور انھوں نے پرجوش طریقے سے ان کے خیالات کا خیر مقدم کیا تھا۔ نجی زندگی میں دیسی شرفا اور انگریزی حکام مساویانہ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ لان ٹینس اور بلیرڈ ساتھ کھیلتے تھے اور ایک دوسرے کے گھر کھانے پر مدعو ہوتے تھے۔ کالج یا علی گڑھ انسٹیٹیوٹ میں شاہانہ ضیافتیں ہوتی تھیں۔ ان نجی ترقیبات اور عشائیوں میں جو پرلطف صحبتیں مجھے میسر آئی ہیں، ویسی مجھے کہیں اور میسر نہیں آئیں۔ انگریز اور مسلمان مل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے تھے۔ باتوں، تقریروں، ایک دوسرے کے جام صحت تجویز کرنے اور ہنسی مذاق کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

انگریزی اور ہندوستانی بولیوں کا جرأت انگیز امتزاج ہوتا اور ہماری زبان پر بھی اتنی ہی تنوع ہوتی تھی، جتنے ہمارے ملبوسات۔ بعض اوقات یہ تقریبیں ناکام بھی ہو جاتی تھیں۔ سرسید احمد خاں کو کے سی ایس آئی کا خطاب پیش کرنے کے لیے ایک دربار ہوا تھا۔ اس موقع پر ضلع کے کلکٹر نے بہت سے مسلمانوں کو مدعو کیا۔ بدقسمتی سے جس تاریخ کو یہ دعوت ہونے والی تھی، اس دن رمضان شروع ہو گیا۔ بہت سے معمر دیسی شرفا کے لیے چھری کانٹے کا استعمال ایک صبر آزما امتحان ثابت ہوئے۔ میرے ایک عزیز دوست نے تین چاپ کھانے کی کوشش میں قریب قریب اپنی انگلی ہی کاٹ لی تھی، لیکن یہ تحریک خوب مقبول ہوئی اور ہندو بھی اس کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ کالج کے لیے روپیہ اکٹھا کرنے کی غرض سے سرسید احمد نے تھیٹر شروع کیا تھا۔ انھوں نے ایک اخلاقی قسم کا کھیل لکھا اور اس میں خود بھی ایک پارٹ لیا۔

www.urduchannel.in

ہندوؤں کو بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ انھوں نے ایک نیم عام جلسہ کیا، جس میں انگریز میموں نے وائلن بجایا۔ ایک ہندو راجہ نے چھتارا بجایا، ایک آنریری مجسٹریٹ نے گانا گایا اور ایک ممتاز وکیل نے نغمہ سرائی کی۔

اس آزادانہ معاشرتی اختلاط سے بے شمار سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔ اس سے یورپینوں اور دیسیوں دونوں کی یکساں تعلیم ہوئی۔ تعصّبات کا خاتمہ ہوگیا۔ باہمی شک وشبہ دور ہوا۔ صاف گوئی اور اختلاط باہمی کی ایسی فضا پیدا ہوگئی جس سے ضلع کے حاکم کو بہت سی شکایات کے رفع کرنے اور بہت سے ایسے جھگڑوں کو ابتدا میں ہی ختم کرانے کا موقع ملا جو آگے چل کر بدنما صورت اختیار کر سکتے تھے۔ وفاداری فیشن بن گئی اور ہر جگہ یہ بات ثابت کی جانے لگی تھی کہ مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار انگریزوں کے ساتھ اتحاد پر ہے۔ ہندو بھی وفاداری میں مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ بعض دوسرے اضلاع میں بھی میری ملاقات لائق اور قابل اعتماد شخص سے ہوئی ہے، مگر بہ حیثیت مجموعی پورے صوبہ شمالی ومغربی میں مجھے علی گڑھ کے شرفا سے بہتر گروہ کہیں نہیں ملا۔ نہ مجھے کہیں ایسے آزاد خیال اور روادار لوگ ملے جیسے میرے دوست گھنشام سنگھ (جو اسی ڈویژن کے اعلیٰ ترین شرفا میں سے تھے)، نواب کنور لطف علی خاں، فیاض علی خاں اور حیدر خاں مرحوم تھے اور میں ہی کیا، ہر آفیسر ان کی قدر کرتا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ سارے صوبہ میں یہ ضلع سب سے زیادہ روشن خیال اور وفادارانہ ہوگیا تھا اور یہ سب کچھ ایک واحد شخص کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک ایسے شخص کی کوششوں کا جو انگریزی بھی قدرے دقت کے ساتھ پڑھتا تھا۔ انگریزی ادب سے بھی جسے براہ راست واقفیت نہ تھی۔ علی گڑھ کے ممتاز شرفا کا بھی اس معاملہ میں یہی حال تھا۔ سرسید کے بیشتر احباب اور پیروؤں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے، مگر وہ سب کے سب نہایت لائق لوگ تھے، جو دنیا اور واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ اپنے مرتبہ کی نسبت سے انھیں سیاست سے بھی دلچسپی لینی پڑتی تھی، لیکن انگریزی تعلیم ان میں سے ایک آدھ نے بلکہ غالباً کسی نے بھی حاصل نہ کی تھی۔ اس سے غالباً اس حقیقت کی بھی تشریح ہوجاتی ہے کہ انھیں ایک ایسی پارٹی قائم کرنے کا موقع ملا جو واقعی ترقی پسندانہ بھی تھی اور صحیح معنوں میں قدامت پسندانہ تھی۔

جب سید صاحب نے کانگریس کے ایجی ٹیشن کے خلاف مسلمانوں کی رہنمائی کی تو ان کی مقبولیت انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ کانگریس کے تجویز کردہ بعض مطالبات مثلاً حکومت میں دیسیوں کو اور زیادہ حصہ دینا وغیرہ ایسے تھے جن کے لیے کانگریس کے عالم وجود میں آنے سے پہلے خود سید صاحب کوشاں تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس تحریک ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ انھوں نے صاف طور پر دیکھ لیا تھا کہ جمہوری پروگرام کے تحت مسلمانوں کو کیا نقصانات پہنچیں گے کیونکہ وہ ایک ایسی اقلیت تھے، جس کے اکثریت میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سید صاحب نے یہ امر بڑی شدت کے ساتھ اپنے ہم مذہبوں کے دل میں اتارا۔ علی گڑھ میں کانگریس کے جو ہندو خیر

www.urduchannel.in

خواہ تھے، ان کے مرض محبت کا علاج بھی بہت جلد ہو گیا، کیونکہ شہر کی کونسل (کمیٹی) میں رکنیت کے لیے ایک چمار بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ سید صاحب بنیادی طور پر ایک قدامت پسند تھے۔ وہ مسلمانوں کی صدیوں کی روایات کے حامل تھے اور اب وہ ان روایات کو برطانوی حکومت اور علوم جدیدہ کی روشنی کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر چکے تھے۔ مغربی جمہوریت کی کورانہ تقلید اور دوغلے پن کو وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہندو مسلمان کی رقابت کو ابھارنے یا باہمی اختلافات کو ہوا دینے کے بھی سختی سے مخالف تھے۔ ہندوؤں میں ان کے بہت سے دوست تھے اور اپنے کالج میں بھی انھوں نے آزادی کے ساتھ ہندوؤں کو ملازم رکھا۔ ہندویت کا بہ حیثیت مذہب کے ان کے دل میں کچھ زیادہ احترام نہ تھا۔ ''ہندویت؟ ہندویت کیا ہے؟'' انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ ''ہندویت ایک پکانے کے برتن پر مشتمل ہے''۔ یقیناً انھوں نے کبھی اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہ دی تھی۔

اگر مجھے سید کی سیرت پر چند لفظوں میں روشنی ڈالنی ہو تو میں کہوں گا کہ ایک طرف وہ ان کی رواداری کا حلقہ عام تھا، مگر دوسری طرف وہ جن چیزوں کو صحیح سمجھتے تھے، ان پر نہایت شدت کے ساتھ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ طریقہ مشرقی مزاج کے عین مطابق ہے۔ میری جوانی کے زمانے میں ایک صوبیدار سے لے کر چوہدری تک ہر حاکم مطلق العنان ہوتا تھا۔ ہماری عدالتوں کے لامتناہی سلسلے کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ حکام ضلع کے اختیارات میں کمی کو وہ خطرناک سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ اعلیٰ حکام کی مسلسل مداخلت کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔

اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس پر خود عمل کرتے تھے۔ اپنے کالج میں وہ عملاً مطلق العنان تھے۔ اگرچہ وہ ایک عقلمند اور فیض رساں حاکم تھے اور سب کا خیال رکھتے تھے، مگر تحکم پسند اور مطلق العنان طبیعت کے مالک تھے۔ وہ مداخلت برداشت کرتے تھے نہ مخالفت۔ اگرچہ ان میں کاروباری صلاحیت نہ تھی مگر وہ اس سلسلے میں بھی کسی کی مدد لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ آخر عمر میں ان کے مزاج میں چڑچڑاپن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ سے زیادہ مجھے بعض ایسے جھگڑوں میں صلح کرانی پڑی، جن میں راستی تمام و کمال سید صاحب کی طرف نہ ہوتی تھی۔ جوانوں کی غلطیوں کو وہ آسانی کے ساتھ معاف کر دیتے تھے مگر اپنے بہت سے پرانے دوستوں سے جن کے مشوروں کی کبھی ان کے دل میں بڑی قدر تھی، بالکل بگڑ جاتے۔

جب کوئی پوپ مرتا ہے تو مشہور ہے کہ اساقفہ کی مجلس انتخاب سازشوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ گروہ بندیاں اور ساز باز شروع ہو جاتی ہے۔ سید صاحب کی وفات بھی پوپ کی موت کے مثل ہے۔ بہت سے حریف ان کے عہدے کے امیدوار ہیں۔ کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس پر بقیہ کو اتفاق ہو۔ دریں اثنا ٹرسٹیوں نے کالج کے خزانے کی کنجی مسٹر بیک کے ہاتھوں میں دے دی۔ طلبا کی ایک جماعت دفتر پر پہرہ دے رہی تھی۔ جب تک یہ عبوری دور نہ گزر جائے،

www.urduchannel.in

سارا کاروبار بند ہے۔ سید صاحب کی وفات سے کچھ ہی دن پہلے کالج کئی قابل، ہمدرد انگریز پروفیسروں سے محروم ہو گیا اور اس سے کالج کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ دوسری طرف اینگلو محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ سید صاحب کی جگہ حاصل کرنے کے لیے جو امیدوار میدان میں ہیں، ان کے اختلافات بیشتر ذاتی ہیں۔ ہمیں یہ یقین کرنے میں تامل نہیں کہ اس نازک وقت میں مفاد عامہ کو ذاتی اختلافات پر قربان نہ کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض امیدوار ایک ایسے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں جو سید صاحب کی حکمت عملی سے مختلف ایک نئی راہ پر گامزن ہونے کا حامی ہے۔ اگر ماضی پرستوں کی فتح ہوئی یا کوئی ایسی صورت پیش آئی کہ مسٹر بیک کا تعلق کالج سے منقطع ہو گیا تو شاید کالج کو نا قابل تلافی نقصان پہنچے گا اور کالج عام ہائی اسکول کی سطح پر آ جائے گا اور اس کا امتیاز ختم ہو جائے گا۔ بہر حال ہمیں امید ہے کہ اس کا نصیب اچھا اور مستقبل بہتر ہوگا۔

ابھی علی گڑھ کالج کو رواداری اور علم کے ثمرات حاصل کرنے میں وہ ثمرات جو اس کے عظیم آغاز سے صحیح مناسبت رکھتے ہیں، اور یہ اس کے بانی کی عظمت کے مطابق ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی یادگار ہوگی۔

(ماخوذ: 'فکر و نظر' علی گڑھ، سرسید نمبر، مارچ ۲۰۱۷ء)

www.urduchannel.in

راج موھن گاندھی*
ترجمہ وتلخیص: شمسی طہرانی

حیات سرسید: چند نمایاں پہلو

سرسید احمد خاں کو برصغیر میں مسلم علیحدگی پسندی کا بانی قرار دے کر کوئی انھیں اچھا کہتا ہے اور کوئی برا۔ انھیں اسلام کی تجدید اور نئی تعبیر وتشریح پیش کرنے والے کی حیثیت سے کبھی ہدف ملامت بنایا جاتا ہے تو کبھی خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کا نام مع القاب وآداب (سرسید) پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ ہے۔

سید احمد خاں کے والد میر متقی نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ سید احمد کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت ان کے نانا خواجہ فرید کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ سرسید پر ان کے والد سے زیادہ ان کے نانا اور ان کی والدہ عزیز النساء کے اثرات مرتب ہوئے۔ اگرچہ ان کے والد میر متقی نے بھی انھیں صوفیانہ روایت سے وابستہ کرنے میں اپنا رول ادا کیا بقول کرسچین ٹرال یہ وہی صوفیانہ تصورات ہیں جن کی چھاپ ان کے مذہبی افکار پر آخر دم تک قائم رہی۔ خواجہ فرید ایک صاحب امارت انسان تھے۔ ان کی وسیع وعریض حویلی میں ایک دیوان خانہ بھی تھا جس میں وہ اپنے گھر کے بچوں کو درس دیا کرتے تھے۔ ملوک چند خواجہ فرید کا ایک دیرینہ ملازم تھا، جسے انھوں نے منیجر کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا اور اس سے وہ آخر عمر تک اہم امور میں صلاح ومشورہ کرتے رہتے تھے۔ خواجہ فرید کی فراخ دلی اور وسیع المشربی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی جائداد منقولہ وغیر منقولہ میں سے اپنی وصیت کے مطابق ملوک چند کو بھائی کے برابر حصہ دیا۔

ان کی والدہ عزیز النساء حیرت انگیز امتیازی خصوصیات کی حامل تھیں۔ ایک بار ایک شخص نے سید احمد کو تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے انتقام لینے پر مصر تھے۔ ان کی والدہ نے ہدایت کی کہ وہ اسے معاف کر دیں اور سید احمد خاں کو بالآخر اسے معاف کرنا پڑا۔ ایک بار بچپن میں سید احمد خاں نے ایک پرانے بوڑھے نوکر کو ایک تھپڑ مار دیا۔ جب ان

* ممتاز صحافی، سابق ایڈیٹر 'انڈین ایکسپریس'

www.urduchannel.in

کی والدہ کو اس واقعہ کا پتا چلا تو انھوں نے کہا کہ یہ لڑکا اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اسے فوراً گھر سے باہر نکال دیا جائے۔ جب تک یہ نوکر سے باقاعدہ معافی نہ مانگے اور وہ اسے معاف نہ کر دے۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد سید احمد نے ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے وہ ریڈر ہوئے پھر منصف یا جونیئر جج۔ انھوں نے نہایت تندہی سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا اور برابر لکھتے بھی رہے۔ ان کو ہمیشہ یہ امید رہی کہ لکھتے رہنے سے ان کی آمدنی بڑھتی رہے گی۔

سید احمد نے ایک کتاب آثار الصنادید کے نام سے دہلی کی یادگار عمارتوں پر لکھی اور پھر آئین اکبری مصنفہ ابوالفضل کی تدوین کی۔ بقول مجیب صاحب جو سید احمد کی مداحی میں وہ زیادہ نہیں ہیں، یہ دونوں کتابیں اتنی وقیع ہیں جو سید احمد کو دنیا کے عظیم دانشوروں میں شامل ہونے کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ یہاں چند نکات قابل غور ہیں۔ سید احمد نے عظمت رفتہ کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ایران اور عرب کی سرزمین کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے آباواجداد کا مسکن رہ چکی تھی۔ انھوں نے دہلی کو اپنا موضوع فکر بنایا اور اس کی عظمت رفتہ کے آثار و نقوش کو بقائے دوام عطا کرنے کے اسباب فراہم کئے۔ انھوں نے دہلی کے بادشاہوں کی واقعہ نگاری کرتے وقت اپنی کتاب کی ابتدا میں ہندو مہاراجاؤں کو یاد کیا ہے۔ امتیازی اور خصوصی مطالعے کے لئے وہ اورنگ زیب کے بجائے اکبر کا انتخاب کرتے ہیں۔

سید احمد خاں کے معاصر شاعر مرزا غالب نے آئین اکبری پر جو تقریظ لکھی اس میں غالب نے کہا کہ اس وقت قدیم بادشاہوں کے بجائے انگریز زیادہ قابل مطالعہ ہیں۔ سید احمد نے اس تقریظ کو ناپسند کیا اور اسے واپس کر دیا لیکن ۱۸۵۷ء نے ثابت کر دیا کہ غالب کا خیال درست تھا اور سید احمد کو اس خیال سے متفق ہونا پڑا۔

سرسید پر ۱۸۵۷ء کے اثرات:

اس تبدیلی پر دوسرے انداز سے بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سید احمد نے ماضی کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے ترغیب بھی حاصل کی تھی۔ وہ اپنے نانا خواجہ فرید کی طرح یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انگریز ہندوستان پر مستقل طور سے قابض ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو قوم کا مستقل انگریزوں سے مصالحت اور مفاہمت میں ہی مضمر ہے۔ سید احمد کو قوم سے والہانہ عشق تھا اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں کہا:

> ''یہ میری دلی خواہش اور خدا سے دعا ہے کہ ہماری حکومت اور ہندوستان کے لوگ باہم شیر و شکر ہو جائیں۔ حکومت اور ملک میں باہمی ربط سے قوم کو بھرپور تعاون ملے گا۔ اس سے ۱۸۵۷ء کے مکروہ اور ناخوش گوار واقعات کا کرب بھی دور ہوگا۔''

www.urduchannel.in

سید احمد نے برطانوی حکومت اور قوم کے روابط کو مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے ''اسباب بغاوت ہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ارباب اقتدار کی غلطیوں کو واشگاف انداز میں نشاندہی کی۔ اکبر اعظم کے عہد کے رعایا اور حکومت کے بہترین تعلقات کی یاددلائی۔

تصور قوم:

جہاں تک قوم کا تعلق ہے سید احمد نے زور دیا کہ قوم کو اپنے ذہن میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزوں کے فکر وفن اور ان کے طریق کار کا صحیح ڈھنگ سے جائزہ لے سکے۔ انھوں نے کلکتہ میں ۱۸۶۳ء میں مسلمانوں کے ایک جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''ہر طالب علم اس نتیجے تک پہنچے گا کہ حق کثیر العباد سے اور یہ کہ دنیا اس کے فرقہ، جماعت اور معاشرے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جہالت ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔ اگر ہندوستان کے باشندوں کو انگلستان کی عظیم طاقت کا اندازہ ہوتا تو ۱۸۵۷ء کے ناخوش گوار واقعات ہرگز رونما نہ ہوتے۔''

سید احمد خاں نے صرف ناصح مشفق کا رول ادا نہیں کیا بلکہ ایک مصلح کی حیثیت سے انھوں نے عملی اقدامات کیے اور قوم کی ہلاکت وفلاکت کو دور کرنے کے لئے اسباب ووسائل فراہم کئے۔

ان وسائل میں سب سے اہم وسیلہ تعلیم کو قرار دیا۔ ۱۸۵۷ء میں مرادآباد میں سید احمد نے ایک اسکول شروع کیا۔ پھر سید احمد کی پوسٹنگ جب غازی پور میں ہوئی تو وہاں ایک اسکول قائم کیا۔ یہ دونوں اسکول ہندو اور مسلمانوں کے مالی تعاون سے قائم ہوئے اور جاری رہے اور ان دونوں اسکولوں نے ہر جماعت کے طلبا کو بلاتفریق مذہب ونسل تعلیم سے آراستہ کیا۔ اسی دوران سید احمد نے انجیل کی ایک اردو تفسیر لکھی جس کا مقصد اسلام اور عیسائیت میں تطبیق تھی۔

۱۸۶۴ء میں سید صاحب نے ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی جو آگے چل کر سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے مشہور ہوئی جس کے واسطے سے وہ مغربی اقوام کے علم وادب سے مشرق کے بے شمار لوگوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ یہ سوسائٹی سید احمد کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ جہاں انھیں راجہ جے کشن داس کی صورت میں ایک لائق وفائق ہندو معاون میسر ہوگیا۔ اس دور میں سید احمد نے ایک ہی نعرہ وضع کیا۔

''تعلیم حاصل کرو، ''تعلیم حاصل کرو، ''تعلیم حاصل کرو''

یہاں یہ سوال غور طلب ہے، ان کی برطانوی حکومت سے مفاہمت اور جدید تعلیم کی تبلیغ واشاعت کی کوششیں صرف مسلمانوں کے لئے وقف تھیں یا جملہ ہندوستانیوں کے لئے۔ انھوں نے انگریزی سیکھنی نہ چاہی۔ ان کی اردو

www.urduchannel.in

میں (جیسا کہ دوسروں کی اردو میں) لفظ قوم سے مراد کبھی مسلمانوں سے ہے اور کبھی ہندو اور مسلمان دونوں سے۔ شاذ و نادر ہی اس سے مراد اسلام کی عالمی اخوت ہے۔ اگر چہ انھوں نے یہ اسلامی نقطۂ نظر بھی پیش کیا کہ:

''یہ بات بے معنی ہے کہ ایک ایمان لانے والا کالا ہے یا گورا، ترک ہے یا ترجیک، عرب ہے یا چینی، پنجابی ہے یا ہندوستانی۔''

سید احمد نے پر جوش طریقے سے خلافت ترکی کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ:

''ترکی خلافت کا ہم سے کوئی تعلق نہیں، ہم ہندوستان کے باشندے اور برطانوی حکومت کی رعایا ہیں، ہندوستان کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔''

ایک موقع پر انھوں نے کہا کہ:

''لفظ ہندو کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو کہ ہندوستان میں بستے ہیں خواہ وہ (عقیدے کے لحاظ سے) مسلمان ہوں یا ہندو۔''

جب ان کے ذہن میں صرف مسلمان ہوتے تھے تو اس وقت ان کے نزدیک قوم سے مراد ہندوستان کی مسلم جماعت ہوتی تھی نہ کہ مشترکہ عقیدہ رکھنے والی پوری امت مسلمہ

لارڈ لارنس، وائسرائے ہند نے ۱۸۸۶ء میں جب انھیں گولڈ میڈل عطا کیا تھا تو اس وقت جو توصیف نامہ پڑھا گیا تھا اس میں درج کیا گیا تھا ''کل اہل ملک کی خدمات کے صلے میں'' نہ کہ مسلم جماعت کی خدمات سے متعلق۔ مرادآباد اور غازی پور کے اسکول مسلم مزاج کی بجائے ہندوستانی رنگ و آہنگ کے عکاس تھے اور یہی حال سائنٹفک سوسائٹی کا بھی تھا کہ وہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ تھی۔ جب ۱۸۶۱ء میں تین غیر مسلم ہندوستانیوں کو وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل (مجلس قانون ساز) میں شامل کیا گیا تو سید احمد نے بے کراں مسرت کا اظہار کیا اور خداوند عالم کا شکر ادا کیا کہ تینوں نے نہایت ہمت و استقلال اور مستعدی اور دیانت سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ ان تینوں صاحبان میں سے دو پٹیالہ اور بنارس کے مہاراجہ تھے اور تیسرے سر دنکر راؤ تھے ان تینوں کا تعلق اس غیر مسلم جماعت سے تھا، جس کے لئے سید احمد دلسوزی، خلوص و تپاک اور گرم جوشی کے داخلی احساسات رکھتے تھے۔ ان کے بے پایاں اخلاص کا یہ عملی نمونہ ان کی شخصیت کی اس تصویر کو مسخ نہیں کر سکتا جو ان کی پورے ہندوستان سے مکمل وابستگی کا مظہر ہے اور جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے۔

کچھ دوسرے عناصر بھی ایسے ہیں جو اس تصویر کی آب و تاب کو نمایاں کرتے ہیں۔ جب علی گڑھ میں سید احمد کا تبادلہ ہوا تو انھوں نے ۱۸۶۶ء میں یہاں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی تحریک شروع کی۔ یہ وہ ایسوسی ایشن تھی جس کا

www.urduchannel.in

آغاز کلکتہ میں ۱۸۵۱ء میں ہوا تھا اور سید احمد اس سے متاثر ہوئے تھے۔

ایسوسی ایشن کے افتتاح کے موقع پر ایک بار پھر انھوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ معاملہ ہے۔ اس لئے انھیں برطانوی حکمرانوں کے سامنے اپنی شکایات نہایت صفائی دیانت داری اور باعزت طریقے سے رکھنا چاہئے۔ پھر انھوں نے خداوند عالم کی عالم گیر ربوبیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''وہ یہودیوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں غرض کہ سب کا خدا ہے۔''

ایسوسی ایشن کے سامنے پیش کی گئی عرض داشتوں کا تعلق تعلیمی، معاشی اور غیر فرقہ وارانہ مسائل سے تھا۔ ان عرض داشتوں میں یہ مقصد بھی پیش کیا گیا تھا کہ ایک دیسی زبان کا مسئلہ (مسلم نہیں) یونیورسٹی اتر پردیش میں قائم کی جانی چاہئے جہاں آرٹس، سائنسز اور دوسرے یورپی ادبیات اردو میں پڑھائے جائیں۔ ۱۸۶۷ء میں جب کہ وہ حکومت کے ملازم تھے، انھوں نے آگرہ میں منعقد ایک جشن سے واک آوٹ کرنے والوں کی سربراہی کی، کیوں کہ وہاں ہندوستانی مہمانوں کو نسبتاً کم درجہ کی جگہوں پر بٹھایا گیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس واک آوٹ میں ان کا مکمل ساتھ دیا۔

ایک موقع ایسا بھی آیا جب ان کی قوم پر وارانہ تصویر پر دھندلی ہوگئی۔ جب بنارس میں ان کی پوسٹنگ ہوئی تو وہاں انھوں نے کچھ ایسے ہندو صاحبان کو دیکھا جو عدالتوں میں اردو کو ہندی سے بدلنے کے لئے کوشاں تھے۔ سید احمد کے لئے اس ملک میں اردو مسلم حکومت کی یادگار اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کی زندہ علامت تھی۔ ان کے جذبات کافی حد تک مجروح ہوئے اور ان کے قدیم دوست مسٹر شیکسپیئر جو بنارس بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ پہلی بار یہ دیکھا کہ وہ 'صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود' کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ مسٹر شیکسپیئر نے کہا کہ ''اس سے قبل آپ ہمیشہ ملک کے تمام باشندوں کی فلاح میں دلچسپی رکھتے تھے۔'' سید احمد نے جواب دیا:

> ''اب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ دونوں جماعتیں کسی بھی معاملے میں مکمل خلوص قلبی کے ساتھ حصہ نہیں لیں گی۔ ان نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی بدولت دونوں جماعتوں کے درمیان تلخی مستقبل میں بڑھتی جائے گی۔ جو زندہ رہیں گے وہ اس منظر نامے کو ضرور دیکھیں گے۔''

سید احمد کو ایک تازہ جھٹکا اس وقت لگا جب سائنٹفک سوسائٹی کے کچھ ہندو اراکین سوسائٹی کی مطبوعات کے سلسلے میں اردو کو ہندی سے بدلنے کی تجویز پیش کی۔ سید احمد نے دیکھا کہ یہ روش ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن بنادے گی۔ یکجہتی اور یگانگی کی یہ بنیاد (اردو) ہندوستانی املاک کی بجائے مسلم میراث سمجھی جانے لگی۔ اردو کے بے شمار مقامی لغات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندو صاحبان نے اس زبان کو غیر ملکی اثرات کا مظہر سمجھا۔ اس قبیل کے ہندو صاحبان کے

www.urduchannel.in

خیالات کوان مسلمانوں سے تقویت ملی، جنھوں نے اردو کوعربی وفارسی الفاظ کی ٹھونس ٹھانس سے بوجھل بنادیا تھا۔

معاصر شاعر حالی نے دونوں جماعتوں پر زور دیا کہ وہ دہلی کی صاف اور سادہ زبان اختیار کریں، جسے دہلی کے ہندواور مسلمان دونوں بولتے ہیں۔مہاتما گاندھی نے بھی اس خیال کی تائید کی کہ اگر دونوں جماعتوں کی کوئی مشترکہ زبان ہوسکتی ہےتو وہ ایسی زبان ہوگی جس میں حالی کی ''مناجات بیوہ'' لکھی گئی ہے۔اردواور ہندی ایک زبان اردو رسم الخط کی شکل اختیار کرلیتی اگراس قسم کی (اتحاد کی) باتوں کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی جاتی۔

سیداحمد اردو کے اخراج کے آثار کی وجہ سے دلبرداشتہ ہوگئے،لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ تعاون اوراتحاد کے عقیدے کی بحالی کے لئے کوشاں رہے۔ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے اپنے پہلے سفر برطانیہ کے دوران ''ہندوستان کے مردوں اورعورتوں کے بارے میں لکھا کہ وہ حقیقتاً ایک ہیں۔''

سیداحمد نے انگلستان میں ۱۷ مہینے قیام کیا، وہاں انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کو دیکھا، کارلائل سے ملاقات کی اورچارلس ڈکنس سے بھی آخری بار رابطہ قائم کیا۔ڈیوک آف ارگل سے انہیں اسٹار آف انڈیا (ستارۂ ہند) کا خطاب ملا۔انھوں نے وہاں رہ کر یہ نتیجہ نکالا کہ انگلستان کی تہذیبی برتری صرف اس لئے رہے کہ وہاں جملہ علون وفنون ملکی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہا کہ ہندوستان کی ترقی بھی یہاں کی زبان کوذریعۂ تعلیم بنانے میں مضمر ہے۔یہ بات کوہِ ہمالیہ پر بڑے بڑے حروف میں لکھ دی جائے۔

(ماخوذ: 'فکرونظر' علی گڑھ، سرسید نمبر، مارچ ۲۰۱۷ء)

○

www.urduchannel.in

شافع قدوائی*

سرسید کی اولین صحافتی کاوشیں

سرسید کی اولین صحافتی کوششوں کے ذکر سے قبل ہندوستان میں صحافت کے ارتقاء پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہندوستان میں صحافت کا آغاز جیمس آگسٹ ہکی کے اخبار The Bengal Gazette or Calcutta General Advertiser سے ہوتا ہے جو ۱۷۸۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار ہکیز گزٹ کے نام سے بھی معروف ہے۔ ہندوستان میں اردو اور فارسی صحافت کی ابتداء تقریباً ساتھ ساتھ ہی ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی اخبار مراۃ الاخبار کی اشاعت شروع کی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں فارسی زبان میں شائع ہونے والا پہلا اخبار تھا۔ اس وقت ایران سے بھی کوئی اخبار شائع نہیں ہوا تھا۔[۱]

مراۃ الاخبار کی اشاعت سے ایک ماہ قبل اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت کا سلسلہ ۲۰/مارچ ۱۸۲۲ء سے شروع ہوا۔ ہری ہردت اس کے مالک اور منشی سکھ لال اس کے مدیر تھے۔ ''جامِ جہاں نما'' کی اشاعت کے تقریباً چودہ برس بعد دہلی سے ''دہلی اردو اخبار'' شائع ہوا۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا۔ ہندوستانی صحافت کے مستند مؤرخ پروفیسر ناڈگ کرشنا مورتھی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ہندوستانی صحافت "Indian Journalism" میں لکھا ہے۔

> دہلی اردو اخبار کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ اس کی اشاعت ۱۸۳۶ء میں دہلی سے ہوئی تھی۔[۲]

دہلی کے ایک مستند عالم مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار نکالا تھا۔ یہ اخبار ایک مکمل اخبار کے طور پر قارئین کے سامنے آیا تھا۔ اس میں خبریں، مضامین اور اداریے عام دلچسپی کے موضوعات پر شائع کیے جاتے ہیں اور اطلاع رسانی کے ساتھ ساتھ قاری کی ذہن سازی بھی کی جاتی تھی۔ دہلی اردو اخبار کو زبردست مقبولیت حاصل تھی۔ سرسید بچپن سے

* پروفیسر شعبۂ ماس کمیونیکیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

مطالعہ کے شائق تھے اور دہلی اردو اخبار ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ سرسید نے اپنی بعض تحریروں میں دہلی اردو اخبار کا ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنے تشکیلی دور میں اس اخبار سے مسلسل استفادہ کیا۔ سرسید نے اوائل عمری سے مضمون نویسی شروع کر دی تھی اور دہلی اردو اخبار کے مطالعہ نے ان کے ادبی ذوق کو بھی جلا بخشی۔ تاریخ آثار قدیمہ، تصوف، مابعد الطبیعات، اخلاق، تہذیب، رسوم اور معاشرتی اصلاح سے متعلق موضوعات پر گراں قدر مضامین اور کتابیں قلم بند کرنے سے قبل سرسید نے اردو اور فارسی کے اخبار میں ابتدائی صحافتی تربیت حاصل کی تھی۔

سرسید کی اولین صحافتی کاوشوں کو خواجہ الطاف حسین حالؔی سمیت دیگر مصنّفین نے زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھا حتی کہ سرسید کی صحافت پر تحقیقی مقالے میں بھی ان اخباروں کا تذکرہ موجود نہیں ہے جس میں سرسید نے اولاً کام کیا تھا۔ ''سید الاخبار'' کا ضمناً ذکر ضرور کیا گیا ہے جسے سرسید کی اولین تربیت گاہ بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ اخبار سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس مقالہ میں سرسید کی سید الاخبار سے وابستگی کی نوعیت اور ایک فارسی اخبار ''زبدۃ الاخبار'' سے سرسید کے تعلق کو موضوعِ بحث بنایا جائے گا۔

سید الاخبار

''دہلی اردو اخبار'' کی مقبولیت اور اس کے ایڈیٹر و مالک مولوی محمد باقر کی معاشرہ میں پذیرائی نے سید محمد خاں کو بہت متاثر کیا۔ اور انھوں نے اپنے مطبع سے ایک اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ سید محمد خاں کا مطبع دہلی میں قائم ہو چکا تھا اور اسی پریس سے دیوان غالب کا اولین ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ سرسید کے بڑے بھائی نے یہ اخبار دہلی سے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا۔ سید الاخبار کو مارگریٹا بارنس نے غلط طور پر اردو کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔[۳] ناڈگ کرشنا مورتھی نے بھی اسی طرح کی رائے ظاہر کی ہے اور سید الاخبار کو اردو صحافت میں Pioneer قرار دیا ہے۔ مارگریٹا اور کرشنا مورتھی کی آراء سے قطع نظر سید الاخبار کے اجراء کا سن بھی متنازعہ ہے۔ اس تنازعہ سے قطع نظر عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید نے صحافت کے آداب اور صحافتی تحریر کے مَابہِ الِامتیاز عناصر سے آگاہی سید الاخبار سے وابستگی کے دوران حاصل کی۔

''سید الاخبار'' سے متعلق تنازعہ کا تفصیلی ذکر ضروری ہے تاکہ سوانح سرسید سے متعلق ایک اہم باب کی تاریخی اہمیت کو حتمی طور پر اُجاگر کیا جا سکے۔

ہندوستان میں صحافت کی تاریخ کے مؤرخوں بشمول پی. آر. بھٹناگر (۱۹۴۷ء)، امداد صابری (۱۹۵۳ء)، ایس. نٹ راجن (۱۹۵۵ء)، احمد عتیق صدیقی (۱۹۵۷ء)، عبدالسلام خورشید (۱۹۶۳ء)، اور ڈیوس ایمٹ (۱۹۸۳ء)، وغیرہ نے لکھا ہے کہ سید الاخبار کا اجراء ۱۸۳۷ء میں ہوا تھا تاہم شمالی مغربی صوبہ کے اخبارات سے متعلق سرکاری

www.urduchannel.in

رپورٹ نے سیدالاخبار کے اجراء کے سن کو مشتبہ شمالی مغربی صوبہ کی حکومت کے جانب سے ہر سال صوبہ کے اخبارات اور دیگر مطبوعات سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی جاتی تھی۔ ''اردو صحافت کے مستند مؤرخ اور محقق احمد عتیق صدیقی نے اس رپورٹ کا پتہ لگایا اور اس کی ایک کاپی حاصل کی۔ یہ رپورٹ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک کے اخبارات اور مطبوعات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر الکیز ینڈر شیکسپیئر نے یہ رپورٹ مرتب کی تھی۔ ۱۸۴۸ء سے متعلق اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سیدالاخبار واقعتاً ۱۸۴۱ء سے شائع ہوا تھا۔ یہ تینوں کا ترجمان تھا اور سید غفور اس کے مالک ایڈیٹر، اور پبلشر تھے۔ مسٹر شیکسپیئر کی رپورٹ کی بنیاد پر نادر علی خاں (۱۹۸۷ء) اور طاہر مسعود (۲۰۰۲ء) نے لکھا ہے کہ سید الاخبار کی اشاعت ۱۸۴۱ء سے شروع ہوئی۔ رپورٹ برائے ۱۸۴۸ء میں سید الاخبار کا ذکر ہے اور سید عبدالغفور کو مالک لکھا گیا ہے جب کہ ایک قومی معاصر شہادت اس کی تردید کرتی ہے سید محمد خاں نے دہلی میں لیتھو گرافک پریس لگایا تھا اور یہیں سے دیوان غالب شائع ہوا تھا جس کے ٹائٹل پیج پر درج ذیل عبارت شائع ہوئی ہے۔

سید محمد خاں کے لیتھو گرافک پریس میں سید عبدالغفور کے زیر اہتمام شعبان ۱۲۱۵ ہجری (مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء) کو شائع ہوا''۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرکاری رپورٹ میں سید عبدالغفور کا بطور مالک اندراج درست نہیں تھا کہ اخبار کے مالک سید محمد خاں ہی تھے۔ بمبئی کے اخبار ''احسن الاخبار'' میں سید محمد خاں کے انتقال کی خبر شائع ہوئی جس میں ان کو اخبار کا مالک بتایا گیا ہے۔

''سیدالاخبار کے مالک سید محمد خاں کا انتقال بعارضہ بخار ہو گیا۔''[۴]

یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ سرکاری رپورٹ سیدالاخبار کے اجراء کے دس سال بعد تیار کی گئی اور اس میں اخبار کے اجراء کے سن کا ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے اور کسی نوع کی ٹھوس شہادت پیش نہیں کی گئی ہے۔ سیدالاخبار کا کوئی بھی شمارہ کسی لائبریری بشمول نیشنل آرکائیوز میں موجود نہیں ہے لہٰذا اس ضمن میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے تاہم دستیاب معاصر شہادتوں کے باعث یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدالاخبار کی اشاعت ۱۸۳۷ء سے شروع ہوئی تھی کہ معاصر شہادتوں کو سرکاری رپورٹ کے بغیر کسی ثبوت کے اندراج کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جانا چاہیے۔

سیدالاخبار کی کوئی فائل دستیاب نہیں ہے مگر اس زمانے کے بعض اخباروں مثلاً ''صدرالاخبار'' (آگرہ) اور ''احسن الاخبار'' (بمبئی) میں سیدالاخبار میں شائع ہونے والے مضامین اور خبریں نقل کی جاتی تھیں جس سے اخبار کے ادارتی مواد، اور اسلوب بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر طاہر مسعود نے اپنے گراں قدر تحقیقی مقالے ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' احسن الاخبار (بمبئی) میں شائع ہونے والی ان خبروں کو نقل کیا ہے جن کا مآخذ سیدالاخبار ہے۔

www.urduchannel.in

سیدالاخبار بدھ کوشائع ہوتا تھااوراس کا سالانہ چندہ۲ روپے تھے۔اس کے ایڈیٹر سید عبدالغفور قانونی امور میں مہارت رکھتے تھےاور یہی سبب ہے کہ اس اخبار میں قوانین اور بلوں کا ذکر کیا جاتا تھا جس کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ عتیق صدیقی کے مطابق سیدالاخبار وکلا میں بہت مقبول تھا۔۵

سید محمد خاں چوں کہ سرکاری ملازمت میں تھےلہٰذا عبدالغفور کواخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۸۴۴ء میں سیدالاخبار کی اشاعت ۵۰ کاپی تھی انھیں ان میں سے ۱۱ کاپیاں مفت تقسیم کی جاتی تھیں اور ۳۹ خریداروں کوبھیجی جاتی تھیں اس کے خریداروں کی فہرست میں بتیس مسلمان، چھ ہندواورایک گورنر جنرل تھے۔

''حیات جاوید'' میں حالؔی نے سیدالاخبار کا سرسری طور پر تذکرہ کیا ہےاورلکھا ہے کہ سرسید کے ابتدائی مضامین اس اخبار میں شائع ہوئے اور سرسید نے صحافت کی اولین تربیت بھی یہیں حاصل کی۔حالؔی کے مطابق سیدالاخبار کو مزید ترقی دینے کے خواہاں تھےاور ہر چند کہ اخبار کی ادارت برائے نام کسی اور کے سپرد تھی۔مگر اصلاً اس کی اشاعت کے پس پشت سرسید کا ہاتھ رہتا تھا۔اس میں شائع ہونے والے زیادہ تر مضامین سرسید کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔۶

مشہور ادیب سرعبدالقادر نے حالؔی کی توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرسید نے سیدالاخبار میں مختلف مضامین لکھ کر اپنی صحافت صلاحیتوں کوجلا بخشی۔۷

حواشی:

(۱) اردوصحافت انیسویں صدی میں، طاہر مسعود، فاضلی اینڈ سنز، کراچی،۲۰۰۲ء،ص:۹۸

(۲) Krishna Murthy Nadig: Indian Journalism, University of Mysore, 1966, p. 254

(۳) Barns Margarita: Indian Press, George Allen and Untwin Press London, 1940, p. 162

(۴) احسن الاخبار، بمبئی، جنوری۲، ۱۸۴۶ء

(۵) ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں: احمد عتیق صدیقی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء،ص:۳۴

(۶) حیات جاوید،ص:۳۴

(۷) مشہور اردو ادیب: سرعبدالقادر، بحوالہ ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء،ص:۵۷

(ماخوذ: 'فکرونظر' علی گڑھ، سرسید نمبر، مارچ ۲۰۱۷ء)

www.urduchannel.in

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی*

سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے ساتھ ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ بھی ہو گیا اس پہلی جنگ آزادی میں اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر انگریزی حکومت کے خاتمے کی کوششیں کی تھیں مگر ناکامی کے بعد جس انداز کی مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی وہ کم ظرف سے کم ظرف دشمن نے بھی اپنے مفتوح کے ساتھ شاید ہی تاریخ کے کسی دور میں کی ہو۔ انگریزوں کی اس جابرانہ اور انسانیت سوز کارروائی کے سبب ہندوستانی مسلمان سیاسی، سماجی اور معاشی تنزل کا شکار ہو گئے ان پر مایوسی اور محرومی کی ایسی فضا طاری ہوئی کہ زندگی کے سارے آثار ختم ہوتے نظر آنے لگے اور بقول معروف تاریخ داں رام گوپال ''۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی اور اس کے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے تقریباً دس سال سے زائد عرصہ تک جمود طاری رہا''۔ (برٹش رول ان انڈیا ۲۷۴)

اس ناگفتہ بہ حالت میں ہندوستانی مسلمانوں میں سے دو اہم شخصیات سامنے آئیں ایک مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دوسری سرسید احمد خاں۔ مولانا نانوتوی نے اس پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف بہ نفس نفیس شرکت کی تھی اور شاملی کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف کمان سنبھالی تھی اور انگریزوں کے دانت ایسے کھٹے کر دیئے تھے کہ پوری جنگ آزادی میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے چنانچہ ہنگامے کے بعد ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوئے مگر ہزار کوششوں اور حکمت عملیوں کے باوجود وہ انگریزوں کے ہاتھ نہ لگ سکے اور اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کی فتح اور ہندوستان کی ناکامی کے بعد کے بدلے ہوئے نئے ماحول میں اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کو جدید انگریزی

*ایڈیٹر ''ادبی گزٹ'' ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن 275101 (یوپی)

www.urduchannel.in

تمدنی یلغار اور عیسائی مشنریوں کے حملوں سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے اسلام اور اسلامی تعلیم کے احیا کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام کر کے پورے غیر منقسم ہندوستان میں قیام مدارس کی تحریک کو فروغ دیا جبکہ سرسید احمد خاں جو ہنگامے کے زمانے میں بجنور میں تعینات تھے اور بہت سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی جان بچائی تھی دہلی میں خود ان کا گھر انگریزوں نے لوٹ لیا تھا اور اس ہنگامہ خیزی کی حالت میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ بجنور سے میرٹھ اور میرٹھ سے افتاں وخیزاں دہلی پہنچے تھے جہاں جانے کے بعد انھیں پتا چلا کہ ان کے ماموں وحیدالدین خاں، ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں، عزیز ترین دوست امام بخش صہبائی اور بہت سے دوسرے قریبی لوگ انگریزوں کے ظلم وستم کے نشانہ بن چکے ہیں۔ ان کی والدہ اور نابینا خالہ تین روز کی بھوکی پیاسی نوکر کی کوٹھری میں جان بچانے کے لیے چھپی پڑی ہیں۔ چنانچہ وہ انتہائی دقتوں اور پریشانیوں سے انھیں دہلی سے میرٹھ لائے جہاں بیماری اور ناتوانی کے باعث ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس ناگفتہ بہ حالت اور لرزہ خیز واقعہ کا ان کے دل پر جو اثر رونما ہوا اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

> ''کم بخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے۔ اس زمانہ میں بجنور میں تھا۔ جو مصیبت کہ وہاں کے موجودہ حکام انگریزی اور عیسائی مذہب کے زن ومرد اور بچوں پر پڑی صرف اس خیال سے ہی کہ انسانیت سے بعید ہے کہ ہم مصیبت کے وقت ان کا ساتھ نہ دیں۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ غدر میں جو حال انگریزوں اور بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی خاندان تباہ وبرباد ہو گئے اور ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دل کو شق کر دینے والا ہے غدر کے بعد مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعد میں اس وفاداری کے صلے میں جہان آباد جو سادات کا ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپئے سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور

www.urduchannel.in

میں ان کی جائداد لیکر تعلقدار بنوں۔ میں نے اس کو لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارداہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں۔'' (سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی، سراج الدین (۱۸۹۰ء، ص:۶)

سرسید احمد خاں شاہ ولی اللہ کے جاں نشینوں کی تحریک ولی اللہی کے نتیجہ میں جنگ بالاکوٹ میں مسلمانوں کی ناکامی دیکھ چکے تھے اور اس دوسری ناکامی کے بعد ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وقت مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ رہا ہے چنانچہ حالات جب معمول پر آ گئے تو ان کا تبادلہ بحیثیت صدر الصدور مرادآباد کے ہو گیا۔ وہاں کی بھی حالت زار دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے اپنے ہندوستان سے باہر چلے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا کیوں کہ موجودہ ناگفتہ بہ حالت میں اپنے اہل وطن کو مصیبت میں مبتلا چھوڑ کر اپنی جائے امان تلاش کرنے کی غرض سے ملک سے باہر جانے کو ان کے حساس ضمیر نے انسانیت اور اخلاق کے خلاف سمجھا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے:

''چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھکو بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غمکدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامرادی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور مصیبت پڑی تو اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔'' (سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین (۱۸۹۰ء، ص:۶)

سرسید احمد خاں نے ہجرت کا ارادہ ترک کرنے کے ساتھ ہی ہندوستان میں رہ کر اپنی تباہ شدہ اور مفلوک الحال قوم کی اصلاح اور اسے ترقی سے ہمکنار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے فوری طور پر دو اہم ترین تدبیریں اختیار کیں [۱] ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوں جو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہیں تاکہ آپسی مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکے اور مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت سے نکالنے میں معاونت مل سکے۔ چنانچہ اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ''اسباب بغاوت ہند''، ''سرکشی ضلع بجنور'' اور ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' جیسے رسالوں کی تصنیف واشاعت کی [۲] مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے نجات دلانے

www.urduchannel.in

کے لیے عصری اور جدید انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کا قیام کیا اور مختلف علوم وفنون کے فروغ کے لیے انھوں زوردار مہم چلائی جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی اور مدرستہ العلوم یا ایم.اے.او.کالج کا قیام کر کے اور اس کو مثال بنا کر پورے برصغیر میں عصری اور مغربی تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں اور سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ کا قیام کیا جس میں انگریزی زبان کے ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم فارسی زبان میں دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ غازیپور میں بھی انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جو دراصل ان کی مجوزہ وسیع تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے ابتدائی اور تجرباتی کوششیں تھیں اور بالآخر ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں مدرستہ العلوم یا ایم.اے.او.کالج کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں (۱۹۲۰ء) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔سرسید احمد خاں کا خیال تھا کہ جدید مغربی تعلیم جہاں مسلمانوں کی معاشی ترقی کی راہ ہموار کرے گی وہیں انگریزوں کی مصالحت، سیاسی حقوق کے حصول اور مسلمانوں کی نئی نسل کی وقت اور زمانے کے لحاظ سے تعمیر وتشکیل میں معاون ثابت ہوگی اور مسلمانوں کی تمام قسم کی ابتری اور زبوں حالی کے سدباب کا وسیلہ بنے گی۔

ہندوستان میں جدید مغربی علوم وسائنس کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی اور ذہن وفکر کے اعتبار سے انگریز کی نئی نسل پیدا کرنے کی غرض سے کیا تھا تاکہ ہندوستانیوں میں ایک ایسا متوسط طبقہ پیدا ہو سکے جو انگریزوں اور انگریزی حکومت کا وفادار ہو چنانچہ مسلمانوں کی اکثریت نے انگریزی زبان اور مغربی علوم وسائنس کی تعلیم کے حصول کو اپنے دین ومذہب کے لیے مسلسل خطرہ محسوس کرتے ہوئے اور اسے مضرت رساں بتاتے ہوئے ۱۸۳۵ء میں ہی آٹھ ہزار علماء کی دستخط کے ساتھ حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان انگریزی تعلیم کے خواہاں نہیں ہیں جبکہ سرسید احمد خاں نے عالمی حالات اور ملکی سیاسی، سماجی پس منظر میں اسی مغربی علوم وسائنس کو مسلمانوں کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت سے نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے مسلمانوں میں اس کے حصول اور فروغ کے لیے زبردست تحریک کی شروعات کی۔انھوں نے اپنی دوربینی، تجربات ومشاہدات اور راجا رام موہن رائے اور ان کے رفقاء اور دیگر ہندو مصلحین کی کوششوں سے ہندو برادران وطن نے بہت پہلے انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم وفنون کو اپنا کر جو کامیابی حاصل کی تھی اس کی زندہ مثالیں بھی ان کے پیش نظر تھیں۔چنانچہ انھوں نے مشرقی تعلیم پانے کے باوجود اور مشرق کی ہر عمدہ چیز کے لیے اپنے دل میں قدر رکھنے کے ساتھ اور اس کی بقاوتحفظ اور فروغ کے حامی ہوتے ہوئے بھی مغربی علوم وسائنس کی مثبت اور صالح قدروں سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں جدید انگریزی تعلیم اور سائنس کے فروغ کی کوششیں کیں اور اسے ہی مسلمانوں کی زبوں حالی اور ابتری سے نجات کا سب سے اہم اور تیر بہ ہدف نسخہ قرار دیا چنانچہ ان کے مجوزہ نسخۂ کیمیا

www.urduchannel.in

سے متعلق ان کے بعض اقوال ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جو ان کے تعلیمی تصورات ونظریات کے ترجمان بھی ہیں۔

''ہندوستانیوں کو اس درجہ تعلیم دی جائے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جاوے۔''

''کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔''

''ہندوستانیوں کی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندے، اپنے انتظام، اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کی خودسری اور مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں۔''

''تعلیم وتربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکا لو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔''

''میں تم سے سچی بات کہتا ہوں قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔''

''کاش میرے وطن میں بھی ایسے لوگ ہوتے جو قومی خدمت کو ذاتی نام ونمود سے علٰحدہ رکھتے اور وطن کی خدمت کا جذبہ ذاتی منفعت پر غالب آجاتا۔''

''زمانہ روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے اگر زمانہ کسی حد تک منتہیٰ ہو جاتا تو یہ خیال صحیح تھا کہ علوم منتہیٰ ہو گئے۔''

''ہائی ایجوکیشن ہمارے اندر وہ اعتماد اور صلاحیت پیدا کر دے گی کہ ہم جو چاہیں گے حکومت کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔''

''اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیئے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہے تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً وکرہاً ہم کو دلا دے گی۔''

www.urduchannel.in

''وہ دن دور نہیں کہ ہر ضلع میں ایک ایسے شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا۔ وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کروگے۔''

''ہنر فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلا درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور تربیت وشائستگی تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔''

مذکورہ بالا اقوال سے سرسید احمد خاں کے جس قسم کے تعلیمی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اس کا مرکزی نقطہ ہے کہ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم کے حصول میں سرگرم عمل ہونا چاہیئے ۔تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیئے اور بہر صورت اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کرنا چاہیے کیوں کہ تعلیمی بیداری اور تعلیمی ترقی کی صورت میں ہمیں بہر حال باعزت اور باوقار شہری کی حیثیت حاصل ہوگی اور ہمارے حقوق کے حصول کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔ سرسید یہ قطعی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا معاملہ محض سرکاری اسکولوں کے بھروسے رہے اور مسلمان اپنے بچوں کو مشنری یا دوسرے عیسائی تبلیغ کے تعلیمی اداروں میں حصول تعلیم کے لیے بھیجیں کیوں کہ انھیں اپنا مذہب' اپنی تاریخ' اپنا عقیدہ' اپنی تہذیب وثقافت اور ماحول ومعاشرہ کافی عزیز تھا۔ اور نئی نسل کو اس سے نابلد رکھنا وہ خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب تعلیمی ادارے مسلمانوں کے اپنے ہوں چنانچہ انھوں نے مختلف موقعوں پر اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

''مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش نہیں پیدا ہوتا ان کو غیرت نہیں آتی۔''

''کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں ہوسکتی کہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔''

''وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے یا ان سے بے خبر رہے۔''

''جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ

www.urduchannel.in

گذشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ راستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔''

سرسید احمد خاں کے ذہن میں مسلمانوں کے لیے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور تھا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھا اور وہ مسلمانوں کے لیے جس قسم کی جدید تعلیم کے لیے سرگرم عمل تھے اس میں کسی بھی حال میں مذہب، عقیدہ اور تہذیب و معاشرت کو داؤ پر لگائے بغیر بلکہ ان کے تحفظ و بقا کے ساتھ دلانے کے ہمنوا تھے۔ وہ نہ یکسر مشرق بیزار تھے اور نہ ہی مغرب پسند وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسیوں کے محض اس لیے حمایتی تھے کہ مغربی تعلیم و سائنس سے ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچنے والا تھا لیکن لارڈ کی طرح وہ ہندوستانیوں کو محض سند یافتہ بنانے کے قائل نہیں تھے بلکہ لارڈ میکالے کی فکر کے برخلاف مسلم نوجوانوں کا ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہنی و فکری بیداری ہو، اپنے حقوق کے لیے جرأت ہو، قناعت پسندی اور توہم پرستی کے بجائے حقائق پسندی ہو اور وقت و حالات کے قدموں کی آہٹ پہچاننے کی صلاحیت کا حامل ہو اور نسلاً بعد نسلاً علم و فن اور ہنر و حرفت کے چراغ سے چراغ جلانے کی روایت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں، اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔''

''اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں کہ کسی مسلمان نے بی.اے یا ایم.اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔''

''پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ تعصب چھوڑیں اور بعد تحقیقات اور مباحث کے سلسلہ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جو ان کے دین اور دنیا دونوں کے لیے مفید ہو۔''

''انسان کی تعلیم درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ دل کے سوتوں کو کھولنا ہے اور ان کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے۔ جو اندرونی قویٰ کو حیرت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔ اور انسان کی تربیت کرنا اور اس کے لیے سامان مہیا کرنا اور اس سے کام لینا ہے۔''

www.urduchannel.in

''مسلمانوں کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔
یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ یہ فصاحت و بلاغت میں سمٹک
زبانوں میں لاثانی ہے۔اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں۔
لیکن جب ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر کرنے کے
ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل
انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیے۔''

سرسید احمد خاں کی شخصیت انتہائی نباض اور ان کی نگاہ بے پناہ دور بیں واقع ہوئی تھی۔انھوں نے اپنے دور کے حالات کے آئینے میں آنے والے سائنسی ترقی کے زمانے کا نہ صرف عکس دیکھ لیا تھا بلکہ اس کے قدموں کی آہٹ اور معیار و مزاج کا بھی ایک انتہائی تجربہ کار حکیم و نباض کی طرح بالکل صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔اور اسی کے لحاظ سے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بے قرار تھے۔وہ بخوبی جان گئے تھے اور عالمی و ملکی حالات کے تناظر میں یہ سمجھ گئے تھے کہ آئندہ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی ترقی کے ماحول میں جدید مغربی تعلیم کے حصول کے بغیر کسی طرح بھی مسلمان ہم آہنگ ہونے والے نہیں ہیں اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی عصری تعلیم پر زور دیا۔اس کے لیے جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تشکیل کا منصوبہ تیار کیا جس میں عقیدہ و ایمان کے تحفظ و بقا اور مذہب و ثقافت کی برقراری کے باوجود مسلمان آنے والے ترقی یافتہ حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی اہلیت پیدا کر سکیں۔

''تم اپنے حال کا اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔آپ کے بزرگ جس
زمانے میں تھے انھوں نے اپنے تئیں اس زمانہ کے لائق بنا لیا تھا اس لیے وہ
دولت و حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانہ میں ہم ہیں، ہم نے اپنے
تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا اور اس لیے نکبت اور ذلت میں ہیں۔''

''وہ تیلیاں (یعنی پرانا نظام تعلیم) جس ڈور سے بندھی تھیں ٹوٹ گئیں۔
اب دوسرا ڈوران کے باندھنے کو ہونا چاہیئے۔''

''ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملکوں میں آڑتھ اور کمپنیاں قائم کریں جس سے
اعلا درجے کے تاجر ہوں ملک کی پیداوار اور دوسری چیزیں جو زمین
میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔''

www.urduchannel.in

''وقت کم اور کام بہت ۔ نہ مجھ میں یہ قوت کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھادوں نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں ۔اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہو جاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں ۔''

''ہمارے کالج میں شیعہ سُنّی دونوں بورڈ ہیں اور ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ دونوں میں اتفاق زیادہ ہو۔''''ہر ایک مذہب والے کا دوسرے مذہب والے کے پیچھے نماز پڑھنا ہر ایک مسجد میں بغیر اس کے کہ وہ کس مذہب (فرقہ) والے کی بنوائی ہوئی ہے نماز پڑھنا شروع کر و تو بہت کچھ تنازعات اور تعصّبات باہمی کم ہو جائیں گے ۔''

''افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں ۔اے بھائی مہدی! فکر کرو اور یقین کرو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے ۔''

''تمام علوم وفنون اس زبان میں ہیں جو سب بولتے ہیں ۔اگر آج انگریزی زبان میں تمام علوم وفنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں، گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو آج تک تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں ۔اور آئندہ کو بھی جب تک تمام علوم وفنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی ۔''

''درحقیقت ہندوستان میں اب تک ہائی ایجوکیشن کا وجود ہی نہیں ہے ۔ ہماری یونیورسیٹیوں نے ہم کو اب تک صرف ہائی ایجوکیشن کے دروازے تک پہنچا دیا ہے ۔مگر اس کے اندر جانے کا راستہ بند کر رکھا ہے ۔انسان کی تعلیم کی عمدہ حالت ہونے کو یہ بات لازم ہے کہ وہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور ایک میں کامل ہو۔مگر ہندوستان کے کالجوں اور ہماری یونیورسیٹیاں

www.urduchannel.in

ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل نہیں کرتیں .....
ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بہ موجب قواعد انیس برس کی عمر میں اس قدر قابلیت حاصل کرلیں کہ وہ انگلستان میں جاکر سول سروس کے مقابلہ کے امتحانات میں اپنے ہم پیشہ انگریزوں کا ساتھ دیں۔''

''ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ.....ہماری تجارت کی محمڈن اینڈ ہندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، ڈبلن میں، برسلز میں، سینٹ پیٹرس برگ میں، برلن میں، وینا میں، قسطنطنیہ میں، واشنگٹن میں، اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں۔ جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت، اور حکومت حاصل ہو۔''

''مدرستہ العلوم بیشک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔''

سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات میں مفید اور کارآمد تعلیم کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد، قومی جذبے اور فروغ وطنیت، بین المسلمین اتحاد و اتفاق، قومی یکجہتی، تجارتی اور معاشی ترقی اردو زبان و ادب کی توسیع و اشاعت، عدم لسانی تعصب، دین و دنیا کی بھلائی اور آنے والے ترقی یافتہ اور تیز رفتاری سے ہم آہنگ ہونے کی سرگرمی سبھی کچھ شامل تھے اور ان سب کے لیے انھوں نے تعلیم کو ہی ذریعہ بنایا تھا اور تعلیم کو عظیم مقاصد سے مربوط کرکے اس بات کی دوٹوک وضاحت کردی تھی کہ قومی اور ملی ترقی کا واحد ذریعہ جدید مغربی تعلیم کے حصول کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح و مثبت رہنمائی کرتے ہوئے زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے موقف پر پورے طور پر کاربند رہے۔ ان کے تعلیمی تصوارات میں اس نصاب تعلیم کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جو انھوں نے مدرستہ العلوم کے قیام کے بعد اس میں تعلیم کے لیے ترتیب دیا تھا جس میں ان کی تعلیمی فکر، تربیتی سوچ اور تعلیم و تربیت سے متعلق ان کی عملی کارکردگی بھی شامل تھی ذیل میں ان کے ترتیب کردہ نصاب تعلیم کو پیش کیا جاتا ہے جس میں تعلیم و تربیت کی اہمیت و افادیت اور اس میں بتدریج اضافے کی خوش آئند اطلاع اور طلبا میں ان کی اہلیت و صلاحیت کے اجاگر ہونے کی نفسیاتی خوبی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔

(۱) علم ادب: زبان دانی و انشاء پردازی، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی زبان و ادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات، مینٹل سائنس، یعنی قوائے انسانی، منطق، فلسفہ اور سیاسیات۔

www.urduchannel.in

(۲)علم دینیات: فقہ،اصول فقہ،حدیث،اصول حدیث،تفسیر،سیرت اور عقائد
(۳)علم ریاضیات: علم حساب،جبر ومقابلہ،علم ہندسہ،فروعات اور علم اعلا ریاضی۔
(۴)علم طبیعات: علم سکون،علم حرکت،علم آب،علم ہوا،علم مناظر،علم برق،علم ہیئت،علم آواز،علم حرارت اور نیچرل فلاسفی۔
(۵)علوم خاص: انجینئرنگ،علم حیوانات،اٹانومی (تشریح)،باٹنی (نباتات)،جیالوجی (طبقات الارض)،
منرالوجی (علم جمادات) اور کیمسٹری (کیمیا)۔

مضامین کا مذکورہ بالا کمبی نیشن جس زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا انتہائی ایڈوانس اور ترقی یافتہ تھا جس میں تعلیم اور درس وتدریس کی ماہرانہ صلاحیت جھلکتی ہے۔لیکن اتنے سارے مضامین اور اسٹریم کی کارآمد تدریس کے انتظام کے لیے کافی رقوم درکار تھیں اور جس کے لیے ایک مجلس خزینۃ البضاعت (فنڈ کمیٹی) تشکیل کی گئی تھی جو رقوم کی فراہمی، سرمائے کی حفاظت، جائداد کی خریداری اور آمدوخرچ کے حساب وکتاب کی بھی ذمہ دار تھی اور اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ جو رقم جس مد کے لیے حاصل کی جائے وہ اس مد میں صرف بھی کی جائے اس طرح جب مختلف کمیٹیوں کی تشکیل ہوگئی اور تمام تشکیل شدہ سب کمیٹیاں اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرم عمل ہوگئیں تو ایک اعلانیہ کے ذریعہ عوام سے یہ بھی استفسار کیا گیا کہ ''مدرستہ العلوم'' کہاں قائم کیا جائے؟ چنانچہ لوگوں کی موصولہ کثرت رائے کی بنیاد پر علی گڑھ میں قائم کرنے کا فیصلہ لیا گیا سرسید احمد خاں کی سرکردگی میں مدرسہ کے قیام اور اس کے دیگر معاملات کے سلسلے میں جو بھی طریقے اپنائے گئے وہ جمہوری طرز کے ہی تھے گویا سرسید اس طرح لوگوں میں جمہوری ذہن سازی بھی کررہے تھے۔انھوں نے مدرستہ العلوم میں جس تعلیم کے حصول کے انتظامات کو اولیت دی تھی اس کے دو حصے تھے۔پہلا مغربی جس میں ذریعۂ تعلیم (میڈیم) انگریزی زبان کو رکھا گیا تھا دوسرا مشرقی (اورینٹل) تھا جس میں تمام علوم اردو میں پڑھانے کی تجویز تھی اور یہ طالب علموں پر منحصر تھا کہ وہ کس میڈیم کے ذریعہ اور کس قسم کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ان دو حصوں کے علاوہ ایک تیسرا حصہ بھی رکھا گیا تھا جس میں انگریزی اور اردو میڈیم کے فارغ التحصیل طلبا کو ان کی خواہش کے مطابق عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا اور مدرستہ العلوم کو دو سطحوں کی تعلیم میں تقسیم کردیا گیا تھا (۱) مدرسہ یا اسکول (۲) مدرستہ العلوم یا کالج۔

مدرسہ یا اسکول کا نظام الگ تھا اس میں سکونت اختیار کرنا طالب علم کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔اس میں داخلے کی عمر کم ازکم دس سال،تعلیم کی مدت پانچ برس اور روزانہ تعلیم کا وقت پانچ گھنٹے متعین تھا۔ہر سال امتحان میں کامیاب طالب علم کے لیے وظیفہ کا بندوبست تھا اور طلبا کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرنس امتحان میں (ہائی اسکول) شرکت کرکے کامیابی حاصل کرتے تھے۔وسطیٰ جس کی مختلف علوم میں تعلیم کی مدت چار سال تھی۔روزانہ تین گھنٹے کی تعلیم اور دو برس

www.urduchannel.in

بعد سالانہ امتحان میں کامیابی کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کے ایف.اے.(انٹرمیڈیٹ) میں شرکت اور کامیابی کے بعد اگلے دو برس بی.اے.امتحان میں شرکت کی اجازت کا بندوبست تھا اس کے بعد کسی ایک مضمون میں ایم.اے.کرنے کا انتظام تھا جس کی مدت دو سال ہوتی تھی۔لیکن ایم.اے.کے امتحان میں شرکت کی اجازت کی درخواست کے ساتھ ہی طالب علم کو اپنا تصنیف کردہ رسالہ (مختصر مقالہ) بھی پیش کرنا ہوتا تھا اور اس کی منظوری کے بعد ہی طالب علم ایم.اے کے امتحان میں شرکت کا مجاز ہوتا تھا۔اس کے بعد وظیفہ کا امتحان جو مسلسل تین دنوں کا ہوتا تھا اس میں حاصل کیے گئے نمبروں کی مجموعی تعداد کی بنیاد پر ''مدبران کمیٹی'' وظیفہ دینے کا فیصلہ کرتی تھی وظیفہ پانے والا اسکالر رفیق (فیلو) کہلاتا تھا جس کی مدت سات سال ہوتی تھی۔رفیق (فیلو) کو چھ سو روپے (Rs ۶۰۰) سالانہ وظیفہ اور رہنے کے لیے مفت کمرہ مہیا کرایا جاتا تھا اس طرح یہ مکمل تعلیمی درجہ بندی انتہائی ماہرانہ اور مفکرانہ انداز میں ترتیب دی گئی تھی جس میں سر سید احمد خاں کے وسیع اور ہمہ گیر انفرادی تعلیمی تصورات ونظریات کی عملی کارفرمائی نمایاں ہے اگرچہ بعد کے حالات و ماحول اور بعض مجبوریوں کی بنا پر اس میں کافی تبدیلی رونما ہوئی پھر بھی ان کے وسیع تعلیمی تصورات ونظریات کی روح بہرحال باقی رہی۔

(ماخوذ:تعلیم اور تعلیمی افکار)

حواشی:

(۱) حیات جاوید،مولانا الطاف حسین حالؔی

(۲) برٹش رول ان انڈیا،رام گوپال

(۳) سرسید کے لکچروں کا مجموعہ،مرتبہ:منشی سراج الدین (۱۸۹۰ء)

(۴) دیباچہ المامون،سرسید احمد خاں

(۵) خطبات سرسید،مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی

(۶) مقالات سرسید

(۷) سرسید احمد خاں اور ان کا عہد،پروفیسر ثریا حسین

(۸) سرسید اور ان کے نامور رفقا،ڈاکٹر سید عبداللہ

(۹) سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے،پروفیسر خلیق احمد نظامی

(۱۰) فکر ونظر،سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۷۲ء

www.urduchannel.in

پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی*

سرسید کا خط کرنل گراہم کے نام

گراہم حکومت برطانیہ میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ سرسید کی دلنواز شخصیت سے ہمیشہ متاثر رہا۔ اس کی یہ خواہش رہتی تھی کہ سرسید جہاں بھی رہیں وہ اُن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے، ان کی محفلوں اور صحبت میں شامل رہے۔ سرسید کے زمانۂ ملازمت میں جہاں بھی سرسید کا تبادلہ ہوتا گراہم بھی وہیں اپنا تبادلہ کرالیتا۔ اور وہ پابندی کے ساتھ ہمیشہ ان کی مختلف میٹنگوں میں بھی شریک ہونے کا متمنی رہتا۔ گفتگو کے دوران سرسید کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں اور جملوں کو بڑی سنجیدگی سے سنتا اور ان کے ہر عمل اور حرکت پر نظر رکھتا۔ اور اُنھیں بڑی دیانت داری سے قلم بند کر دیتا۔ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد گراہم کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ سرسید کی زندگی پر مبنی اس قیمتی سرمایے کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرایا جائے۔ گراہم کی ذاتی دلچسپی اور سرسید سے بے پناہ لگاؤ کے نتیجہ میں گراہم کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور ۱۸۸۵ء میں گراہم کی سرسید پر ایک کتاب بعنوان "Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan" انگریزی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ جو نہایت ہی معتبر اور مستند تصور کی گئی۔ کرنل گراہم (نے) اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''ستمبر کے اواخر میں سرسید سے میری ملاقات علی گڑھ میں ہوئی میں نے سرسید سے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ سوالات کیے کیوں کہ میں ان کی حیات وخدمات پر ایک مقالہ قلم بند کرنا چاہتا تھا اس ضمن میں انھوں نے میری درخواست قبول کر لی آگرہ واپس آنے پر میں نے سرسید پر مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون اتنا طویل ہوتا گیا کہ اس میں سب کچھ سمونا مشکل معلوم ہونے لگا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ سرسید پر ایک "Monograph"

* شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

کتابی شکل میں تحریر کر دیا جائے جو ملک کے نوجوانوں کے لیے یہ مشعلِ راہ ثابت ہو سکے۔ سرسید نے مجھے اکتوبر ماہ میں حیدرآباد کے وزیر نواب سالار جنگ سے ملاقات کے لیے علی گڑھ مدعو کیا اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے سرسید سے ان پر ایک کتاب لکھنے کی اجازت مانگی اس وقت سرسید نے قدرے تامل کرتے ہوئے اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے - "No Life No Life yet" مگر دوستوں کے اصرار پر اُنھوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور بے ساختہ کہا کہ میں خود کو آپ کے سپرد کرتا ہوں، سرسید سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور ایک طویل عرصہ سے میں ان کے رابطہ میں تھا۔ ان کے مختلف ادبی اور تصنیفی کاموں میں شریک بھی رہا۔ لہٰذا میں نے سرسید کی سوانح مکمل کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور نتیجہ کے طور پر "Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan" شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی''۔

الطاف حسین حالؔی نے ''حیاتِ جاوید'' کے عنوان سے سرسید کی سوانح ترتیب دی تھی لیکن بعض مقامات پر حیاتِ جاوید پر تاثراتی نوعیت کی سوانح ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن گراہم کی سوانح سرسید کی سماجی زندگی کی سچی ترجمان ہے۔

Colonel George Farquhar Irving Graham (G.F.I. Graham) ۳؍دسمبر ۱۸۴۰ء کو پیدا ہوا جو نسلاً ایک Scotish کا بیٹا تھا۔ اپنی ماں کی خواہش پر ۱۸۵۶ء میں بنگال انفینٹری میں بحیثیت کیڈٹ ہندوستانی سروسیز سے وابستہ ہو گیا۔ گراہم نے کلاسیکی ادب اور علم ریاضی کا باضابطہ عمیق مطالعہ کیا بعد ازاں اسے "Merovine Institute" جرمنی بھیج دیا گیا جہاں اس نے فرانسیسی اور جرمنی زبانوں پر دسترس حاصل کی۔ گراہم پہلا کمیشن آفیسر تھا جس نے ۱۸۵۶ء میں North Western Province یعنی موجودہ Uttar Pradesh کے شہر ایٹہ میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (Superintendent of Police) کے عہدے پر فائز ہوا۔ ان دنوں سرسید احمد خاں بنارس میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۶ء کے درمیان غازی پور میں پہلی بار گراہم سے سرسید کی ملاقات ہوئی۔ بحیثیت پولیس آفیسر گراہم کا بیش تر وقت "North West Proving" میں گزرا لیکن حکومتِ برطانیہ کے اعلیٰ طبقہ (Elite Class) میں اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں

www.urduchannel.in

تھی۔اس کی طبیعت میں بہت شرمیلا پن (Shyness) تھااس نے اپنی بائیس سالہ دورِ ملازمت میں صرف دوبار عوامی جلسوں سے خطاب کیا:

"Graham was only persuaded to speak in public twice in 22 years. At the same time he became fervent supporter of Sir Syed's Educational Pursuit."

کرنل گراہم ایک اچھا سوانح نگار "Biographer" اوراسلوب نگار "Stylist" بھی نہیں تھا۔لیکن سرسید کی شخصیت اوران کے کارناموں سے اسے ذاتی دلچسپی تھی اور وہ اُنھیں بڑی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔غالباً اسی تاثر نے گراہم کوسرسید کی سوانح لکھنے پرآمادہ کیا۔

سرسید پر یہ ایک تاریخی نوعیت کی سوانح ہے جوایک انگریز نے ایک ہندوستانی مدبراوردانش ور کے بارے میں قلم بند کی ہے۔جس سے سرسید سے متعلق بعض اہم تاریخی واقعات اور سماجی حالات وکوائف کاعلم ہوتا ہے۔لیکن ایک سوال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ ایک انگریز کوایک ہندوستانی دانش ور سے اس قدر دلچسپی کیوں تھی۔کیاوہ سرسید کے بارے میں انگریزوں کومعلومات فراہم کرانا چاہتا تھا۔لیکن گراہم کی اس سوانح میں سرسید سے متعلق آخری دس سالوں کے حالات وکوائف دست یاب نہیں ہوسکے۔غالباً کتاب کے شائع ہونے کے بعد سرسید کا گراہم سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا۔

ان دنوں سرسید کوسیاسی حالات اورکالج کے ناگفتہ صورتِ حال سے نبردآزما ہونا پڑ رہا تھا۔

"The establishment of Allygurh College was the grownning of his work and he had to face the keenest opposition and was eve threatened with assassination"(G.F.I. Graham)

البتہ گراہم کی کتاب "Life & Work of Sir Syed Ahmad Kahn" ایک 'Primary Source' کے طور پراس لیے اہم ہوجاتی ہے کہ اُس نے سرسید سے متعلق معمولی سے معمولی واقعات کونہایت سنجیدگی سے قلم بند کیا ہے جوموادعموماً سرسید سے متعلق دستیاب نہیں ہے۔

بعض خامیوں کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔جوسرسید سے گہرے مراسم، سچی ذہنی وابستگی اوران کی شخصیت سے دلچسپی کی بناپرضبطِ تحریر میں آئی۔

"Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan" کے شائع ہونے پر کتاب کی ایک کاپی کرنل گراہم

www.urduchannel.in

نے سرسید کو ارسال کی۔ کرنل گراہم لکھتا ہے:

With regard to my book on his life, I received the following letter:

Allygurh, 24th November, 1885

"My dear Graham, By the last mail I received a copy of the book which you have called the "Life & Work of Syed Ahmed Khan", but which I call 'the favour of Graham to Syed Ahmed Khan' Although the book is well written, is neatly got up, has a good cover, and is a thing to be proud of on account of its author, yet the only defect in it is that it is devoted to the life of one like my humble self. The reader cannot help thinking of the following verse of a Persian poet, 'If you combine in you one good quality and seventy bad ones, your friend will overlook them all and direct his attention to that one good quality.' I looked through the book carefully, and turned it all over trying, if I could, to find out any word in it which might give me genuine pleasure and be something to be proud of, and immense was my joy on finding out the following words in its preface: 'I have known Syed Ahmed more like a relative, I may say, than a friend.' I assure you that I shall always feel proud of it. The sentence is as much a matter of pride to me as it is of advice to the Anglo-Indians. It would be a good piece of advice for them to act upon, and they will be able to realize that such friendship and sympathy is quite possible between Europeans and the natives of India.

However, putting aside the subject of the book, and whether it ought, or ought not, to have been written about an insignificant person like myself, I am glad that you have completed the work on which you had set your heart, and that your labour of love has come to an end. I congratulate you most cordially on this, and at the same time I congratulate myself on the fact that though I did not approve of such a book being written, I have way to the pleasure of one whom I value, not only as a friend, but as a brother. Remember, dear Graham, I do not mean an elder brother, for I am older than you in respect of years, and I acted on the Persian saying, 'It is easy to atone for the breaking of an oath, but it is a mighty wrong to grieve a friend.

www.urduchannel.in

Herewith I enclose some cuttings from the 'Pioneer', containing letters that appeared about one or two points treated of in your book.

"We had very heavy rain this year, and as a natural consequence we had a good deal of fever after the rains. I have had fever, too, once or twice, but now I am quite well again, and the weather is getting lovely (sic). Syed Mahmud is also here, busy on his work on the Mahommedan Law. His leave will expire towards the close of March, when, I think, he will have to go back to his substantial post at Rai Bareli, until a vacancy occurs in the High Court. Lord Dufferin will soon be at Agra, where he is going to hold a levee. Sir Alfred Lyall asked me to come over to Agra, and I am going by to day's mail. I wish you had been there so that I could then enjoy my visit. I trust this will find you and Mrs. Graham and children well and happy.

With kindest regards for Mrs. Graham and yourself.

Believe me,
Yours ever sincerely
(Sgd.) Syed Ahmed

سرسید کا مذکورہ خط اظہارِ تشکر بھی ہے اظہارِ مسرت بھی اور گراہم سے سرسید کی گہری وابستگی نیز روزمرہ کی خبر گیری اور معاملات کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

۱۸۷۰ء میں Public Committee کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً تعلیم کے معیار کو بلند کرنا تھا۔ اور خصوصاً مسلمان نوجوانوں میں سیکولر تعلیم (Secular Education) کا احیاء تھا تاکہ وہ نہ صرف حکومت کے ساتھ وفادار ہوں بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ترقی کے زینے طے کر سکیں ہندوستان میں پہلی بار یہ دیکھا گیا کہ علی گڑھ کالج میں بلاتفریق مذہب وملت اور مسلک ملک کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب یعنی دہلی کے علاوہ بنگال، حیدرآباد اور دور دراز علاقوں سے طلبہ ایک ہی نوع کی تعلیم حاصل کرنے آئے اور سب کا مقصد صرف ایک تھا یعنی اعلیٰ سطح پر حصول تعلیم۔

گراہم اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے کہ علی گڑھ کالج دنیا کا پہلا واحد سیکولر تعلیمی ادارہ تھا جہاں کے بنیاد گزاروں نے مختلف مذاہب اور مسلک کے لوگوں کے لیے کالج کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ۲۵۹ طلبہ میں ۵۷ ہندو اور تقریباً ایک چوتھائی طلبہ میں عیسائی، پارسی تھے جو کالج کے احاطہ میں سیکولر نوعیت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

www.urduchannel.in

(Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan, p 274)

At the time of writing my first edition of his life. Syed Ahmed was alive and well. I then wrote as follows:

"Syed Ahmed has now resided for many years in his comfortable house in Allygurh, which was purchased and furnished for him in European style by his son, the Hon. Syed Mahmud. Here he entertains his numerous guests who visit him from all parts of India Mohammedans, Sikhs, Hindus, and Englishmen. The doors are always open. The whole atmosphere is redolent of literature. His sitting room, in which he passes most of the day at the desk, is full of books and papers; the walls of his dining- room are covered with bookcases filled with standard English works; and his library-a splendid room-is stocked with a vast variety of books, including numerous theological works used by him in writing his Commentary on the Bible, Koran, &c. One of the not least interesting books to me is Syed Mahmud's prize taken at Cambridge for the best English essay! In the drawing- room is the diploma making Syed Ahmed a fellow of the Royal Asiatic Society, of which he is particularly proud. On the wall opposite is a full-length portrait in oil of his friend Sir John Strachey, a lifelike likeness. There are also portraits of Sir Salar Jang, Lord Lytton, and his Highness the Nizam of Hyderabad. The days for him pass pleasantly and quickly. One of his great characteristics is his untiring energy. In addition to great breadth of views on questions of national importance, he possesses a power of work as regards minute details which is astonishing. Up at 4 A.M., he writes his newspaper articles, his books and pamphlets -sees visitors, official and private-and conducts the onerous duties of his secretaryship to the College Committees not only by day, but not unfrequently far into the night. With him mental labour of the higher kind tends to long life and sound health. His meals are served in European style, and he is a rigid abstainer from all liquor except Adam's ale. At and after dinner friends drop in. The topics of conversation range from discussions on metaphysics, religion, and politics, to quotations from Persian poets and humorous anecdotes. He is of middle

www.urduchannel.in

height and of massive build, weighing upwards of nineteen stone. His face is leonine-a rugged witness to his determination and energy. If, however, rather stern and forbidding when at rest, it lights up genially when speaking, reflecting the warmth of heart which he so largely possesses. He has a hearty laugh, and enjoys a joke as much as any man. He will put his stick under the table at dinner, and suddenly frighten those present by pretending to see a snake. Or again, the subject of conversation is the reform of his nation. One of his listeners is sleepy and nods. The Syed is anxious that all should attend. The sleepy member says he hears everything, but he presently nods again. All of a sudden a terrific shout of alarm is heard which makes every one jump, including the sleepy one; but all they see is the old Syed in roars of laughter! He has been a widower for many years, and has only had one wife. He informed me the other day, with a twinkle in his eye, that "he might marry again! But," said he, " she must be English, in order that I may mix more freely in English society, and she must be eighty years old, and have lost all her teeth! " He is a born orator. His delivery, when he warms to his subject, resembles that of Mr. Gladstone. His lips quiver with suppressed emotion; the voice and figure follow suit,-and these evidences of intense feeling communicate themselves with electric rapidity to his audience. He is intensely cosmopolitan. To substitute "Mohammedan" for "Englishman" in eloquent words used lately in describing the late Lord Ampthill: "It is an exceedingly rare thing for an ordinary Mohammedan, even of the better sort, thoroughly to realise the fact, however emphatically he admits the theory, that Mohammedans and other races are of the same flesh and blood, and are amenable to the same passions and impulses. It is still rarer to find a Mohammedan who not only understands this to be the case, but proves his perception of it in practice. Syed Ahmed is so completely master of this art that national distinctions disappear before him, and rising above all accidental conditions of climate and race, of latitude, longitude, and ethnic idiosyncrasy, he gazes, by dint of his own power of judicious generalisation, upon an image which is none other

www.urduchannel.in

than that of human nature itself. He preserves the patriotism and pride of the stock from which he is sprung, and has divested him-self of all its prejudices." There was not another Mohammedan in India so fitted to take the lead in the great Mohammedan educational movement as he: no other Mohammedan gentleman possessed the ability, the eloquence, the great reputation, the cosmopolitanism, and the intense energy and perseverance of the subject of this sketch. Had. it not been for his great efforts, the Mohammedan would have been far further behind the Hindu community as regards education than it now is; and if the movement increases with the rapidity which has hitherto characterised it, the Mohammedans will soon be abreast of the Hindus. Amongst the mighty forces which have been silently changing the aspect of affairs in India during the last forty years, Syed Ahmed Khan's name will, to future generations, occupy a conspicuous place.

"I have now traced his honourable and laborious career from his earliest years up to the present, and trust that the picture, though very imperfectly drawn, may act as I stimulant to the rising generation of our Indian gentry. I have shown how a native gentleman of high and distinguished family, but poor, educated only up to his nineteenth year, has raised himself from the lowest rung of the official ladder to the highest, and also educated himself, without the great advantage of a knowledge of English, to become, as he now is, the foremost Mohammedan of his day in India."

گراہم کی یہ تحریر نہایت ہی دلچسپ معلومات افزا ہے جو تاریخی نوعیت کے ساتھ ساتھ سرسید کے عزائم مسلک و معاملات اور ذاتی زندگی کے حالات وکوائف کی غماز ہے۔

www.urduchannel.in

ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی *

مضامین سرسید کی عصری معنویت

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ء-۱۸۱۷ء) برصغیر میں مسلم نشاۃ الثانیہ کے بہت بڑے علمبردار، مصلح قوم، ادیب، صحافی، علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کے بانی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ انیسویں صدی کے بہت بڑے مصلح اور رہبر تھے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انھیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ وہ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر مصلح تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں پر زمین تنگ ہوگئی تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے، سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ اُن کی جائدادیں ضبط کرلیں گئیں تھیں۔ نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان ''سائیس، خانساماں، خدمتگار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے۔ سرسید نے محسوس کرلیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ بدستور ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔ انہیں کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے۔

سرسید نے اپنی اصلاحی باتوں کو عام کرنے کے لیے صحافت اور قلم کا سہارا لیا اور ایک ایسے دور میں جب کہ اردو نثر پر مسجع اسلوب کا اثر تھا انہوں نے اردو مضمون نگاری کو سادگی عطا کی اور اپنے اصلاحی خیالات کو اپنے مضامین کے ذریعے پیش کرنے لگے۔ سرسید احمد خان کو اردو مضمون نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک مغربی نثری صنف Essay کی

* صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، تلنگانہ

www.urduchannel.in

طرز پر اردو میں مضمون نگاری شروع کی۔ وہ بیکن، ڈرائڈن، ایڈیسن اور اسٹیل جیسے مغربی مضمون نگاروں سے کافی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے بعض انگریزی انشائیہ نگاروں کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا اور اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں انگریز انشائیہ نگاروں کے اسلوب کو کافی حد تک اپنایا اور دوسروں کو بھی اس طرز پر لکھنے کی ترغیب دی۔ سرسید کے سارے مضامین Essay کی حد میں داخل نہیں ہو سکتے، مگر مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''تہذیب الاخلاق'' کے کچھ مضامین تعصب، تعلیم و تربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث و تکرار، اپنی مدد آپ، عورتوں کے حقوق، ان سب مضامین میں ان کا اختصار قدر مشترک ہے۔ جو ایک با قاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔ سرسید کے یہ معلوماتی اور اصلاحی مضامین اردو ادب میں مضمون نگاری کے باب میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ انیسویں صدی میں جس طرح مسلمان خواب غفلت میں ڈوب کر مایوس زندگی گذار رہے تھے۔ انہیں سرسید جیسے مصلح کار کی ضرورت تھی۔ کچھ ایسے ہی حالات آج اکیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کے ہو گئے ہیں۔ مسلمان سیاسی طور پر غیر اہم ہو گئے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں سب سے بڑی اقلیت سمجھے جانے والے مسلمانوں کے ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ مسلمان تعلیمی میدان میں پسماندہ ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا جائزہ سچر کمیٹی نے لیا اور انہیں تحفظات فراہم کرنے اور مناسب نمائندگی دینے کی بات کی ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کے لیے تحفظات کے مطالبے زور پکڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں میں کئی سماجی لعنتیں ہیں جیسے اسراف، جہیز کی لعنت، سود خوری، شراب نوشی، مذہب بیزاری، آپس میں عدم اتحاد اور تن آسانی وغیرہ۔ اکیسویں صدی کا مسلمان آج پھر ایک سرسید ثانی کی تلاش میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب تاریکی زیادہ ہو تو اس میں موہوم سی امید کی کرن بھی بہت بڑی روشنی کا کام دیتی ہے۔ موجودہ سیاہ اور تاریک سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات میں کیا یہ سوال درست نہیں کہ اگر ہمارے درمیان کوئی سرسید ثانی نہیں تو کم از کم ہم سرسید کی تحریروں سے حاصل کریں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سرسید کے چھوڑے ہوئے اصلاحی و ادبی سرمائے سے استفادہ کریں اور اپنی رہبری آپ کریں۔ سرسید کے مضامین سے استفادہ اس وقت ممکن ہے جب اردو میں موجود ان کے مضامین کو زیر مطالعہ رکھا جائے اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو ہماری نئی نسلوں تک پہنچایا جائے اور انہیں اسلاف کے کارناموں سے سبق لینے کی بات کی جائے۔ آج ہماری قوم کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی مادری زبان اردو سے نابلد ہوتی جا رہی ہے اس لیے اردو زبان میں موجود بیش قیمت سرمایے سے استفادہ ممکن نہیں دکھائی دیتا۔

مضامین سرسید کی عصری معنویت:

سرسید احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں جو مضامین لکھے بعد میں ان میں سے کچھ منتخبہ مضامین ''مضامین سرسید''

www.urduchannel.in

کے نام سے شائع ہوئے۔ان مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔طالب علموں کے نام ایک خط،علم،ترقی انشا، تعلیم،تعلیم وتربیت، باہمی اتحاد،طریقہ زندگی، ہمدردی،تعصب، بحث وتکرار،عورتوں کے حقوق،تربیت اطفال،اپنی مدد آپ،آزادیٔ رائے،تہذیب،قومی اتفاق،خودغرضی اور قومی ہمدردی،رسم و راج،رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات،نوروز،امید،امید کی خوشی،گذراہوازمانہ،کارخانہ قدرت،سراب حیات۔

سرسید کے مضامین کے عنوانات پرنظرڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر موضوعات پر موجودہ زمانے میں بھی بات کرنے کی ضرورت ہے۔زندہ قوموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ پر اپنی عمارت کھڑی کرتی ہیں اوراپنے اسلاف کے ورثے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مستقبل کو بہتر بناتی ہیں۔اگر ہم سرسید کے اس ادبی سرمایے سے استفادہ کریں تو ممکن ہے کہ موجودہ حالات میں بھی مسلمانوں کو زندگی کی بچھڑی راہوں میں رہبری و رہنمائی ملے۔مضامین سرسید کے مطالعے سے اس میں چھپے گوہر سامنے آتے ہیں۔مضامین سرسید کے پہلے مضمون کا عنوان''طالب علموں کے نام ایک خط'' ہے۔اس مضمون میں سرسید نے ناصحانہ انداز میں طالب علموں کو وقت اور زندگی کی اہمیت سے واقف کرایا۔اپنے مشاہدے کو تمثیل کے طور پر بیان کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

> ''بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن گیا۔ٹرین کو جانے کے لیے تیار دیکھا۔مسافر گٹھری باندھے سوار ہونے کے لیے تیاری کررہے ہیں اور بہت سے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے خوشیاں منارہے ہیں۔اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گھنٹی ٹن ٹن کر ریل یہ جاوہ جا۔اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین ہے نہ وہ رونق' اسٹیشن پر ایک پژمردگی اور اداسی کا عالم ہے یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین زندگی کی رفتار سے خبر دیتی ہے۔جولوگ کہ سوار ہوئے ہیں وہ مسافر ملک عدم ہیں اور جوآتے ہیں وہ واردان ملک ہستی ہیں۔اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو وہ زمانہ رہا نہ وہ طاقت رہی اب جب کہ کسی اسکول یا کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو کھڑا ہوجاتا ہوں اور سرد آہ بھر کر کہتا ہوں کہ افسوس اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہوسکتا۔کیا اچھا ہو کہ میں اس تحریر کے ساتھ پھر زندگی کا از سرنو سفر شروع کروں۔اب کیا ہوسکتا ہے پس اے طالب علمو!اور اے میرے ملک کے ہوشیار امیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب

www.urduchannel.in

ہوں کہ میری تلف شدہ عمر تمہارے رستہ میں نوٹس بورڈ ہو جس پر درج ہو
کہ..........خبردار اس طرف خطرہ ہے سنبھل کر چلو'۱ے

سرسید کے طالب علموں کے نام لکھے گئے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات کو مثالوں کے ذریعے پیش کیا کہ زندگی مثل ٹرین کا سفر ہے جہاں دنیا کے اسٹیشن پر لوگ آتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سرسید نے اس خط کے ذریعے بچوں کو تربیت دی ہے کہ وہ زندگی میں اپنے لیے اچھا مقصد طے کریں اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن دیر سے پہنچے اور اگر ٹرین جا چکی ہو تو وہ ریل سے یہ شکایت نہیں کرسکتا ہے کہ وہ اسے لیے بغیر کیوں چلی گئی۔ جب کہ اسے ٹرین میں سوار ہونے کے لیے وقت پر ریلوے اسٹیشن پہنچنا ضروری ہے۔ یہی حال ہمارے نوجوانوں کا ہے کہ اگر وہ وقت کی قدر کریں تو زندگی کے سفر میں کامیاب وکامران ہوں گے ورنہ زمانہ انہیں کچل دے گا۔

سرسید احمد خان نے اپنے ایک ایسے ہی مضمون ''گذرا ہوا زمانہ'' میں ایک بچے کے خواب کو پیش کیا جس میں وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اسے افسوس تھا کہ اس نے زندگی میں کچھ اچھے کام نہیں کیے لیکن بچہ جب جاگتا ہے تو روتے ہوئے کہتا ہے کہ اب میں وقت کی ناقدری نہیں کروں گا اور خواب سے وہ حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہے۔ اس طرح کی تمثیل نگاری سبق دینے کے لیے کی جاتی ہے۔ اور موجودہ دور کے بچوں اور نوجوانوں میں فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے جو وقت کی بربادی دیکھی جا رہی ہے ان کی زندگی میں عمل کی چنگاری پیدا کرنے کے لیے سرسید کے ان مضامین سے استفادہ ضروری ہے۔

''مضامین سرسید'' میں شامل ایک مضمون کا عنوان ''علم'' ہے۔ سرسید نے یہ مضامین ایک ایسے دور میں لکھے تھے جب کہ مسلمان خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے اور تعلیم کے ثمرات سے محروم تھے۔ چنانچہ سرسید نے اس مضمون میں ایک بھولے بھالے انسان کی طرح خود سے سوالات کیے، جانور اور انسان میں فرق، عقل اور علم میں فرق کو بیان کرتے ہوئے آخر میں اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی کہ علم انسانیت کا زیور ہے جو اسے جہالت کے اندھیروں سے نکالتا ہے۔ مضمون میں سرسید کی خود کلامی ملاحظہ ہو:

> ''پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کاریگر نے جو انسان کو اور جانوروں سے
> بھی زیادہ درندہ بنایا ہے اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے تو کیا چیز اس
> کو دی ہے جس سے وہ یہ سب چیزیں کرسکتا ہے اور تمام مشکلوں پر فتح پاسکتا
> ہے اتنے میں میرا دل بول اٹھا عقل..........مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے
> تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے۔ اور نہ اس کے بغیر یہ

www.urduchannel.in

مشکل حل ہوسکتی ہے۔ یہ تو کسی دوسری چیز کو حاصل کرنے کے بہ طور آلہ کے ہے۔ مثلاً سونا چاندی ہماری بھوک نہیں مٹا سکتے لیکن ان چیزوں کو دلاتے ہیں جن سے بھوک مٹ سکتی ہے۔ بہت سی تلاش اور جستجو کی میں نے۔ اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز علم ہے جس کے معنی دانستاً جاننے کے ہیں۔''[۲]

سرسید نے افہام وتفہیم کے ذریعے سمجھایا کہ تعلیم انسان کو بہتر زندگی گزارنے کے لیے بے حد لازمی ہے۔ سرسید کا ہر مضمون اپنے اندر آفاقی پیغام رکھتا ہے اور ان مضامین میں کہی گئی باتوں کی ہر زمانے میں اہمیت محسوس کی جانی چاہئے۔ موجودہ حالات میں ہندوستان میں قومی یکجہتی کے لیے بڑا چیلنج کھڑا ہوگیا ہے اور کچھ جنونی کثرت میں وحدت والے اس عظیم ملک کو ایک مخصوص مذہب اور خیالات کا حامل ملک بنانا چاہتے ہیں۔ سرسید کے دور سے ہی ہندوستان میں فرقہ پرستی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور انہوں نے اسے روکنے کے لیے اپنے مضامین میں قوم کا لفظ استعمال کرکے ہندوستان میں صدیوں سے پرامن زندگی گزارنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی اتحاد کا سبق پڑھایا تھا۔ اپنے مضمون آپسی اتحاد اور تعلیم میں وہ ہندوستانیوں کو بہ طور ایک قوم متحد ہونے کا سبق پڑھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں۔ اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب وہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ بس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہو ان دونوں کو علٰحیدہ علٰحیدہ رکھنا دونوں کو برباد کردیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہوکر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے۔ نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے قومیں تباہ اور بگڑ جائیں گی۔ اے ہندو! اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے۔ یا اسی زمین کے گھاٹ پر نہیں جلائے جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔

www.urduchannel.in

جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جوان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہئے..... جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے اتفاق کر کے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا پس اس امر پر خیال کر کے باہم اتفاق کرنا چاہئے۔[۳]

سرسید نے ملک میں بہ حیثیت قوم ترقی کرنے کے لیے باہمی اتحاد کو اہم قرار دیا ہے۔ موجودہ ہندوستان کے حالات میں مسلمانوں اور دانشور طبقے کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ فرقہ پرست ذہنوں اور حکومت کے طبقوں کو یہ باور کرائے کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے باہم اتحاد اور اتفاق ضروری ہے ورنہ نفرتیں بڑھیں گی اور دیمک کی طرح ملک اندر سے کھوکھلا ہو جائے گا۔

سرسید احمد خان نے اپنے مضمون ''رسم و رواج'' میں لوگوں کو بے جا قدیم روایات ترک کرنے اور حقیقت پر مبنی زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے۔ مضمون ''ہمدردی'' میں لوگوں کو تلقین کی ہے کہ ان کے پاس اگر کچھ نعمت اور صلاحیت ہے تو اسے ضرورتمندوں میں بانٹیں اور ہمدردی کا اظہار کریں جو اچھی صفت ہے اور انسان کو انسان بناتی ہے۔ مضمون ''تعصب'' میں انہوں نے اسے بدترین خصلت کہا ہے کہ انسان غرور اور تکبر کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ذہن سے کسی کو غلط قرار دے کر اس سے تعصب برتنے لگتا ہے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اللہ دلوں کا حال جانتا ہے ہم کو اپنے اعمال سے پاک و صاف ہونا چاہئے، تعصب اور نفرت کو قریب آنے نہیں دینا چاہئے۔ مضمون ''بحث و تکرار'' میں انہوں نے واضح کیا کہ غیر مہذب لوگ زیادہ بحث و تکرار کرتے ہیں۔ اختلاف رائے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن اسے علم و ادب کے دائرے میں رکھ کر کرنا چاہئے۔ سرسید نے مضمون ''تربیت اطفال'' میں والدین کو آگاہ کیا ہے کہ کس طرح اپنے نونہالوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے اور ان کی دینی اور دنیاوی تربیت کرنا ہے۔ مضمون ''اپنی مدد آپ'' میں انہوں نے کہا کہ حکومت آپ کی ہر قسم کی مدد نہیں کر سکتی اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے آپ کو بھی بہت کچھ کرنا چاہئے اور اپنی مدد آپ کے اصول پر کاربند رہنا چاہئے۔ سرسید کے مضامین میں امید کا لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مضمون ''امید'' میں انہوں نے لکھا:

''زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے۔ جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں روح کی جان ہے۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے۔ اور تمام تکلیفوں کو آسان بنا دیتی ہے۔ محنت پر رغبت دلاتی ہے۔ اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے''[۴]

www.urduchannel.in

مضامین سرسید پر گفتگو کرتے ہوئے محمد عبداللہ خویشگی لکھتے ہیں:

''دنیا کی کوئی رفیع الشان عمارت اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک اس کی بنیادیں سیل حوادث کا تلاطم برداشت کرنے کے لیے عمیق اور استوار نہ ہوں۔کوئی سر بلند شجر برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اس کی جڑیں بلا خیز آندھیوں کے تھپیڑے کھانے کے لیے گہری اور پائیدار نہ ہوں کوئی نظام سوسائٹی تنازعہ البقا کے اس طوفانی مدوجزر میں سلامتی سے پار نہیں اتر سکتی جب تک اس کی سوشل کشتی کی پناہ گاہیں اخلاقیات کی مستحکم چٹانیں نہ ہوں۔سرسید کے مضامین ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ خانہ ہیں جس میں حقیقت شناس مسلمان آنکھیں کھول کر اپنی ہیئت کذائی دیکھیں کہ انہوں نے جب سے اب تک مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کتنی ترقی کی ہے اور اپنی پسماندگی سے عبرت حاصل کریں۔''۵

مضامین سرسید کے سارے مضامین ہی سبق آموز اور فکر انگیز ہیں۔ یہ مضامین انسانیت کا دستور ہیں۔ان سے استفادہ ضروری ہے۔اس کے لیے کوشش کی جائے کہ سرسید کے مضامین کو اردو کی نصابی کتابوں کا حصہ بنایا جائے۔ مضامین سرسید کی از سر نو اشاعت کی جائے اور اسکول اور کالج کے کتب خانوں تک اس کتاب کی رسائی کو عام کیا جائے۔ اسکولوں میں ہونے والے ثقافتی پروگراموں میں ان مضامین کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جائے۔اردو اخبارات کے ادبی سپلمنٹ میں ان مضامین کو سلسلہ وار شائع کیا جائے اور سوشل میڈیا سے بھی اس طرح کے مضامین کی تشہیر کی جائے۔ان مضامین کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کیا جائے تاکہ سرسید نے جو باتیں کہی ہیں اس سے انسانیت کو فائدہ پہونچے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حواشی:

(۱) سرسید احمد خان، مضامین سرسید، مرتبہ عزیز الدین اختر ادیب، علی گڑھ، ص:۴۹-۵۰

(۲) سرسید احمد خان، مضامین سرسید، ص:۵۸

(۳) سرسید احمد خان، مضامین سرسید، ص:۸۶-۸۷

(۴) سرسید احمد خان، مضامین سرسید، ص:۵۸

(۵) عبداللہ خویشگی، بحوالہ: مضامین سرسید، ص:۳۸-۳۹

www.urduchannel.in

رانا عبدالرزاق خان*

معمارقوم سرسیداحمدخان

سرسیداحمدخاں برصغیر میں مسلم نشاۃ الثانیہ کے بہت بڑے علمبردار تھے۔انہوں نے مسلمانوں میں بیداریٔ علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔سرسیداحمدخاں انیسویں صدی کے بہت بڑے رہنما تھے۔انہوں نے مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انہیں بہت بڑی قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔آپ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر راہنما تھے۔''سرسیداحمدخاں نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز ان کے خون کا پیاسا ہورہا تھا۔وہ توپوں سے اُڑائے جاتے تھے۔سولی پر لٹکائے جاتے تھے۔کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی تھی۔ان کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں تھیں۔نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے۔اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہ کی گئی تو مسلمان''سائیس، خانساماں، خدمتگار، اور گھاس کھودنے والوں کے سوا اور کچھ نہ رہیں گے''۔سرسیداحمدخاں نے محسوس کرلیا تھا کہ اُونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اس وقت تک وہ بدستور پستی میں رہیں گے۔انہیں کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے۔

سرسیداحمدخان ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔آباء واجداد شاہجہاں کے دور میں ہرات سے ہندوستان آئے۔دستور زمانہ کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمدخاں سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم میں آپ نے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ہی عربی وفارسی اَدب کا مطالعہ بھی کیا۔اس کے علاوہ آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا۔۱۸۳۷ء میں آگرہ کے کمشنر

*ایڈیٹر'قندیل ادب'انٹرنیشنل،لندن

www.urduchannel.in

کے دفتر میں بطور نائب منشی فرائض سنبھالے۔۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء مین پوری اور ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۶ء تک فتح پور سیکری میں سرکاری خدمات انجام دیں۔محنت اور ایمانداری سے ترقی کرتے ہوئے ۱۸۴۶ء میں صدر امین مقرر ہوئے۔دہلی میں قیام کے دوران آپ نے اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید''، ۱۸۴۷ء میں لکھی۔۱۸۴۵ء میں آپ کا تبادلہ ضلع بجنور ہو گیا۔ضلع بجنور میں قیام کے دوران اپنی کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' لکھی۔جنگ آزادی کے دوران آپ بجنور میں قیام پذیر تھے۔اس کٹھن وقت میں آپ نے بہت سے انگریز مردوں اور عورتوں، بچوں کی جانیں بچائیں۔آپ نے یہ کام انسانی ہمدردی کے لیے کیا۔جنگ آزادی کے بعد آپ کو آپ کی خدمات کے عوض انعام دینے کے لیے ایک جاگیر کی پیشکش ہوئی۔ جسے آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۱۸۵۷ء میں آپ کو ترقی دے کر صدر الصدور بنا دیا گیا۔اور آپ کی تعیناتی مراد آباد کر دی گئی۔۱۸۶۲ء میں آپ کا تبادلہ غازی پور ہو گیا اور ۱۸۶۷ء میں آپ بنارس میں تعینات ہوئے۔۱۸۷۷ء میں آپ کو امپیریل کونسل کا رکن نامزد کیا۔گیا۔۱۸۸۸ء میں آپ کو سر کا خطاب دیا گیا۔اور ۱۸۸۹ء میں انگلستان کی یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔۱۸۶۲ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔علی گڑھ گئے تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا۔انگلستان سے واپسی پر ۱۸۷۰ء میں رسالہ'' تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔جس میں مضامین سرسید نے مسلمان ہند کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔اور ادب میں علی گڑھ تحریک کی بنیاد پڑی۔سرسید کا عظیم کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو مغربی علوم کی تعلیم کی ترویج کے لیے انتھک اور مسلسل جدوجہد کر کے اپنی قوم کو باشعور قوم بننے میں مدد دی۔جبکہ اس وقت کے علمائے ہند اسے کفر کے فتاویٰ سے، اور کافر و زندیق، نیچری کے القابات سے نواز رہے تھے۔ نیز زبان انگریزی کو پڑھنا حرام قرار دے رہے تھے۔قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کسی بھی زبان میں خصوصاً انگریزی میں کفر گردانا جاتا تھا۔جس طرح ایک زمانے میں عیسائیت زمین کو گول ماننے سے انکار کر رہی تھی۔اسی طرح اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے جبہ پوش (جاہل) علماء نے عجیب و غریب (اپنی ناقص علمی استعداد کے مطابق حقائق کو نہ سمجھتے ہوئے) سرسید احمد خاں پر فتوے لگائے۔مگر یہ سب فتاویٰ سرسید احمد خاں کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ لا سکے۔ سرسید احمد خاں قوم کی جہالت اور کم علمی پر ماتم کناں تھے۔اور قوم کی نادانی سے نالاں ہو کر ہی انہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی۔تاکہ ان کی قوم جدید مغربی علوم پڑھ کر اعلیٰ قوم بن سکے۔جیسا کہ آج کا مسلمان سرسید احمد خاں کی ۱۵۰ سال قبل کی سوچ کو اب سمجھ گیا ہے۔

۱۸۸۷ء میں ستر سال کی عمر میں پنشن لے لی۔اور اپنے کالج کی ترقی اور ملکی مفاد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔۱۸۵۹ء میں وہ اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ انگلستان گئے تو یہاں انہیں دو مشہور رسالوں TATLER اور

www.urduchannel.in

SPECTATOR کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ دونوں رسالے اخلاق اور مزاح کے خوبصورت امتزاج سے اصلاح معاشرہ کے علمبردار تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ آپ نے ۸۱ سال کی عمر میں ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ اور اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔

تہذیب الاخلاق کا اجراء:

۱۸۵۷ء کی جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانان برصغیر کی سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے سرسید احمد خاں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے انہیں مسلمانان برصغیر کبھی نہیں بھلا سکتے۔ انہیں کارہائے نمایاں میں سے ایک ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء تھا ۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خاں انگلستان آئے۔ اور یہاں سے واپس جا کر ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ بقول مولانا حالی، سرسید نے اس پرچے کو نکالنے کا ارادہ انگلستان میں ہی کرلیا تھا۔ کیوں کہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو لوح چھپتی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے ہی بنوا کر لائے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ''تہذیب الاخلاق'' کی لوح ہی نہیں اس کے متن کا تصور بھی انگلستان سے ہی لائے تھے۔ غالباً انہیں کسی انگریز دوست نے رچرڈ اسٹیل اور جوزف ایڈیسن کے علمی اور ادبی اخبارات The Tatler اور The Spectator کے ان کارہائے نمایاں سے آشنا کیا۔ جو انہوں نے اٹھارھویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کی عادات، رسوم و رواج اور قومی خیالات کو بدلنے میں سرانجام دیئے۔ تہذیب الاخلاق نے انہی خطوط پر عمل کرتے ہوئے ہی خدمات انجام دیں تھیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا شمارہ یکم شوال ۲۴/ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس کے دو نام تھے۔ اردو میں ''تہذیب الاخلاق'' اور انگریزی میں ''دی محمڈن ریفامر''۔ تاہم یہ اخبار مکمل طور پر اردو ہی میں ہوتا تھا۔ اخبار ۸ یا ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر صفحے پر دو کالم ہوتے تھے اور پورا اخبار نسخ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے موٹے کاغذ پر چھپتا تھا۔ اس اخبار کے اجراء کا مقصد مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور برکتوں سے روشناس کروانا تھا تا کہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی پسند قوم بن سکیں۔ بالفاظ دیگر اس اخبار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانان ہند کے خیالات کی اصلاح ہو۔ اور دوسری اقوام کی طرح وہ بھی حرکت میں آئیں۔ اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوں۔ ابتداء میں اس کی سخت مخالفت ہوئی جو کہ غیر متوقع نہ تھی۔ حقیقت میں جماعتیں اور قومیں عظمت کے دور گزرنے کے بعد جمود میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ جسے توڑنا سہل نہیں ہوتا۔ تہذیب الاخلاق کی زندگی کے تین ادوار ہیں۔ جن میں تھوڑا وقفہ ہے۔ پہلا دور دسمبر ۱۸۷۰ء سے اکتوبر ۱۸۷۵ء تک دوسرا دور مئی ۱۸۷۹ء سے دو برس پانچ ماہ تک۔ اور تیسرا دور اپریل ۱۸۹۴ء سے تین برس جاری رہا۔ مجموعی طور پر یہ اخبار چھ سال سات ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران اس اخبار میں ۲۲۶ مضامین چھپے۔ جن میں ۱۱۲ سرسید احمد خاں کے تحریر کردہ تھے۔ دوسرے مضمون نگاروں میں محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی اور سید محمود کے نام نمایاں تھے۔ ''تہذیب الاخلاق''

www.urduchannel.in

نے ذہن وفکر کی بنیادی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔اس اخبار کی مدد سے انگریزی تعلیم کے حق میں رائے عامہ ہموار ہوئی۔علی گڑھ اور دوسرے متعدد مقامات پر علمی مدارس قائم ہوئے۔عوام الناس نے محسوس کیا کہ انگریزی زبان سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضروری ہے ساتھ ہی اردو شاعری اور نثر میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔سادہ اور سلیس زبان میں مضامین لکھے جانے لگے۔بہر حال سرسید احمد خاں اپنی قوم کے لیے ایک دردمند دل رکھتے تھے۔قوم کی تربیت اور اس کی ترقی کا انہیں بہت احساس تھا۔علی گڑھ کالج ان کے خلوص اور قومی درد کی یادگار ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی برتری کا احساس پیدا کیا۔اس طرح احساس کمتری جو مسلم قوم میں جڑ پکڑتا جارہا تھا سرسید احمد خاں نے اس کا ازالہ کیا اور یہ قوم تعلیم کی طرف متوجہ ہوئی۔پھر اس کالج سے بڑے بڑے اسکالرز نکلے جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا اور مادر وطن کی تعمیر میں ان باعلم مردان خدا نے یادگار خدمات سرانجام دیں۔اس لیے ہمیں اس معمار قوم کی خدمات کو آئندہ نسل کو بتاتے ہوئے اسے دعا دینی چاہیے۔

○

www.urduchannel.in

ابراھیم افسر

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں سرسید اور علی گڑھ کی معنویت

(سالانہ خطبہ کانووکیشن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰؍فروری ۱۹۴۹ء کے تناظر میں)

اُردو ادب کے اگر کسی طالب علم سے اُردو کے بڑے مفکرین، تحریکی یا اصلاحی رہنماؤں کی فہرست بنانے کے لیے کہا جائے تو بلا شبہ وہ سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) سر محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) کا ہی نام ان کے ذہن میں سرِ فہرست گردش کرے گا۔ ان تینوں مصلحین و مفکرین حضرات نے اپنے زورِ قلم سے نہ صرف اُردو ادب کو فروغ دیا بلکہ اپنے نظریات و خیالات سے غفلت میں ڈوبی ہوئی مسلم قوم کو بیدار کرنے کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی لازمی ہے کہ ''سرسید احمد خاں کے بعد تعلیمی اور سیاسی محاذ پر اگر کسی نے ان کی پیروی یا تتبع کیا تو ان میں ایک نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ مولانا آزاد نے سرسید کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے میں اپنی زندگی کو وقف کیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے بھی اپنا فرض نبھاتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کو سچی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے، مرکزی لائبریری کا نام بھی ''مولانا آزاد لائبریری'' رکھا۔ اس لائبریری کا سنگِ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۲؍نومبر ۱۹۵۶ء کو رکھا تھا۔ اس کا باقاعدہ افتتاح پنڈت نہرو نے ہی ۶؍اکتوبر ۱۹۶۰ء میں کیا لیکن میرا مقصد یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات اور تفکرات کے بارے میں کوئی تعریف و توصیف کرنے کا نہیں بلکہ مولانا آزاد کے نظریات اور تفکرات میں سرسید احمد خاں اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی معنویت، اہمیت و افادیت کو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ۲۰؍فروری ۱۹۴۹ء کو دیے گئے کانووکیشن سالانہ خطبے کی روشنی میں، اجاگر اور واضح کرنا ہے۔ یہ خطبہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دورِ حاضر میں طلبا کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

www.urduchannel.in

یہاں یہ تحریر کردوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد سرسید احمد خاں کی وفات سے دس برس قبل اس دُنیا میں آئے۔ جب انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو سرسید احمد خاں اس دارفانی سے رخصت ہو چکے تھے۔لیکن ان کے لگائے ہوئے تعلیمی پودے (مدرستہ العلوم۔ایم اے او کالج،۲۴رمئی ۱۸۷۵ء) نے پورے ملک میں تعلیم کے میدان میں تناور درخت بن کر اپنی خاص پہچان بنالی تھی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کالج میں اُس وقت کے زیادہ تر امراونوابین کے صاحب زادوں کے علاوہ دور دراز سے تعلیمی شوق اور ذوق رکھنے والے طلبا بھی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ یہاں پر ہر طرح کی پڑھائی کا معقول انتظام تھا۔بہترنظم ونسق کے سبب اس ادارے کو۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی کا درجہ دیا گیا جو اس ادارے کی مقبولیت میں ایک میل کا پتھر ثابت ہوا۔آج یہ ادارہ ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک میں بھی اعلا تعلیمات کی وجہ سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔مولانا آزاد نے اپنے صدارتی خطبے میں افلاطون کے اس تاریخی واقعے کی جانب طلبا کی توجہ مبذول کرائی جس میں اس نے اپنی درس گاہ کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لکھ رکھا تھا کہ ''جو شخص جیامیٹری نہیں جانتا،اس کے لیے یہاں جگہ نہیں ہے''۔انھوں نے طلبا سے یہ کہا کہ اس عظیم ادارے کا کتبہ یہ ہونا چاہیے کہ ''جو لوگ جیامیٹری جانتے ہیں،اور جو نہیں جانتے،سب کے لیے یہاں جگہ موجود ہے''۔یہ تھے مولانا ابوالکلام زاد کے آفاقی خیالات۔انھیں نظریات نے انھیں طلبا میں معروف ومقبول بنایا۔

مولانا آزاد ابتدا میں سرسید احمد خاں کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔خاص کر سرسید احمد خاں کے مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کے مشورے پر انھوں نے سخت نکتہ چینی کی۔سرسید احمد خاں کے سیاسی نظریات پر انھوں نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں خوب لکھا۔اس بات کا خلاصہ انھوں نے تب کیا جب انھیں ۲۰رفروری ۱۹۴۹ء کو بہ حیثیت مرکزی وزیر تعلیم سالانہ کانووکیشن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔اس خطبے میں انھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے خاص طور پر مسلمانوں کے سیاسی شعور اور دورِ حاضر کے حالات کا بہ خوبی اور سنجیدگی اور متانت سے جائزہ لیا اور علی گڑھ سے اپنے روحانی رشتے کو یاد کیا۔اس خطبے میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کیسے سرسید احمد خاں اور مسلم قوم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوگئی تھیں۔یہ خطبہ دراصل ماضی،حال اور مستقبل کی یادوں کا آئینہ تھا۔انھوں نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''آپ کے وائس چانسلر صاحب نے جب یونی ورسٹی کی جانب سے ازراہِ عنایت مجھے دعوت دی کہ اس سالانہ تقریب میں شریک ہوں اور مجلس سے خطاب کروں،قدرتی طور پر میرے ذہن میں بعض گزرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔مجھے بے اختیار یاد آ گیا کہ آج

www.urduchannel.in

سے ۳۶ ربرس پہلے میرا سابقہ علی گڑھ سے کن حالات میں ہوا تھا اور اس
نے علی گڑھ کے اندر اور علی گڑھ سے باہر کیا اثرات ونتائج پیدا کیے تھے؟

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلمان بہ حیثیت جماعت کے ملک کی تمام سیاسی سرگرمیوں سے صرف الگ ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی بیداری کے مطالبہ کے مخالف تھے۔انڈین نیشنل کانگریس ۲۷ ربرس سے ملک میں قائم تھی اور اپنی زندگی کی تمام ابتدائی منزلوں سے گزر چکی تھی،مگر خال خال افراد کے سوا مسلمانوں کا اس میں حصہ نہ تھا۔آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام قائم ہو چکا تھا لیکن وہ بھی اس لیے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سیاسی سرگرمی پیدا کرے بلکہ اس لیے کہ سیاسی سرگرمیوں سے انھیں بعض رکھے۔اُس دور کے مسلمانوں کی سیاست محض ایک منفی سیاست تھی جو ہر مثبت اثر سے اپنے آپ کو بچانا چاہتی تھی،اور جس کے صحیح تعبیر سیاست کے عدم یا سیاست کے تعطل ہی سے کی جاسکتی ہے۔یہی سیاسی تعطل تھا،جسے اُس وقت کی بول چال میں ''مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

> مسلمانوں کے اس سیاسی تعطل کے لیے اگر چہ مختلف اسباب جمع ہو گئے تھے لیکن اس کی سب سے بڑی ذمہ داری مرحوم سرسید احمد خاں کی سیاسی رہ نمائی پر تھی، جو اس تعلیمی ادارے کے بانیِ اوّل تھے۔انھوں نے ۱۸۸۶ء میں مسلمانانِ ہند کو نہ صرف کانگریس سے علاحدہ رہنے کا مشورہ دیا، بلکہ سیاسی حقوق کے تمام مطالبوں کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔
>
> ۱۹۱۲ء میں جب میں نے الہلال جاری کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی دعوت دی،تو میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ سرسید مرحوم کی اس سیاسی رہ نمائی پر بلا رُو رعایت نکتہ چینی کروں،اور جو لوگ اُس رہنمائی کے علم بردار تھے،اُن سے تصادم میں آؤں۔اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی گڑھ کے حلقہ میں مجھے سرسید مرحوم اور ان کے پیروؤں کا مخالف تصور کیا گیا اور خیال کیا گیا کہ میں نہ صرف یہاں کے سیاسی رہنمائی کا مخالف ہوں بلکہ سرے سے مخالف اس تعلیمی ادارہ کا ہوں۔میں نے یہاں ''مخالف'' کا لفظ استعمال کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جو لفظ میرے لیے یہاں زیادہ موزوں سمجھا

www.urduchannel.in

گیا تھا، وہ ''مخالف'' نہیں تھا ''دشمن'' تھا!۱

مولانا ابوالکلام آزاد کو بھلے ہی سرسید کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہ تھا لیکن سرسید کے تعلیمی تفکرات سے انھیں والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ اس وجہ سے مولانا آزاد کو اس یونی ورسٹی کے طالب علموں میں ہندوستان کا روشن مستقبل نظر آتا تھا۔ ہندوستان کی آزادی میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے کردار کو انھوں نے بہ خوبی اپنی تحریروں اور تقریروں میں واضح کیا۔ ساتھ ہی وہ سرسید کی تصنیفات وتخلیقات سے فیضیاب بھی ہوئے (مولانا آزاد کو ہمیشہ یہ کسک رہی کہ انھیں سرسید سے ملنے کا موقع نہ ملا) اور ان کی تخلیقات کا اثر ان کی ذاتی زندگی پر ہوا۔ مذہبی معاملات میں مولانا آزاد سرسید سے بے حد متاثر تھے۔ وہ سرسید کو اپنا مذہبی رہنما تسلیم کرتے تھے۔ اس بات کا اکثر انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ مولانا آزاد، سرسید کی نثر کے بھی دل دادہ تھے۔ خاص کر ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے والے مضامین نے ان کی نثری آبیاری میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لیکن بعد میں مولانا آزاد نے سرسید کے اسلوب سے جدا اپنی نئی راہ نکالی اور ایک ایسے طرز تحریر سے اُردو دنیا کو روبرو کرایا جس کے موجد کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔

مولانا آزاد اور سرسید کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مصلحین میں تعلیمِ نسواں کے معاملے میں بھی اختلاف رہا ہے۔ سرسید کی اس معاملے میں یہ رائے تھی کہ اگر گھر کے مرد حضرات پڑھ لکھ جائیں گے تو گھر کی عورتیں خود بہ خود تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ لیکن مولانا آزاد کا موقف اس کے برعکس تھا۔ وہ تعلیمِ نسواں کے زبردست حمایتی تھے۔ ان کے نزدیک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں امتیاز رکھنا ایک گناہ تھا۔ یہی وجہ ہے ملک کے پہلے وزیر تعلیم بننے کے بعد انھوں نے ہندوستان کی تعلیمی پالیسی بناتے وقت اس موقف کو مدنظر رکھا اور ''تعلیم سب کے لیے'' پر خاص توجہ دی۔

مولانا آزاد، سرسید کے بنائے ہوئے کالج سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ مولانا، علی گڑھ کالج کے حمایتی نہیں ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مولانا آزاد کے سرسید سے سیاسی اختلاف تو جگ ظاہر تھے لیکن وہ اس عظیم ادارے کی معنویت، عظمت کے معترف تھے۔ اپنے کانووکیشن کے خطبے میں طلبا اور اساتذہ کے سامنے انھوں نے اس امر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اپنے جذبات اور احساسات کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ سرسید ان کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی رہنما تھے۔ انیسویں صدی کے اس عظیم مصلح کی عزت اور عظمت مولانا آزاد کی نگاہ میں کیا تھی، اس اقتباس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''میں سرسید مرحوم کا مخالف نہ تھا۔ میں ان کے مداحوں میں تھا مگر یہ مداحی
> مجھے اس سے باز نہیں رکھتی تھی کہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان کی کوتاہیوں

www.urduchannel.in

اور غلطیوں کا بھی اعتراف کروں۔آج بھی جب کہ ۳۶/برس کی مدت اُس دور پر گزر چکی ہے اور اس عرصہ کی پوری داستان ہمارے قبضہ سے نکل کر تاریخ کے قبضے میں داخل ہو چکی ہے، میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کوئی رائے بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کی تبدیلی کا خواہش مند ہوں۔ میرے سامنے بہ یک وقت دونوں باتیں آ رہی ہیں اور مجھے بہ یک وقت ان دونوں کو تسلیم کر لینے میں کوئی دُشواری محسوس نہیں ہوتی۔ میں سرسید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے اور انھوں نے ملک کے لیے شان دار اصلاحی اور تعلیمی خدمتیں انجام دیں۔ چھتیس برس پہلے میں نے ان کی سیاسی رہنمائی سے اختلاف کیا تھا۔آج میں یہاں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ان کی شان دار اصلاح خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔''[۲]

مولانا آزاد، ہندوستان کے ان نام نہاد مفکرین سے بے حد خفا تھے جو سرسید کی سماجی اصلاحات کے مقابلے میں راجا رام موہن رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ راجا رام موہن رائے نے جو کام اور کارنامے بنگال کی سرزمین میں انجام دیے اس سے بھی بڑھ کر کام سرسید نے شمالی ہند میں عملی شکل عطا کی۔ جہاں راجا رام موہن رائے کا کام صرف اور صرف مذہبی اصلاح کے ساتھ جدید تعلیم تھا وہیں سرسید نے تعلیم اور مذہب دونوں کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور اپنے خوابوں کو مدرسۃ العلوم کی شکل میں شرمندۂ تعبیر بھی کیا۔ جس کے اثرات ہمیں آج ہندستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن افسوس! جو مشن سرسید احمد خاں نے اپنی قوم اور ملک کی فلاح و بہبود اور اصلاح کے لیے شروع کیا تھا، آج بدلتے ہوئے حالات میں ماند پڑ گیا ہے۔ سیاست نے اس ادارے کو ہندو مسلم فرقہ واریت کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ ملک کی آزادی میں اس ادارے کی قربانیوں کو فراموش کرنا سچائی سے منھ موڑنے کے مترادف ہوگا۔ اس مسئلہ پر مولانا آزاد کی باریک بینی اور دور بینی کی داد دینا ہوگی کہ کیسے انھوں نے اس مسئلے کی گہرائیوں میں جا کر غوطہ زنی کی۔ سرسید احمد خاں نے نہ صرف اپنے کالج میں ہندو مسلم اتحاد کا درس دیا تھا بل کہ اپنے ہندو دوستوں کو انھوں نے کالج میں بلا کر تقاریر بھی کرائیں۔ ان میں ایک بڑا نام ہندوستان کے قدآور قومی رہنما سریندر ناتھ بنرجی کا ہے۔ سریندر ناتھ بنرجی کو جب انگریز حکومت نے زبردستی جیل خانے میں ڈال دیا تھا تو ان کی

www.urduchannel.in

ضمانت کا انتظام وانصرام سرسید احمد خاں نے ہی کیا تھا۔ یہاں تک کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد طلبا کے سامنے علی گڑھ کالج میں سریندر ناتھ بنرجی کا نہ صرف خیر مقدم کیا گیا بلکہ ایک جلسے کا انعقاد بھی کیا گیا۔ ان کے بنائے ہوئے کالج کے دروازے سبھی کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو جسم کی دو خوب صورت آنکھوں سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن کچھ شر پسند عناصر نے سرسید کے نظریات کو ہندو قوم کے خلاف قرار دیا۔ لیکن مولانا آزاد نے سرسید کے اس اہم نکات یعنی قومی یک جہتی کی تشریح کو نئے تناظر میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ سرسید ہندو اور مسلم قوم کے باہمی اتحاد و اتفاق کے مفاد میں تھے اور ملک کی ترقی کے لیے دونوں قوموں کو ایک اسٹیج پر آنا ہوگا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دونوں قوموں میں جب بھی انتشار اور نا اتفاقی کا بول بالا رہا تب تب دوسرے لوگ ہم پر حاوی ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطبے میں ان تمام باتوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا:

> ''یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگر چہ سرسید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جس سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یک جہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوب صورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادر ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔
>
> ہندوستانی قومیت کے متعلق ان کا جو خیال تھا، اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ ''ہندو'' لفظ کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا؟ لاہور کی ایک ہندو انجمن کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا'' مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہندو کے معنی بہت محدود کر دیے۔ آپ نے اس کا اطلاق ایک خاص مذہبی گروہ پر کیا ہے مگر میری رائے میں یہ اطلاق صحیح نہیں ہے۔ میں اُن تمام لوگوں کو جو ہندوستان کے باشندے ہیں، ہندو تصور کرتا ہوں۔ خواہ کسی نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہایت خوشی

www.urduchannel.in

اورفخر کے ساتھ اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہوں۔''[۳]

یہاں یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ جب یہ عظیم ادارہ قائم کیا گیا تو اس میں مسلم طلبا کے ساتھ ساتھ ہندو طلبا کی بھی اچھی خاصی تعداد کا اندراج تھا۔ ساتھ ہی ہندو پروفیسران حضرات کے اسما بھی تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ اس بات کا مسلم ثبوت ہے کہ اس ادارے سے ملک کے تمام طبقات فیض یاب ہو رہے تھے اور موجودہ دور میں بھی ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں طلبا اور اساتذہ کے سامنے اُردو رسم الخط کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا۔ کیوں کہ اُس وقت ہندوستان سے اُردو کو باہر کرنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ انھوں نے اس معاملے میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے کردار کی بھرپور تعریف وستائش کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی بات کو مزید تقویت اور مدلل بناتے ہوئے کہا کہ'' آج دور آ گیا ہے کہ ہندو اُردو سیکھیں اور مسلمان ہندی زبان سے گہری واقفیت حاصل کریں۔'' انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ موجودہ دور میں ملک کے بیش تر حصوں سے بہت سارے رسائل وجرائد ہندی اور اُردو زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد گاندھی جی کے اس نظریے کے بھی حامی تھے کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان'' ہندوستانی'' ہو۔ مولانا آزاد کے مطابق یہ'' قومی زبان'' ہندوستانی لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرے گی۔ اس ضمن میں انھیں علی گڑھ کے طلبا اور نوجوانوں سے بہت امیدیں تھیں۔ کیوں کہ یہ طلبا ملک کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خطبے کا آخری حصہ جو کہ یونی ورسٹی کے طلبا کے نام موسوم ہے بڑا ہی ولولہ خیز اور انقلابی ہے۔ وہ ایسے نوجوانوں سے خطاب کر رہے تھے جنھوں نے اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا۔ مولانا کے مطابق ایسے طالب علموں پر دُہری ذمہ داری تھی۔ ایک تو یہ کہ جب وہ اس عظیم درس گاہ میں داخل ہوئے تھے تو ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم تھا اور آج جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو رہے ہیں تو ملک آزاد ہو چکا ہے۔ پہلے ان طلبا کے سامنے ملک کو آزاد کرانے کا مشن تھا، ان کی فکر بھی محدود تھی۔ لیکن ملک کے آزاد ہونے کے بعد اب ان کے سامنے ملک کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے کا مشن اور ہدف ہے۔ طلبا کا یہی کردار ہندوستانی عوام کی زندگیوں میں مثبت نتائج کا ضامن ہے۔ وہ اپنے خطبے کے ذریعے طلبا اور نوجوانوں سے ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں ان کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی طلبا کو اس بات کی بھی یقین دہانی کرا رہے تھے کہ اگر تم اپنے اندر قابلیت رکھتے ہو تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ تمھارے سامنے ترقی اور کامیابی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور روشن مستقبل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ مولانا آزاد کے ولولہ انگیز خطبے کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کے باشندے ہو، جس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقے

www.urduchannel.in

کے مطابق نشو ونما دے گی۔ایک مذہبی جمہوری نظام حکومت کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی ترقیوں کے موقع پیدا کر دیتی ہے۔اس میں مذہب،نسل،ذات اور فرقہ کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہو کہ تمھارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھُل جائیں۔سیاست،انتظام حکومت،تجارت،صنعت و حرفت،مختلف قسم کے پیشے،کوئی دروازہ ایسا نہ ہو جو تم پر بند ہو،میں تمہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ یقین دلاؤں گا کہ آج کوئی دروازہ بھی تم پر بند نہیں ہے۔ملک کی زندگی کا ہر دروازہ کھُلا ہے۔بہ شرط یہ کہ تم قابلیت کی پختگی،محنت کی سرگرمی،اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ قدم بڑھا سکو۔کل تک ہمارا تعلیمی نصب العین بہت پست اور محدود تھا۔اس یونی ورسٹی کے سند یافتہ اپنی اُمیدوں کا اس سے زیادہ بلند ہدف نہیں رکھتے تھے کہ کوئی بڑی یا چھوٹی سرکاری ملازمت حاصل ہو جائے۔لیکن اب ضروری ہے کہ قومی آزادی کی فضا تمہاری ہمتوں کو زیادہ اولوالعزم،اور تمہارے ولولوں کو زیادہ وسیع کر دے۔تمھیں اب پُرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈھنا ہے۔تمہاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہو گئیں اور تمہاری جولانیوں کے لیے اب پُرانے میدان تنگ ہو گئے۔تم نے سعی وعمل کے جو پُرانے پیمانے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے،وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔تمہیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔تمہیں نئے بٹوں سے سعی وعمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔تمھیں اب زندگی کی جدوجہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اُٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درسگاہ سے حاصل کی ہے ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمہارے ملک کی نئی رفعت

www.urduchannel.in

طلبیوں کا ساتھ دے سکیں۔ میرا دماغ اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ اگر تم نے وقت کی ترقی پسند قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کر لی جو تمہاری غیر مذہبی جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے، تو تمہارے وطن کی کوئی بلندی بھی ایسی نہیں ہوگی جہاں تک تمہارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہیں ہوگی جو تمہارا استقبال نہ کرے۔''[۴]

مولانا ابوالکلام کے دیے ہوئے اس خطبے کو ۶۸ سال مکمل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی معنویت، افادیت واہمیت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس خطبے کو ہر وہ طالب علم پڑھے جو مسلم یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ خطبہ صرف ایک تقریر نہیں ہے بلکہ یہ طلبا کے سامنے سرسید احمد خاں کے مشن کی عکاسی ہے۔ یہ خطبہ مولانا آزاد کی زبانی نثر کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ اس خطبے سے ہمیں سرسید احمد خاں کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے جاننے کا موقع ملتا ہے جو جہانِ سرسید میں معاون ثابت ہوگا۔

حواشی:

(۱) مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۰۰ تا ۳۰۱)

(۲) مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت ۲۰۰۲، ص: ۳۰۲)

(۳) مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت ۲۰۰۲، ص: ۳۰۴)

(۴) مولانا آزاد، سر سید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت ۲۰۰۲ء، ص: ۳۱۱ تا ۳۱۲)

○

www.urduchannel.in

عباس رضا*

سرسید اور قوم کا دردنہاں

کائنات میں انسانوں کو ایک دوسرے سے اپنی حاجات بیان کرنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں یا تو وہ تحریر کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرے یا تقریر کے توسط سے اپنی بات کہے۔لیکن ان دونوں ذرائع ابلاغ میں زمانی اعتبار سے تقریر کو تقدم حاصل ہے اور خطابت ہی دنیا کا سب سے قدیم ذریعۂ ابلاغ ہے۔ کیوں کہ لکھنے کا فن بہت بعد میں ایجاد ہوا ہے۔ چنانچہ ہر خطۂ ارض کے باشندوں کو حالات سے باخبر کرنے کے لیے ان کے پیشواؤں اور رہنماؤں کو تقریر و خطابت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اب اگر قوم و قبیلہ کے درمیان تنازع و اختلاف کی صورت پیش آجائے تو اس سے نپٹنے کے لیے افراد قبیلہ کو خطاب کے ذریعہ ہی جنگ یا صلح پر آمادہ کیا جاتا تھا یا مذہبی پیشواؤں مثلاً انبیاء و مرسلین کو بنی نوع انسان کو صراط مستقیم پر لانے اور ان کو رشد و ہدایت کی تلقین کرنے کے لیے خطابت ہی ذریعہ بنتی تھی۔غرض قرآن مجید سے لے کر دیگر آسمانی کتابوں تک میں خطابت کا لہجہ جا بجا ملتا ہے اور ان پیشواؤں نے قوموں سے خطاب کر کے خطبات پیش کیے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جن کے درمیان یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں، ان میں اکثر افراد تعلیم سے بیگانہ تھے، جنہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا صرف چند افراد ہی پڑھ لکھ سکتے تھے۔اسی لیے لازماً ان انبیاء و مرسلین اور پیشواؤں کو اپنا پیغام پہنچانے، ان کے عقائد کی اصلاح اور فرائض سے آشنا کرنے کے لیے زبانی گفتگو اور خطابت کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

اسی لیے بعد کے دور کے علما نے ''العلماء ورثة الانبیاء'' کے منصب وراثت کے حصول کے بعد اپنے اسلاف کی سیرت پر عمل پیرا ہو کے جب قوم و ملت کی باگ ڈور سنبھالی تو لازمی طور پر ان سے خطاب ناگزیر تھا۔ چنانچہ شاگردوں سے ان کے اساتذہ نے خطاب کیا اور یونیورسٹیوں نے اس کام کے لیے خصوصی انتظامات کرائے۔ مجاہدین آزادی نے جنگ آزادی سے قبل و بعد عوام الناس کو بیدار کرنے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے نیز ان کے دلوں

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

میں امنگ وحوصلہ پیدا کرنے کے لیے شعلہ آور تقریریں کیں۔قوم وملت کی اصلاح ودرستگی کے لیے علماء کرام نے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیا اور آج بھی کسی نہ کسی صوت میں خطبات کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

سردست سرسید احمد خاں کے خطبات سے ان کی قومی ترقی کی چاہت اور ملی ہمدردی سے متعلق ان کے افکار و تعلیمات اور نظریات کی شعاؤں کو چھان کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا مقصود ہے تاکہ خنکی چشم کے ساتھ قلب وجگر کو تابنا کی اور فرحت مل سکے۔یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسان کا ہر شعبۂ حیات میں کس حد تک تعلیمات واخلاقیات سے مزین ہونا ضروری ہے۔کائنات کے سب سے عظیم انسان کو جب بصورت پیغمبر معلم بنا کر مبعوث کیا گیا تو خلق عظیم کی سند لے کر آیا اور اس نے جب اپنا ہدف نہائی لوگوں سے بیان کیا تو وہ مکارم اخلاق کی تکمیل واتمام کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیۂ نفس ہی تھا۔چنانچہ اسی روشن پیغمبرانہ پرگام زنی کرتے ہوئے مصلح امت، ہمدرد قوم، سفینۂ تعلیم وتربیت کے ناخدا سرسید احمد خاں نے جب ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کا بیڑہ اٹھایا تو لوگوں کے سامنے ہمت افزا تقریریں کیں اور ولولہ انگیز خطبات پیش کیے۔جو ہر دور کے بے سہارا افراد اور مظلوموں کا سہارا بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہر ناامید نجات کے لیے امید کن کرن ہیں جن کے ہر ہر جملے میں سامان عبرت ہے۔چنانچہ واقعۂ غدر کو یاد کر کے سرسید کہتے ہیں۔''الٰہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔الٰہی! ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔اگر چہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کو ایک دن بے شک آنے والا ہے۔''[۱]

نومبر ۱۸۵۸ء میں دیے گئے اس خطبہ کے چار سال بعد ۱۸۶۲ء میں قوم پر پڑنے والی اس ناگہانی اور خطرناک آفت (فتنہ) کی وجہ تلاش کرتے ہوئے دو چیزوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ''۱-قوم میں تعلیم وتربیت نہیں تھی۔۲-انگریزوں سے جن کو خدا نے ہم پر مسلم کیا ہے، (ہمارا) میل جول اور اتحاد نہ تھا اور باہمی ان دونوں میں مذہبی اور رسمی منافرت، بلکہ مثل آب زیر کاہ عداوت کا ہونا تھا۔''[۲]

اس لیے آئندہ کسی بھی طرح کی مصیبت سے بچاؤ اور حفاظت کی خاطر مذکورہ بالا خامیوں کو دور کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد سرسید نے جو خطبہ پیش کیا ہے اس میں براہ راست تعلیم وتربیت، اخلاق وتہذیب اور ترقی کے عوامل کی جانب متوجہ کرایا ہے۔ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت اہم تھا اور قوم کی ترقی کا انحصار بھی وہ تعلیم و تربیت میں ہی سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آج وہی قوم ترقی یافتہ کہلاتی ہے جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعلیم کا بول بالا ہے۔سرسید کے دل میں اپنی قوم کی ترقی کا درد بے چین رکھتا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ صدیوں کا کام

www.urduchannel.in

لمحوں میں کیسے بھی انجام پا جائے تو بہتر ہے تا کہ جیتے جی لوگوں کو مسکراتا دیکھ کر سکون حاصل کر سکوں۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا کہ اس دور کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ مسلمانوں کی موجودہ معاشرت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اگر چہ قدیم علوم وفنون میں تھوڑی بہت دسترس رکھتے ہیں لیکن علوم جدیدہ اور فنون موجودہ سے قطعاً عاری ہیں اور آج کل یہی جدید علوم اور مفید فنون ترقی کرنے اور مہذب ہونے کا ذریعہ ہیں۔''[۳]

مرور زمانہ کے ساتھ جب سرسید کی تقریروں کا اثر لوگوں پر نمایاں ہونے لگا اور قوم ترقی کی راہ پر چل پڑی۔ تعلیم و تربیت سے لوگوں کے اندر بدلاؤ کی کیفیت محسوس ہونے لگی تو سرسید نے ایک موقع پر شاد و مسرور ہو کر اپنے دلی جذبات کا اظہار اس طرح کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''ہماری یہ خواہش نہیں ہے کہ ہمارا چال چلن ذرا بھی بدل جاوے بلکہ بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ بدستور قائم رہے۔''[۴]

کیوں کہ وہ تعلیم کس کام کی جو صرف وقتی فائدہ پہنچائے اور مستقبل کی کوئی ضمانت نہ لے۔ اصل تعلیم تو وہ ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر تمام بیماریوں کا علاج، تاریکیوں کا خاتمہ، نقصانات سے بچاؤ، خطرات سے باخبر اور روشنی کا انتظام کر سکے اور تمام مقام لغزش میں پاؤں کو ثبات عطا کر سکے۔ دل و دماغ میں قوت، ارادہ میں مضبوطی، اخلاق میں ترقی، فیصلے میں استحکام، جواں مردی، مروت، سخاوت، شجاعت، حلم و بردبادی، قناعت، توکل اور عزت نفس میں اضافہ کا سبب ہو۔ ورنہ لاعلمی ایسی بلا ہے جس سے نجات حاصل کرنا جوئے شیر لانے کی مانند ہے۔ بلکہ بے علمی مفلسی کی ماں ہے، جس قوم وقبیلہ میں علم و ہنر کی دولت نہیں ہوتی وہاں مفلسی اپنا گھر بنا لیتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرائم کے سرزد ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر قوم علوم وفنون سے واقف ہو جائے تو اس کے لیے اس قدر دولت اور خزانے منتظر ہیں کہ پشتوں تک بھی صرف کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ بے علمی نے ہمارے پیروں میں بیڑیاں جکڑ دی ہیں جس سے ترقی کی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ پانا دشوار ہے۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں ہے اس سے احتیاج اور زبوں حالی زیادہ ہوگی۔ ہمیں ان موانع کو دور کرنا ہوگا، اندھیرے کو صرف کوستے رہنا درست نہیں ہے۔ اس لیے علم کا چراغ روشن کرنا ہوگا۔ سرسید کے اس قول سے مذکورہ امر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ

www.urduchannel.in

کر دیا ہے کہ قومی ترقی، قومی تعلیم وتربیت پر منحصر ہے۔ پس اگر ہم اپنی قوم
کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے پر کوشش کریں۔
مگر افسوس یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس زمانے میں علم کیا چیز ہے
جس سے قومی ترقی ہوتی ہے۔''[۵]

سرسید کا دل قوم کی زبوں حالی پر اس قدر تڑپ رہا تھا کہ ان کی زبان سے نکلنے والا ہر جملہ درد سے بھرا ہوتا تھا اور وہ قوم کو جگا جگا کے اپنی تڑپ دکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات قوموں سے خطاب کے دوران وہ بعض کھری کھوٹی باتیں بھی سنا دیتے تھے، جو صرف قوم کی ہمدردی اور قوم سے بے پناہ محبت کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ایک مقام پر وہ قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

''اے میرے پیارے ہم قومو! اگر میرے لفظ ناگوار گزرے ہوں تو معاف
کرو۔ میرا دل اپنی قوم کی حالت پر نہایت جلتا ہے۔ میں ان کو ایسی خراب
حالت میں دیکھ نہیں سکتا اور جو ٹھیک ٹھاک حال ہے وہ نہایت دلسوزی اور
ہمدردی اور دلی محبت سے سب کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس امید سے کہ ہماری
قوم جاگے اور ہشیار ہو اور اصلی عزت و دولت و حشمت میں پہنچے اور جس طرح
کہ اس دنیا کی اور معزز قومیں معزز ہیں اسی طرح ہماری قوم بھی معزز ہو۔''[۶]

قوم کی ترقی کے لیے سرسید دیوانگی کی حد تک بے چین تھے۔ وہ مسلمانوں کی دوسرے مسالک کے افراد کی مانند تعلیم وتربیت سے آراستہ، تہذیب یافتہ، معزز و مقدس، کھلی فضا میں آزاد زندگی گزارنے والا، باعزت، با اخلاق اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان سب کا واحد ذریعہ، علم سے آراستگی تھی۔ اسی لیے سرسید مدرسۃ العلوم کے قیام اور دینی وقومی درسگاہ کی تعمیر و تنظیم کے لیے سرگرداں اور مصروف تھے۔ ان کا نصب العین ایک علمی درسگاہ کا قیام تھا۔ خواہ وہ کسی کے ذریعہ بھی قائم ہوتی اور اس کام کا انجام دینے والا کوئی بھی ہوتا لیکن چوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس کام کے لیے کوئی آگے نہیں آ رہا ہے اور قوم روز بروز پستی کی جانب جہالت کے دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے تو خود ہی بڑھ کر اس کی باگ ڈور سنبھال لی اور چل پڑے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطانپوری)

www.urduchannel.in

آخر میں ان کے خطبہ کا ایک اقتباس پیش کر کے بات تمام کر رہا ہوں۔ سرسید اپنے ایک خطبہ میں قوم سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

''اے صاحبو! میں دن رات اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ خصوصاً مجھ سے آدمی کا۔ جس نے بہت بڑا حصہ اپنی زندگی کا طے کرلیا ہے اور اگر کچھ باقی ہے تو بہت قلیل باقی ہے۔ جب میرے کوچ کا وقت آن پہنچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھاوے گا اور کون شخص اس کام کو انجام تک پہنچاوے گا۔ اگر خدائے تعالیٰ کوئی ایسا شخص پیدا کردے کہ وہ میری زندگی ہی میں مجھ کو اس کام سے آزاد کردے اور تمام بوجھ اپنے اوپر اٹھالے تو مجھ کو تو اس سے زیادہ خوشی اور خورمی کا کوئی وقت نہیں ہونے کا۔ مگر جب تک میری زندگی ہے کہ مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی قوم کو کوئیں میں گرتا دیکھوں اور چپکا بیٹھا رہوں اور اپنی قوم کو مرتا پاؤں اور اس کے منھ میں پانی نہ چواؤں۔''[۷]

حواشی:

(۱) خطبات سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، جلد ا، ص:۴۳

(۲) ایضاً، ص:۵۰

(۳) ایضاً، ص:۷۰

(۴) ایضاً، ص:۱۱۴

(۵) ایضاً، ص:۲۱۵

(۶) ایضاً، ص:۱۰۵

(۷) ایضاً، ص:۲۸۰

www.urduchannel.in

سید محمد عقیل *

احیائے فکرسرسید: وقت کا اہم تقاضا

تاریخ ہندوستان اورخصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا باب اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک سرسید کی بےلوث مجاہدانہ قومی وملی خدمات کا خندہ پیشانی سے اعتراف نہ کرلیا جائے۔سرسید جیسی عبقری شخصیات کسی بھی قوم وملک کے لیے باعث افتخار ہوتی ہیں۔اگر چہ سرسید کے مذہبی عقائد متنازعہ فیہ رہے ہیں اوران تنازعات نے ان کا پیچھاپس مرگ بھی نہیں چھوڑا ہے۔کافر ومشرک گمراہ دین وغیرہ جیسے القابات سے انھیں ہمیشہ نوازا جاتا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ قوم کی جانب سے بدظن نہیں ہوئے بلکہ قوم کی بیچارگی اور ملت کی بےسروسامانی نے انھیں تادم آخر اپنی طرف متوجہ رکھا۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ سے پیدا شدہ حالات اور حالات کی زد میں آئی امت مسلمہ کے مصائب وآلام نے انھیں ہمیشہ مضطرب رکھا۔اگران کے مذہبی نظریات سے چشم پوشی کی جائے اورانھیں ان کی ذاتیات کا حصہ تصور کرکے احتراز برتا جائے تو یہ بات نوک سناں پر کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان سرسید کے بار احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

یہ امر روز روشن کی مانند ظاہر ہے کہ سرسید کی زیرسرپرستی قائم شدہ علی گڑھ تحریک کے اسباب وعلل اور اغراض و مقاصد کیا تھے؟ تحریکِ مذکورہ بالا کن حالات کی پیداوار تھی؟ ان حالات سے نمٹنے کی کتنی صلاحیت اس تحریک میں تھی؟ اور بالآخر اپنے اغراض ومقاصد کی حصولیابی میں کس حدتک کامیاب ہوئی؟ مذکورہ نکات پر خامہ فرسائی تحصیل حاصل کی مصداق ہوگی کیوں کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ادنیٰ سی واقفیت رکھنے والا شخص بھی ان امور سے بخوبی واقف ہے۔البتہ یہاں ان امور کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا جن کے سبب امت مسلمہ زوال وانحطاط کی شکار ہوکر علم وعمل کی برکتوں سے محروم ہوتی چلی گئی اور بالآخر عنانِ سلطنت پر گرفت کمزور سے کمزورتر ہوتی چلی گئی۔ یوں تو سرسید نے احیائے ملت کی خاطر سب سے پہلے ان اسباب کونشان زد کیا جن کی بنا پر نہ صرف قومِ مسلم بلکہ پورا ہندوستان

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

نعمتِ آزادی سے محروم ہوکر اسیرِ غلامی ہوگیا۔انھیں اسباب کی روشنی میں ان مشکلات کا حل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی جو پورے ملک کو درپیش تھیں۔اس پورے قضیہ کی تفہیم سے قبل ان نکات کا ذہن نشیں ہونا ازحد ضروری ہے جن کی وجہ سے وطنِ عزیز کا ہر فرد گرفتار بلا تھا۔اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے سرسید نے گذشتہ ایک صدی کا مطالعہ کیا اس اثناء میں جو حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ان کی اصلاح کے لیے کمربستہ ہوکر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ان کے مطالعہ میں جو باتیں نکل کر آئیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱-علم کی روشنی سے دور ہونا۔

۲-مسلمانوں کے سیاسی تدبر میں کمی واقع ہونا۔

۳-مذہب کے نام پر بیجا رسوم ورواجات میں مبتلا ہونا۔

۴-درپیش چیلنجوں،ان کی حقیقت،قوت اور وسعت سے متعلق مسلمانوں کے نادرست شعور،علم اور ادراک وفہم۔

۵-اپنے خوبصورت ماضی اور تاریخ سے عدم واقفیت۔

۶-اور سب سے بڑھ کر میدانِ عمل اور جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کرنا وغیرہ۔

مذکورہ بالا نکات کے علاوہ اور بھی کچھ باتیں ہوسکتی ہیں جن میں اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔سرسید نے اسی اصلاح کے پیش نظر مجاہدانہ جذبہ کے ساتھ پوری امت مسلمہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ نہ صرف قوم مسلم کی کامرانی بلکہ پورے ہندوستان کا روشن مستقبل علم وعمل کے حصول ونفاذ میں مضمر ہے۔سرسید کے تعلیمی نظریات کا اگر ایک جملہ میں ذکر کرنا ہو تو انھیں کا قول نقل کیا جاسکتا ہے جو ان کے مافی الضمیر کی بھرپور ادائیگی کرتا ہے،لکھتے ہیں کہ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے میں علومِ جدیدہ اور سر پر لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو''[۱] سرسید علم و آگہی کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے اس لیے علم کے فروغ میں انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ان کا نظریۂ تعلیم قدرے مختلف ہے جیسا کہ قول سابقہ سے ظاہر ہے کہ مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے حصول کو بھی یقینی بنایا جائے۔

سرسید نے اپنے متعینہ ہدف کے حصول کے لیے جو اقدامات کیے وہ نہ صرف قابلِ تحسین ہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہیں۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ جو ہندو مسلم کے باہمی اتحاد سے لڑی گئی تھی مگر ناکامی کی صورت میں اس کا خمیازہ صرف مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ایسے ناگفتہ بہ حالات میں جبکہ انگریزوں نے مسلمانوں کو غیر معتمد تصور کرلیا تھا اور اسی عدم اعتمادی کی وجہ سے مسلمانوں کو بے جا اذیتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔انگریز حکام کا خیال یہ تھا کہ بغاوت کی چنگاری کے ذمہ دار فقط مسلمان ہیں۔ہاں اس امر سے انکار کی کوئی صورت ممکن نہیں کہ جب انگریز مشنری پورے زور وشور سے

www.urduchannel.in

تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ تھی اور مغربی تعلیم کے توسط سے جبراً وقہراً مسخ شدہ عیسائیت کو ہندوستانی مذاہب پر لادنا چاہ رہی تھی۔ ایسے میں علمائے دین حق نے برسر اعلان اس کی مخالفت کی لیکن اس کام میں ان کے شانہ بہ شانہ ہندو و دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اپنی حصہ داری متعین کی۔ یہ بات مصدقہ ہے کہ بیشتر مقامات پر عنانِ قیادت مسلموں کے ہاتھ میں ہی رہی اس لیے بغاوت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کو ہی خصوصی طور پر بغاوت کا علمبردار مانتے ہوئے جرم بغاوت کی سزا کے طور پر اندوہناک صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس پوری صورتحال سے سرسید بھی بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں کے تئیں انگریزوں کے خیالات خام و نادرست ہیں اور ان کے خلاف ایک لفظ بھی بولنا یا لکھنا اپنی عاقبت خراب کرنے کے مترادف ہے تاہم انھوں نے بغاوت کی اصل وجوہ کا انکشاف کرنے اور بغاوت سے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بغاوت صرف مسلمانوں نے نہیں کی ہے اس لیے انھیں ظلم و تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ انھوں نے اس پوشیدہ امر سے بھی نقاب کشائی کی کہ بغاوت کے پس پشت کارفرما عوامل و محرکات خود انگریزوں کے پیدا شدہ حالات پر موقوف تھے۔ اسے سرسید کی جرأت و جواں مردی سے ہی تعبیر کیا جائے گا کہ انھوں نے اس کتاب کو نہ صرف لکھ کر بلکہ حکومتِ ہند کے علاوہ حکومتِ برطانیہ کے حضور پیش کر کے اپنی اعلیٰ ظرفی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا اور دونوں حکومتوں کو اسبابِ بغاوت کی بازیافت کے لیے مجبور کیا۔ ڈاکٹر مظفر حسین سید نے بجا فرمایا ہے:

> انھوں (سرسید) نے جس مہارت سے حالات کا جائزہ لیا اور مسلم قوم کے لیے جو گراں مایہ کوششیں کیں وہ صرف انھیں کا حصہ تھیں، وہ مسلمانوں کے لیے ایسا منظّم اور مہذب تعلیمی نظام تشکیل دینے کے خواہش مند تھے جو آنے والی ساری تبدیلیوں کے سارے اعلیٰ اوصاف کو اپنے اندر سمیٹ لے۔[۲]

مذکورہ اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید نظام تعلیم کے متعلق منفرد نظریہ رکھتے تھے۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے دو متبادل تھے ایک ہجرت اور دوسرا ملک میں رہتے ہوئے جدوجہد کرنا، بعض عجلت پسند اور حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے والوں نے ہجرت کو ترجیح دی اور مختلف بلاد اسلامیہ میں ہجرت کر کے قیام پذیر ہو گئے مگر بیشتر نے وطن عزیز میں قیام کو افضلیت دی اور جہد مسلسل میں مصروف ہو کر ایک نا معلوم مستقبل کی طرف گامزن ہو گئے۔ سرسید نے ایسے نازک وقت میں پیش قدمی کرتے ہوئے امت مسلمہ کی قیادت کی اور روشن مستقبل کا منصوبہ اپنی روشن فکر کی صورت میں قوم مسلم کے سامنے پیش کیا، جو آج بھی سرسید/علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ سرسید نے جب اپنے افکار و نظریات کو عملی جامہ

www.urduchannel.in

پہنانے کی جدوجہد شروع کی تو اس کے پس پشت چند توانا اسباب وعلل بھی موجود تھے جن کی بنا پر انھیں ایک تحریک ملی اور انھوں نے ایک مستحکم وخیر آور تحریک اور عظیم ادارے کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۵۷ء کے حالات اور اس سے ماقبل کی تاریخ جو مذکورہ محرک وفعال تحریک کے وجود کا سبب بنی اور سرسید کو ازسرنو دعوت فکر دی، کو ذہن نشین رکھتے ہوئے معاصر تعلیمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی وتہذیبی صورتحال کا جائزہ لیا جائے اور تقابل وموازنہ کے بعد اگر دونوں حالتوں میں یکسانیت کے عناصر موجود ہوں تو کیا یہ مناسب نہیں کہ عصر حاضر کے مسائل کا حل بھی فکر سرسید کی روشنی میں تلاشا جائے۔ اسرار عالم نے عصر حاضر کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت زار اور خصوصاً ان میں قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان کے حوالے سے قابل ذکر تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''ہندوستان میں مسلمانوں کی ''موجودہ قیادت'' درج ذیل احوال سے گزر رہی ہے۔''

۱۔ موجودہ قیادت قوۃً اور حقیقۃً بے بصیرت ہوچکی ہے۔
۲۔ موجودہ قیادت قوۃً اور حقیقۃً بدذہن ہوچکی ہے۔
۳۔ موجودہ قیادت قوۃً اور حقیقۃً ناتواں ہوچکی ہے۔
۴۔ موجودہ قیادت قوۃً اور حقیقۃً عاجز ہوچکی ہے۔
۵۔ موجودہ قیادت قوۃً اور حقیقۃً بے اثر ہوچکی ہے۔
۶۔ موجودہ قیادت اپنی عصمت کھوچکی ہے۔
۷۔ موجودہ قیادت مزاجاً اور عملاً طفیلی ہوچکی ہے۔
۸۔ موجودہ قیادت حقیقۃً ناقابل اعتماد ہوچکی ہے۔

ایسی صورتحال میں جب کہ مذکورہ اسباب سے امت مسلمہ 'جاں کنی' میں مبتلا ہوچکی ہے۔ اصلاح حال کی موثر تیر بہ ہدف اور کافی کوششیں اگر بروقت نہ کی گئیں تو عنقریب حادثاتِ فاجعات کا ظہور یقینی ہوجائے گا۔[۳]

موصوف کے پیش کردہ نکات شعبہ ہائے حیات کے صرف ایک شعبہ (قیادت) سے وابستہ ہیں۔ مسلمانوں کی صورتحال زندگی کے تمام شعبہ جات میں مذکورہ شعبہ سے قدرے مختلف نہیں ہے، خواہ سیاست ہو یا معیشت، معاشرت ہو یا ثقافت، تعلیم ہو یا تجارت، غرض یہ کہ ہر میدان میں مسلمانوں کی حصہ داری کا بحران ہے۔ اس بحران سے نکلنے کی واحد تجویز فکر سرسید کے فروغ واحیاء میں مضمر ہے۔ کیوں کہ سرسید نے جن اندوہناک حالات میں اپنی مخصوص حکمت

www.urduchannel.in

عملی سے ملکی وغیر ملکی حساس افراد اور خصوصاً وہ انگریز حکام جو مسلمانوں کو اپنا دشمن اول تصور کرتے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی سرپرستی حاصل کی بلکہ انھیں اعانت پر بھی مجبور کیا۔ اس لیے عصری تقاضوں کے پیش نظر مناسب ہے کی فکر سرسید کو عام کیا جائے اور مسلمان اگر خود کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو علم وعمل کے زیور سے خود کو آراستہ کریں اور مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے حصول میں بھی کوشاں رہیں۔ اس فکر کی گہرائی وگیرائی پر اگر بروقت غور وفکر ہوا ہوتا تو غالب امکان ہے کہ مسلمانوں کی صورتحال کا منظرنامہ آج تبدیل شدہ ہوتا۔ معاصر مسلم معاشرہ زوال وانحطاط پذیر اور مائل بہ پستی ہے اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ہم نے اپنے پیشروؤں کے نظریات وافکار سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر کے خود کو ایک مرکز تک محدود رکھا جس کے شرانگیز نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ اگر سرسید جیسی اولوالعزمی اور مجاہدانہ اوصاف سے متصف چند اور شخصیات ہمارے معاشرے میں ہوتیں تو عصر حاضر کا مسلمان نہ صرف تعلیمی بلکہ سیاسی، معاشی، معاشرتی غرض کہ ہر اعتبار سے خود کفیل اور مستحکم ہوتا۔ بہر کیف معاصر ملکی تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی عظمت وسرخروئی کا راز تعلیم وتربیت اور سیاست وقیادت میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے سرسید کے نظام فکر کو مشعل راہ تسلیم کرتے ہوئے اس سے روشنی حاصل کرنا ناگزیر ہے جو وقت کا اہم تقاضا بھی ہے۔

حواشی:

(۱) سرسید اور ان کے کارنامے، نورالحسن نقوی، ایم آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۲۰۰۰ء، ص:۱۷

(۲) سید والا گہر کی تحریک تعلیمی: ارتقائی جائزہ، ڈاکٹر مظفر حسین سید، مشمولہ تہذیب الاخلاق، ص:۲۲۱-۲۲۲

(۳) سرسید کی بصیرت، اسرار عالم، دارالعلم نئی دہلی ۲۰۱۳ء، ص:۱۸۹

www.urduchannel.in

نازمین*

سرسید کا خواب

انیسویں صدی کے دینی مکاتب کی صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے ہم مشرقی ممالک بالخصوص ہندوستان کے تناظر میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ یہاں علمی و تعلیمی ذوق وشوق اس سے پہلے کس منزل پر تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تہذیب وتمدن اور علم وفن کی روشنی مشرقی ممالک میں مغربی ملکوں سے صدیوں پہلے پھیل چکی تھی اور علوم وفنون کی تعلیم و تربیت کے دروازے کھل چکے تھے۔ قدیم ہندوستان میں پاٹلی پتر (پٹنہ)، تکشلا اور اجین وغیرہ میں عظیم علمی درس گاہیں موجود تھیں۔ یہاں سے غیر ملکی طلبا تک مستفید ہوتے تھے۔ بغداد، قاہرہ کی قدیم درس گاہوں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ اشوک اعظم اور راجہ وکرمادتیہ کے عہد میں چین، ایران اور عرب ممالک سے عالموں اور ماہرین فن کثرت سے ہندوستان میں آئے۔ اس سے قبل بھی یہ سلسلہ استوار تھا۔

پندرہویں صدی سے قبل مسلمان تعلیمی میدان میں دوسری قوموں سے بہت آگے تھے۔ انھوں نے اس قسم کے مدارس قائم کر لیے تھے کہ تمام دنیا کے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے مگر اس کے بعد مسلمانوں کی ترقی رک گئی۔ وہ تہذیب، ثقافت، رسم ورواج وغیرہ میں دوسری قوموں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔ یہ اس لیے ہوا کہ مسلمانوں نے تعلیم کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ انھوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ لہٰذا وہ سب سے زیادہ مسلمانوں پر نظر رکھتے تھے۔ سرسید احمد خاں اس وقت سرکاری ملازم تھے۔ سید محبوب شاہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہولناکیاں اور ان کے بھیانک نتائج کو بہ چشم خود دیکھا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ انگریز قوم سے ہندوستانیوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کی غلامی کے دور میں بہتری اور خوش حالی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ ان ہی سے

*ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

جدید علوم کی تحصیل ہے۔ یہ کام زیادہ طویل اور مشکل ترین اس وجہ سے اور ہوگیا کہ ہندوستان کے لوگ خصوصاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور خاص کر بعض علما انگریزی علوم کے سخت خلاف ہوگئے اور ان کو اسلام خطرے میں نظر آنے لگا۔ لیکن سرسید نے دشواریوں اور مشکلات سے ہمت ہارنے کے بجائے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔''[۱]

اسی لیے سرسید احمد خاں اس کوشش میں لگ گئے کہ مسلمانوں کو صرف مذہبی تعلیم تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ان کو جدید تعلیم اور انگریزی زبان سے بھی اچھی واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ جب وہ سرکاری ملازمت کر رہے تھے تب بھی جس شہر میں ان کی تعیناتی ہوتی وہاں وہ مسلمانوں کی جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی تعلیم میں لگ جاتے۔

جب وہ مرادآباد اور غازی پور میں ملازمت کر رہے تھے تو انھوں نے دونوں جگہوں پر مسلمانوں کے لیے ادارے قائم کیے۔ یہ علی گڑھ کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا علی گڑھ میں قائم کردہ تعلیمی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تمام دنیا میں شہرت پا گیا اور دنیا میں شاید ہی کوئی بڑا ملک ہو جہاں سرسید کے قائم کردہ ادارے کے طالب علم نہ ہوں اور جہاں یوم سرسید نہ منایا جاتا ہو۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار اس بات میں بہت کامیاب رہے کہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے ہندوستان کے بہت سے شہروں میں زمین حاصل کر لی جس کو راجاؤں اور نوابوں نے مفت دیا۔

اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے حق میں نہیں تھے۔ ایسی سوچ رکھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سرسید کو طلبا میں انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے لیے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ سے انھوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ خواتین کی تعلیم پر بھی زور دینا شروع کر دیں۔ سرسید جس کوشش میں لگے ہوئے تھے اس میں بڑی کامیابی اس وقت ملی جب ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ایک ادارہ قائم ہوا، جس کا نام مدرسۃ العلوم رکھا گیا۔ سرسید اس میں بھی کامیاب ہوگئے کہ اس ادارہ کا سنگ بنیاد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کے ہاتھ سے رکھوائیں۔ یہ کام ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ہوسکا۔ سرسید احمد خاں کو مسلمانوں کے ماضی کی تعلیم پر بڑا فخر تھا چنانچہ سید محبوب شاہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے باپ دادا علم میں کچھ کم مشہور نہ تھے۔ شاید ہندوستان میں انھوں نے بہت کچھ نہ کیا ہو مگر ہمارے اسلاف وہ لوگ تھے جنھوں نے علم کو بہت ترقی دی۔ بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کے دارالعلوم کسی کو بھول نہ گئے ہوں گے۔ ہمارے اسلاف میں تھے جنھوں نے پرانے یونانی علوم کو ایسی ترقی دی کہ اگر مقابلہ کیا جائے تو انھوں نے پرانے علوم کو گویا ذرے سے آفتاب

www.urduchannel.in

بنادیا تھا۔ یورپ اگرچہ اس زمانہ میں علوم وفنون میں مشہور تھا مگر پرانی تاریخ سے معلوم ہوگا کہ اسپین کے دارالعلوم نے اس کو یہ نعمت بخشی ہے۔ انھوں نے جدید علوم کو جو اصل میں مسلمانوں سے سیکھے ہوئے علوم کی ترقی یافتہ شکل میں ہیں دوبارہ حاصل کرنے کی ضروت پر زور دیا۔''[۲]

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو دینی اور دنیوی علوم دونوں دلانے کے حق میں تھے لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ دین کے عالم ہونا چاہیں وہ اس میں اختصاص حاصل کریں اور جو دنیوی علوم کو حاصل کرنا چاہیں وہ اس میں آگے بڑھیں مگر دسویں درجہ تک تمام طلبا کو دینی تعلیم بھی دی جائے، اسی لیے انھوں نے دینیات میں سنی اور شیعہ مسلک کے طلبا کے لیے علیحدہ علیحدہ نصاب مقرر کردیا۔ معروف ماہر تعلیم سید عبداللہ کا خیال ہے:

''تعلیم میں سرسید کے خیالات تجدد کی ہمہ گیر شہرت کے باوجود کچھ زیادہ جدید نہ تھے۔ سائنس کی ترغیب اور انگریزی زبان کی تعلیم اگرچہ اس زمانے کے اعتبار سے بڑے انقلاب انگیز خیال تھے مگر حق یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور ملک کے بعض دوسرے عناصر خصوصاً علما انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے مگر یہ رائے منصفانہ نہیں۔''[۳]

سرسید نے مسلمانوں میں اگر تعلیم کو فروغ نہ دیا ہوتا تو جو مسلمان ہندوستان کے دیگر مذاہب سے آج پچاس سال پیچھے ہیں وہ ساٹھ ستر سال بھی ہوسکتے تھے۔

سرسید خواتین کی تعلیم کے خلاف تھے اور مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ ایسا کہا جاتا ہے لیکن یہ ادھورا سچ ہے۔ جہاں تک خواتین کی تعلیم کا سوال ہے وہ اس کے ہرگز خلاف نہ تھے مگر لڑکوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے کے سلسلے میں ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ سے وہ محتاط ہوگئے۔ کافر اور ملحد ہونے کا خطاب تو بعض علما ان کو دے چکے تھے اگر خواتین کی تعلیم بھی وہ شروع کردیتے تو خدا جانے اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ جہاں تک مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا سوال ہے سرسید احمد خاں اس کے خلاف نہیں تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور صاحب فرماتے ہیں:

''سرسید نے دراصل اعلیٰ تعلیم کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں تین طرح کے کالج قائم ہونے تھے۔ ایک وہ جن میں ملازمتوں کے حصول کے لیے انگریزی کے ذریعہ

www.urduchannel.in

سے تعلیم دی جانی تھی۔ دوسرا وہ جس میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جانی تھی اور تیسرا قدیم علوم کے ماہرین کو اردو کے ذریعہ ایسی تعلیم دینے کے لیے ہوتا جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مذہبی فرائض بھی ادا کر سکتے اور جدید افکار و خیالات سے آشنا بھی ہوتے۔ شروعات تو دو کالجوں سے ہوئی مگر دوسرا یعنی اردو کا کالج بہت جلد ختم کر دیا گیا کیوں کہ اس میں طلبا کم ہوتے تھے اور تیسرا تو شروع ہی نہ ہو سکا۔ صرف پہلا پھلا پھولا اور اس نے برگ و بار پیدا کئے۔''[۴]

سرسید احمد خاں کے علیحدہ مسلم کالج قائم کرنے سے کچھ حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی نہ تھے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے ایم اے او کالج قائم کرنے میں اپنے غیر مسلم دوستوں سے بھی مدد لی۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جسم پر دو آنکھوں سے تشبیہ دیتے تھے۔

آج مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں بھی کتابیں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ شعبوں کے کتب خانوں میں بھی اردو زبان کے ذریعہ پڑھنے کی سہولت تمام مضامین میں فراہم کی جائے اگر کتابیں مناسب مقدار میں نہ ہوں تو یونیورسٹی کے اساتذہ کو اردو زبان میں اعلیٰ درجات کی کتابیں لکھنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہو رہا ہے کہ یونیورسٹی کے اسکولوں میں اردو میڈیم سیکشن کی تعداد کم کی جا رہی ہے اور انگریزی میڈیم کی تعداد بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ طریقہ کار سرسید کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا۔ سرسید کو سچی خراج عقیدت تب ہی پیش کی جا سکتی ہے جب سرسید کا خواب اور ان کے تعلیمی مشن کو انہیں کی طرز پر آگے بڑھایا جائے۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر سید محبوب شاہ، سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص: ۴۸۰)

(۲) ڈاکٹر سید محبوب شاہ، سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص: ۵۱-۵۲)

(۳) ضیاء الدین لاہوری، نقش سرسید، سرسید علما کشمکش اور انگریزی تعلیم، ادارہ الفکر، کراچی، ص: ۱۲-۱۳)

(۴) پروفیسر آل احمد سرور، سرسید احمد خاں، معنویت کی تلاش، تہذیب الاخلاق، خصوصی شمارہ، سرسید کی معنویت ۱۹۹۶ء، ص: ۹-۱۰)

www.urduchannel.in

محمد عالم*

سرسید کی صحافت نگاری

اردو صحافت کی ہر دور میں اپنی اہمیت مسلم رہی ہے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے علوم وفنون کی مختلف جہتوں کی ترویج واشاعت ہورہی ہے ویسے ویسے ذرائع ابلاغ کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ کسی بھی سماج میں اخبارات و جرائد کی ایک مخصوص طاقت ہوتی ہے، تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اخبارات نے بہت سی حکومتوں کو نیست ونابود کردیا اس سلسلے میں گوپال کرشن گوکھلے کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جنھوں نے اپنے اخبارات کی طاقت کو کافی مستحکم کرلیا تھا، لوک مانیہ تلک اور بال گنگا دھر تلک کے اخبارات ''کیسری'' اور ''مرہٹہ'' سے انگریزی حکومت ہمیشہ خوف زدہ رہی۔ ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' ہو یا محمد علی جوہر کا اخبار ''ہمدرد'' ان کی تحریروں کا اتنا اثر تھا کہ انگریزوں کے کلیجے کانپ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کے بے شمار جیالے اردو صحافیوں نے اپنے اخبارات وجرائد اور پر جوش تحریروں سے سماج میں بیداری، جذبۂ حب الوطنی اور حریت کی لے کو تیز کرنے میں جس جوش اور لگن کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی اہم کارنامے سے کم نہیں ہے۔ اخبارات وجرائد کی سیاسی قوت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان کی آزادی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے میں صحافت خصوصاً اردو صحافت کا اہم رول رہا ہے اردو اخبارات نے آزادی کے لیے ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں جذبات اور بے پناہ تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ہر محاذ پر اپنے وجود کو خطرے میں ڈالا مگر اپنی روش اور اپنے رویے کو نہیں بدلا، ہندستان کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینے کا جذبہ جتنا اردو اخبارات نے پیدا کیا اتنا کوئی اور زبان نہ کرسکی۔ ہندوستان میں غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے اور لوگوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹادینے کی ترغیب دینے اور انگریزی حکومتوں کے خلاف بے باکانہ انداز اختیار کرنے والا کوئی اور اخبار نہیں بلکہ وہ ''اردو اخبار'' تھا جس کے ایڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے جن کو انگریزوں نے دہلی میں توپ سے اڑادیا تھا۔

* ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

اردوصحافت پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردوصحافت ہمیشہ احتجاج کی صحافت رہی ہے، ظلم کے خلاف احتجاج، ناانصافیوں و بدعنوانی کے خلاف احتجاج، سماجی برائیوں اور امتیازی رویوں کے خلاف احتجاج، اور ہر اس عیب کے خلاف احتجاج بلند کرنا اس کا شیوہ رہا ہے جس سے سماج پر غلط اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اردو اخبارات و جرائد نے کبھی بھی حکومتوں کی بے جا طرفداری اور ان کی بے جا حمایت نہیں کی اور ظلم زیادتی کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردوصحافت کی تاریخ حب الوطنی، سرفروشی، بے خوفی اور بے باکی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مولانا محمد باقر، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، عابد علی، عبدالحمید انصاری، اور حیات اللہ انصاری وغیرہ وہ نام ہیں جنھوں نے اردوصحافت کو معیار اور اعتبار ہی نہیں بخشا بلکہ اس کو دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھیں میں ایک مضبوط نام سرسید کا بھی ہے جنھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں سے لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کیا بلکہ ان کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی منزل کا تعین خود کرسکیں۔ اردوصحافت کے لسانی کردار کو ایک نئی سمت عطا کرنے اور صحافتی زبان کے ارتقا میں سرسید احمد خاں کا جو اہم کردار رہا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

سرسید نے یوں تو اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ''سیدالاخبار'' (۱۸۴۱) دہلی سے کیا تھا یہ اخبار سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا چوں کہ سید محمد خاں ایک سرکاری ملازم تھے اس لیے اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالغفور تھے یہ اخبار ۱۸۴۸ء تک پوری آن بان کے ساتھ جاری رہا اور جب سید محمد کا انتقال ہوگیا تو اس اخبار کی ساری ذمہ داری سرسید نے خود سنبھالی لیکن اس اخبار کے بند ہو جانے کے بعد دوبارہ ان کی صحافت کی ابتدا ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' کے ذریعہ ہوئی۔ یہ اخبار ۳/مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہوگیا اس کا ایک کالم اردو میں اور ایک کالم انگریزی میں ہوتا تھا۔ اردوصحافت کی تاریخ میں اس اخبار کی اہمیت کو اس وجہ سے نہیں بھلایا جاسکتا کہ اس اخبار نے جہاں ایک طرف اردو زبان وادب کو آسان اور عام فہم بنانے میں اہم کردار نبھایا وہیں اس اخبار کے تحت مسجع و مقفیٰ نثر کی مخالفت اور انجمن پنجاب کی بھرپور حمایت کی گئی اور نظم و نثر کے تئیں سرسید اور ان کے رفقاء کا جو اہم مقصد تھا اس کو تقویت بخشی۔

سرسید نے اردوصحافت کو سچائی، بے خوفی، اور بے غرضی کی اعلیٰ روایات سے اس وقت روشناس کرایا جب وہ گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ اس اخبار کے ذریعہ انھوں نے کبھی بھی کسی پر نہ کیچڑ اچھالا نہ کبھی بے جا تنقید کی۔ انھوں نے اس اخبار کو صرف خبروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس اخبار کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کا بھی کام لیا جس کی اس

www.urduchannel.in

وقت اشد ضرورت تھی۔اس اخبار کا خاص مقصد ہندوستانی عوام کو مغربی علوم وفنون اور ایجاد و انکشافات سے روشناس کرانا تھا اس مقصد کی تکمیل کے لیے اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' نے انگریزی مواد کا اردو ترجمہ کر کے عوام تک پہنچایا۔سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے اور اس اخبار کے جاری کرنے کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے حالؔی نے لکھا ہے:

''ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اس منافرت کو دور کرنے.....اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے،علمی مضامین پر سوسائٹی میں لیکچر دیئے جائیں،رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے قائم کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔''[۱]

اس اخبار میں جن شخصیات نے اپنے رشحات قلم اور علوم وافکار کی جولانی سے قدر ومنزلت میں اضافہ کیا ان میں سرسید کے علاوہ مولوی محمد اسماعیل،مولوی ذکاءاللہ،علامہ شبلی،مولوی سمیع اللہ،محسن الملک،وقار الملک،مولوی نذیر احمد،الطاف حسین حالی،وحیدالدین سلیم،خواجہ غلام الثقلین،مولوی کرامت حسین وغیرہ کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

اس اخبار میں جہاں سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے وہیں علمی،ادبی،اخلاقیات،سوشل وغیرہ ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے اس کے علاوہ انگریزی اخبارات سے ترجمہ کر کے وہ آرٹیکل جو ہندستانی معاملات پر مبنی ہوتے تھے تواتر کے ساتھ شائع ہوتے نیز طرز معاشرت،علمی،اور تاریخی تحقیقات کے حوالے سے جو لیکچر اس سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے وہ اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' میں شائع ہوتے تھے۔سرسید صحافت کے حوالے سے ہمیشہ سے آزادئ رائے کے قائل تھے وہ سنجیدگی اور صحت واقعات پر زور دیتے تھے سرسید جب لندن میں مقیم تھے تو انھوں نے اس اخبار کے اور اپنی سوسائٹی کے حوالے سے راجہ جے کشن داس کو ایک خط میں لکھا کہ.....

''مجھ کو اس بات سے دریافت ہونے سے کہ حضور نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر نے آپ کی سوسائٹی کی بڑی دستگیری کی ہے اور صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بہادر اضلاع شمال ومغرب نے بھی بڑی اعانت اور پرورش فرمائی ہے نہایت خوشی ہوئی اور خدا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔مگر اے مائی ڈیر راجا اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت دینا۔''[۲]

غرض کہ سرسید نے اس اخبار کے ذریعہ جہاں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم اور علوم وفنون سے واقف کرایا وہیں اس

www.urduchannel.in

اخبار کے ذریعہ اردو زبان کو آسان بنایا اور اردو صحافت جو شاعری کی جادو بھری دنیا میں گھوم رہی تھی اس سے باہر نکال کر اردو صحافت کی زبان کو سادگی اور سنجیدگی عطا کی اور اپنے محدود دائرے میں رہ کر اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور بہتوں کے لیے اخبار نویسی کی نئی راہ ہموار کی۔

اس کے علاوہ سرسید نے جس رسالے کے ذریعہ اردو صحافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا وہ ''تہذیب الاخلاق'' تھا اس رسالے کو سرسید نے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا اس رسالے کے ذریعہ انھوں نے نہ صرف اردو میں صحافتی زبان کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا بلکہ اس وقت کی جدید ترین صحافتی زبان کے ہم رتبہ کر دیا۔ اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' تو باقاعدہ ایک اخبار تھا لیکن ''تہذیب الاخلاق'' ایک اصلاحی رسالہ ہونے کے باوجود اس وقت کی صحافت کا مثالی نمونہ تھا۔

انیسویں صدی میں اردو کی علمی و ادبی صحافت کے لسانی رجحانات کا تعین کرنے میں اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' اور 'تہذیب الاخلاق' نے جو نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں اس عہد کے کسی دوسرے اخبار یا رسالے نے نہیں دیئے۔ جہاں اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' کا مقصد ہندوستانی عوام کو مغربی علوم و فنون سے واقف کرانا تھا وہیں 'تہذیب الاخلاق' کا مقصد تعلیمی تحریک و رجحانات اور سماجی اصلاح تھا۔ اس کے علاوہ آسان زبان کو فروغ دینے، سادہ اور عام فہم نثر لکھنے کی ایک کھیپ تیار کی جنھوں نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ اخبار کچھ وجوہات کی بنا پر درمیان میں تین سال کے لیے بند رہا اور دوبارہ ۱۸۷۹ء کو شائع ہوا لیکن ۱۸۸۲ء میں پھر بند ہو گیا اور بارہ سال کے طویل عرصے کے بعد ۱۸۹۴ء میں جاری ہوا۔ موجودہ عہد میں یہ رسالہ پروفیسر صغیر افراہیم کی ادارت میں بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

اس رسالے میں سرسید کے مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے انھوں نے اس رسالے کے ذریعے جہاں معاشرے کی اصلاح کی وہیں ادب کے تعمیری رجحانات، سادہ و سلیس زبان اور استدلالی طرز اسلوب کو فروغ دیا اور تاریخ صحافت میں وہ انقلاب برپا کر دیا جو کسی دوسرے کے حصے میں نہ آیا۔

سرسید نے اس رسالے کے اجراء کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس پرچے کی اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اول درجے کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور وہ بھی دنیا میں مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس سے مراد انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور

www.urduchannel.in

تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ
درجے کی عمدگی پر پہچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس
سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت
حاصل ہوتی ہے اور وحشیانہ اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''[۳]

یہی وجہ ہے کی 'تہذیب الاخلاق' میں مذہبی مضامین کے علاوہ، سماجی اصلاح، سائنس، فلسفہ، تاریخ جیسے اہم موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقیات، تہذیب وتمدن، طرز معاشرت پر بھی مضامین کثرت سے شائع ہوئے۔

غرض کہ سرسید نے اردو صحافت پر جو احسانات کیے ہیں اور صحافت کو جو رفعت و بلندی عطا کی ہے اس سے کسی بھی صورت میں انکار ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' اور 'تہذیب الاخلاق' دونوں سے اردو زبان کو آسان بنا دیا اور قدیم انداز بیان کو ترک کرتے ہوئے جدید اسلوب کو عام کیا اور اردو صحافت کی زبان کو سادگی، متانت اور جامعیت کے عناصر سے مالا مال کیا۔

حواشی:

(۱) حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالؔی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص: ۳۳۵

(۲) سرسید احمد خاں: خلیق احمد نظامی (ترجمہ اصغر عباس) پبلیکیشن ڈویزن دہلی ۱۹۷۱ ص: ۷۸

(۳) تہذیب الاخلاق، جلد سوم شمارہ نمبر ۵، یکم ربیع الاول ۱۲۸۹ مطابق مئی ۱۸۷۲ء

www.urduchannel.in

شمشاد بی*

سرسید کی دینی وابستگی

ہندوستان کی سرزمین یوں تو بے شمار نامور ہستیوں کی جائے پیدائش ہے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دین و ملت کی قیادت و سیادت اور قوم مسلم کی صحیح رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور خاموشی سے ابدی نیند سو گئے۔ ان میں سے بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی زندگی کے گوشوں سے شناسائی حاصل کرنے کے لیے ہزاروں اوراق الٹنے پڑتے ہیں۔ لیکن انھیں میں سے کچھ ایسے افراد بھی ہیں جنھوں نے گراں قدر خدمات کے توسط سے عوام وخواص کے ذہن پر اپنی یادوں کے ایسے نقوش چھوڑے اور اپنی دینی اور ملی خدمات سے دنیا کو اتنا متاثر کیا کہ جب تک وہ نقوش باقی ہیں تب تک انھیں احسان شناس لوگ خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے اور امت مسلمہ پر ان کے کیے گئے بے لوث احسانات کی قصیدہ خوانی ہوتی رہے گی ان میں نمایاں نام سرسید کا ہے جن کی پوری زندگی مسلم قوم کی علمی، عملی، دینی اور ثقافتی فلاح و بہبود کے لیے وقف تھی۔ جب ہم سرسید کی زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں وہ اپنی ذات میں ایک انجمن نظر آتے ہیں۔ وہ ایک عادل منصف بھی تھے، ماہر مورخ بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ماہر نباض بھی تھے جو قوم کے زوال کے اسباب اور ان کے حل سے پوری طرح واقف تھے ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ ایک ماہر عالم دین بھی تھے۔

سرسید کی مذہبی وابستگی کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتانا کافی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنایا اس کے ساتھ ساتھ قدیم مذہبی تعلیم کے نظام کو قائم کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ کیوں کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جب تک طلبا کا مذہبی شعور بیدار نہیں ہوگا اس وقت تک ان کو ایک کامیاب انسان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سر سید کی یہ مذہبی فکر آج بھی یونیورسٹی کی درسگاہوں اور اقامت گاہوں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ سرسید کی مذہبی وابستگی اور عشق رسول کی بڑی دلیل "خطبات احمدیہ" ہے جو انھوں نے ولیم میور کی کتاب "THE LIFE OF MOHAMMAD" کے

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

ردعمل کے طور پر لکھی تھی، جس میں اس نے رسول کریمؐ کی شان میں گستاخی کی تھی، سرسید جیسا سچا عاشق رسول توہین رسالت مآب کیسے برداشت کرسکتا تھا اس لیے آپ نے لندن کا خاص طور پر دورہ کیا اور ''خطبات احمدیہ'' کی شکل میں مسکت جواب دیا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے کہ سرسید کے زمانے میں اسلام کو تین خطرات درپیش تھے۔

۱- عیسائی مشینری اسلام، مسلمان اور حضورؐ کو نشانہ تنقید بنانے میں مصروف عمل تھی۔ عیسائی پادری اسلامی تعلیمات اور حضورؐ کے اخلاق وعادات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

۲- دوسرا خطرہ مسلمانوں کی سیاسی صورت حال سے متعلق تھا کیوں کہ مسلمانوں اور اسلام کے تئیں عیسائیوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز مسلمانوں کو بغاوت وفساد کا سبب گردانتے تھے۔

۳- تیسرا خطرہ انگریزی تعلیم سے متعلق تھا جس کے بغیر ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو کوئی چارہ نہیں تھا۔ انگریزی تعلیم کے نتائج اس وقت اسلامی تصورات کے حق میں مشینریوں کی دعوت وتبلیغ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

ان تینوں خطرات سے لڑنے اور مناسب روک تھام کی تدبیر پیش کرنے کا ہنر سرسید کو خوب آتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسلام کے خلاف ہونے والے اعتراضات کے جواب دینے میں علمائے کرام کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ سرسید نے اس وقت رائج طریقے سے انحراف کرتے ہوئے زیادہ پختہ اور نتیجہ خیز طریقہ اختیار کیا اور محققانہ انداز میں جواب دینے کے لیے خود ان کی مذہبی کتابوں کا سہارا لیا جس سے معترضین کی زبانیں بند ہوگئیں۔

دوسرے خطرے سے لڑنے کے لیے انھوں نے اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت کے بعد ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انگریزوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ مسلمان بغاوت کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ انگریزوں کا طریق کار ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ رہا سوال انگریزی تعلیم کے خطرات کا تو سرسید کو یہ اندازہ تھا کہ اس تعلیم سے مسلمانوں کے عقائد واعمال پر جو اثر پڑے گا وہ حد درجہ خطرناک ہوگا۔ واضح رہے کہ خطرہ اس دین حق کو نہ تھا جو ہمارے عقیدے ہی کے مطابق بلکہ روشن دلائل کے مطابق کائناتِ انسانیت کا آخری اور کامل دین تھا بلکہ خطرہ اس اسلام کو تھا جسے عام مسلمان تحقیق کی بنا پر نہیں صرف میراث کی بنا پر اسلام سمجھے بیٹھے تھے۔ سرسید نے ضرورت محسوس کی کہ حقیقی اسلام کی چہرہ کشائی کی جائے تاکہ ان تمام فتنوں کے دروازے بند ہوسکیں جو انگریزی تعلیم کی ترویج نے کھول دیئے تھے۔ انھوں نے ان خطرات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

www.urduchannel.in

سرسید جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے جو عزم، ہمت، حوصلہ، بالغ نظری، دوراندیشی اور حکمت عملی کے سہارے میدان عمل میں اترتی ہے اور قوم کی دنیاوی فلاح ہی نہیں دینی حمیت و غیرت کی بحالی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

سرسید ہر چیز عقل کی نظر سے دیکھنے کے قائل تھے حتیٰ کہ انھوں نے مذہبی امور میں بھی عقل کا سہارا لیا اور فرشتے، جنت، جہنم، معجزات کے بارے میں وہ نظریات پیش کیے جو عام حلقوں میں قابل قبول نہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان پر گمراہ اور کافر ہونے کا فتوی بھی لگا۔ ان سب باتوں کے باوجود سرسید کے خلوص پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

سرسید اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ مسلم سماج بدعات و رسومات اور معاشرتی برائیوں میں گرفتار ہے۔ انھوں نے ان برائیوں کے خاتمے کے لیے نہ صرف علمی مشعل کو روشن کیا بلکہ عملی تدابیر اختیار کرتے ہوئے ''تہذیب الاخلاق'' نامی ماہنامہ جاری کیا جس میں خاص طور پر ان مضامین کو موضوع بحث بنایا جو لوگوں کی اصلاح حال سے متعلق تھے۔ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعہ لوگوں کے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جو انھیں مہذب، متمدن، با اخلاق، با کردار اور ایک اچھا مسلمان بناتے ہوں۔ سرسید چاہتے تھے کہ چھوٹی چھوٹی خوبیاں بھی مسلمان کی گرفت سے دور نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو کس طرح کرنی ہے، ایک دوسرے سے ملاقات کے کیا آداب ہیں حتی کہ کھانے کے کیا آداب ہیں ان سب چیزوں پر بھی سرسید نے اپنی تحریر کے ذریعہ خاص طور پر مسلمانوں کو توجہ دلانے کی کوشش کی۔ ان سب باتوں سے سرسید کا مقصد یہ تھا کہ ان اوصاف حمیدہ سے متصف مسلمانوں کے ذریعہ اسلام کی ایک حسین شبیہ پیش کی جا سکے۔ یہ ان کی دین سے وابستگی کی روشن دلیل ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ نئی تعلیم نے لوگوں کا انداز فکر بدل دیا تھا۔ اسی لیے سرسید یہ چاہتے تھے کہ طلبا فکری ارتداد کے شکار نہ ہوں چنانچہ ایک جلسہ میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اگر تم اپنے دین پر قائم نہ رہے اور سب کچھ ہو گئے اور آسمان کے تارے ہو کر چمکے تو کیا۔ تم ہم میں سے نہ رہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے میں علوم جدیدہ اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔''
>
> (سرسید اور ان کے کارنامے، نورالحسن نقوی، مطبع ایم۔ اے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۱۷)

www.urduchannel.in

مذکورہ اقتباس یہ بتانے کے لیے کافی ہے کی سرسید نئی نسل کو قدیم نافع اور جدید صالح کے حسین تصور سے جوڑے رکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کی نظر میں ایک حقیقی کامیاب انسان ہونے کے لیے دین و دنیا دونوں طرح کی تعلیمات سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید ان نامور اور عبقری شخصیات میں سے ایک تھے جن کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ وہ اپنے دور کے ان فرشتہ صفت لوگوں میں سے ایک تھے جن کے محض تصور سے ہی دل کو ڈھارس اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اللہ نے سرسید کو اخلاص، للّٰہیت، جذبۂ اصلاح، فہم سلیم، حقیقت شناسی، حقیقت بینی اور جفاکشی و بلند ہمتی کے اوصاف سے متصف فرمایا تھا۔ آپ کی زندگی آج بھی ان لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہے جو اپنی زندگی کو انقلابی زندگی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں، جو محدود وسائل کے باوجود علم و عمل کے چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں اور جو خلوص و للّٰہیت سے سرفراز ہونا چاہتے ہیں۔

○

www.urduchannel.in

معصوم زہرا*

سرسید کا تعلیمی نقطۂ نظر اور 'تہذیب الاخلاق'

انیسویں صدی کے نصف آخر میں نادرشاہ اور احمد شاہ کے پے در پے حملوں سے مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ یاس و نا امیدی نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا جس سے مسلمان ذہنی الجھن میں گرفتار تھے۔ تغیرات زمانہ کے ساتھ مسلمان قوم سیاسی، سماجی و معاشی سطح پر خود کو ڈھالنے میں ناکام تھی اس ناکامی کا سبب کم علمی اور جدید علوم وفنون سے لاعلمی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کے مسلط ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑا ان کو قیدی بنا کر ان کی جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا، اور لاتعداد مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے برعکس ہندو قوم میں جدید علوم بالخصوص انگریزی تعلیم کا دور دورہ تھا، راجہ رام موہن رائے کے بعد رویندر ناتھ ٹیگور، اور ایشور چندر ودیا ساگر جیسے دانشور رہنما ہندو معاشرے کی رہنمائی میں سرگرم عمل تھے۔ نوکری، درس و تدریس، تجارت غرض ہر شعبہ میں ہندو قوم کو مسلمان قوم پر سبقت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا سرسید نے عمیق مشاہدہ کیا، قوم کی تنزلی دیکھ کر ان کا دل بھر آیا لہٰذا انھوں نے اپنی پوری زندگی مسلمان قوم کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی۔

سرسید ایک صاحب بصیرت و بصارت، بیدار مغز اور روشن ضمیر انسان تھے انھیں حالات کی تبدیلی کا گہرا شعور تھا۔ سرسید کو معلوم تھا کہ مسلمان قوم اس وقت عروج پا سکتی ہے جب علم کے زیور سے آراستہ ہوگی۔ انھوں نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دیا، وہ بخوبی آگاہ تھے کہ جب تک قوم کا نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ و تہذیب یافتہ نہیں ہوگا تب تک قوم کی تعلیمی، معاشی و تہذیبی صورت حال میں ترقی ممکن نہیں۔

پنڈت پرشاد کول نے سرسید کے نظریات کے بارے میں لکھا ہے کہ.....

''وہ تو مسلمانوں کو قعر مذلت سے ابھار کر زمانۂ حال کا ترقی پسند اور مہذب

---

*ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

انسان بنانا چاہتے تھے۔اسی لیے انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کیں
اور کامیاب ہوئے۔''[۱]

یہ بات حقیقت ہے کہ سرسید نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے سخت ریاض کیا انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے قائم کردہ ہر تعلیمی ادارے میں انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔انھوں نے اولین تعلیمی ادارہ ۱۸۵۹ء میں ''گلشن اسکول'' قائم کیا اس میں بھی مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کو بھی لازماً شامل کیا۔

۱۸۶۳ء میں غازی پور میں ''وکٹوریہ اسکول'' قائم کیا تو اس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ٹھہرایا اور اسی سال غازی پور میں 'سائنٹفک سوسائٹی' کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد بھی مغربی علوم و افکار و نظریات کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے نوجوانان قوم تک پہنچانا تھا۔

۱۸۶۴ء میں جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ میں ہوا تو ''سائنٹفک سوسائٹی'' بھی علی گڑھ منتقل ہوئی، انھوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے کالم کے ساتھ جاری کیا۔اس پرچے کا مقصد بھی مغربی علوم سے رغبت دلانا تھا۔لیکن المیہ یہ ہے کہ اس کارنامے کی وجہ سے سرسید کی شدید مخالفت کی گئی اور انھیں ملحد اور بے دین قرار دیا گیا،لیکن ان کے پایۂ استقامت میں لغزش نہیں آئی اور پوری لگن،ایمان داری،خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ اپنے مقصد تک پہنچنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

اپنی قوم میں جدید علوم کی شمع روشن کرنے کے لیے سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔اس سفر کے لیے انھوں نے قرض لیا،ذاتی کتب خانہ فروخت کر دیا،اپنا گھر گروی رکھا اور ملازمت سے بھی استعفیٰ دے کر اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ لندن پہنچے اس سفر کا مقصد آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے طریقۂ درس و تدریس کا مشاہدہ کرنا تھا،اس مشاہدے سے سرسید کے ذہن پر مزید واضح تعلیمی نقوش ابھرے۔انگلستان سے واپس آکر انھیں یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم پر اپنی قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا بندوبست کیا اسی دوران سرسید وہاں کے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے پرچوں سے بہت متاثر ہوئے جس میں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین شائع ہوتے تھے۔سرسید نے ان پرچوں کے طرز پر ایک رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا اور ہندوستان واپس آکر ۲۴؍دسمبر ۱۸۷۰ء کو رسالہ'' تہذیب الاخلاق'' جیسے رسالہ کا اجرا کیا۔جس کا بنیادی مقصد معاشرے کی اصلاح،تہذیب اور حسن اخلاق کی تعلیم دینا تھا اس رسالے میں کثیر تعداد سرسید کے مضامین کی ہوتی تھی اور ان کے رفقا میں مولوی چراغ علی،ذکاء اللہ،علامہ شبلی،محسن الملک،حالی،وقار الملک اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے بھی افکار سرسید کے اتباع میں نمائندہ مضامین لکھے۔'تہذیب الاخلاق' کے ان مضامین نے جہاں سرسید کے فکر و نظر کی ترجمانی میں اہم کردار ادا کیا وہیں ادب میں جدید اسلوب کی داغ بیل بھی ڈالی۔مسجع و مقفیٰ

www.urduchannel.in

عبارت کے بجائے سادہ اور عام فہم زبان میں اپنے پیغام عوام تک پہچانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے چند ہی دنوں میں اس رسالے نے عوام وخاص میں بہت مقبولیت حاصل کی۔اور آج بھی اسی شان وشوکت کے ساتھ یہ رسالہ اصلاحی،علمی وادبی کارنامے انجام دے رہا ہے۔

'تہذیب الاخلاق' نے سرسید کے سائنسی خیالات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اسی لیے انھوں نے اس رسالے میں ایسے مضامین شائع کیے جس نے مذہب اور سائنس کے درمیان دوری مٹانے کی کوشش کی اور مسلمان قوم کو جدید علوم کی طرف راغب کیا۔انھوں نے اپنے مقالے میں اس حوالے سے مسلمان قوم کے نوجوانوں اور بچوں کو پیغام دیا کہ.....

''اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا دیکھوں۔اس کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسے پھیلے کہ سورج، چاند اور ستارے اس کے آگے ماند ہو جائیں .....پس میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جائیں اور ان دو الفاظ لا الہٰ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ کو نہ بھولیں۔''[۲]

سرسید کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ان کی قوم کے مسلم نوجوان انگریزی زبان وادب اور جدید علوم وفنون کا مطالعہ کریں اور قدیم مشرقی علوم پر بھرپور توجہ دیں،اس کے علاوہ عربی، فارسی زبان وادب اور مذہبی تعلیم کو ضروری قرار دیا تاکہ نوجوانوں کے ذہنوں کی نشوونما ہوتی رہے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ صراط مستقیم پر باقی رہیں گے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ سرسید مسلمانوں کے لیے ایک جامع نظام تعلیم کے خواہاں تھے اس لیے سرسید کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا ہوں جو عصری علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ اسلامیات ومشرقیات کا بھی علم رکھتے ہوں تاکہ وہ قدیم علمی وراثت کو محفوظ رکھ سکیں۔اس حوالے سے وہ خود فرماتے ہیں کہ.....

''ہم کو گزشتہ وحال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ متعین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی ودنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کے اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔''[۳]

اس رسالے کے جاری کرنے کے ساتھ ساتھ سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے ''کمیٹی خواست گاران ترقی تعلیم مسلمان'' قائم کی اس کمیٹی کے تحت انعامی مقابلے منعقد کیے گئے اور

www.urduchannel.in

مسلمانوں میں تعلیم سے دوری کے اسباب بتائے گئے اور اس کے تدارک کے لیے ایک جامع نوٹ تیار کیا گیا اور مسلمانوں میں تعلیم سے عدم دلچسپی کے اسباب، قدیم علوم سے غفلت اور جدید علوم سے نفرت کے وجوہات پر مدلل بحث کی گئی اور مسلمانوں میں قدیم و جدید علوم کو اختیار کرنے کے متعلق تجویزیں پیش کی گئیں۔ غرض کہ تمام مخالفتوں، رکاوٹوں اور دقتوں کے باوجود سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' اور اپنی علمی و ادبی تحریروں کے ذریعہ عصری و دینی تعلیم میں امتزاج اور اس کے ربط و تعاون میں جو کردار ادا کیا ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی:

(۱) ادبی اور قومی ٹکڑے: پنڈت پرشاد کول، ص:۳۷۲

(۲) خطبات سرسید، جلد۲، ۱۹۷۳، ص:۴۷

(۳) مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۳۱۰

www.urduchannel.in

توصیف بریلوی*

طلاق ثلاثہ سرسید کی نظر میں

انیسویں صدی کی مایہ ناز شخصیات میں سرسید احمد خاں سرفہرست ہیں۔ سرسید جیسی مختلف الجہات اور کثیر الابعاد شخصیت جس صدی میں پیدا ہوئی ہے وہ پوری صدی تو متاثر اور مستفید ہوتی ہی ہے ساتھ ہی آنے والی صدیاں بھی ان کی کارگزاریوں، کاوشوں اور محنت کے صلے میں خوب سیراب ہوئی ہیں۔ سرسید نے اپنے عہد میں زندگی کے کون سے شعبہ کو متاثر نہیں کیا۔ وہ ایک بہترین مہتمم، دوراندیش، دانشور اور مدبر تھے۔ اس بات کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب پورے ملک میں خلشفار بپا تھا، جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، ایسے وقت میں عملی طور پر اگر کوئی کام کررہا تھا تو وہ تھی سرسید کی ذات واحد۔ اپنے گھر کے لٹ جانے کے باوجود سرسید کو اپنی قوم کی فکر ہورہی تھی۔ ایسی حالت میں دوسروں کی فکر کرنا یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں، یہ سرسید ہی کا خاصہ تھا۔ سرسید نے عملی طور پر قوم کے لیے جو کہا اسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا اور انھوں نے اپنے قلم کی جولانیوں سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس، صحافت، ادب، اخلاق، مذہب، تعلیم، زراعت، ہومیوپیتھی، تاریخ، فلسفہ، سفرنامہ، رپورٹ، کتابوں پر ریویو، عورتوں کے حقوق، حب الوطنی، یونانی طب، تجارت اور حکایتیں وغیرہ وغیرہ ان میں سے کون سا ایسا موضوع ہے جس پر سرسید نے کتاب یا مضمون نہ لکھا ہو بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ جس قدر وسیع القلب تھے اسی قدر ان کا قلم رواں تھا اور غالباً انھوں نے کوئی موضوع نہیں چھوڑا۔ انہیں موضوعات میں ایک ''طلاق ثلاثہ'' بھی ہے جو آج (یعنی ۲۰۱۷ء) کا بہت ہی چبھتا ہوا موضوع ہے۔ کسی بھی حکومت کو کسی بھی مذہب کے شرعی احکام یا حقوق میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ اس موضوع پر سرسید نے بھی ایک مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار بڑی ہی شائستگی سے کیا ہے۔

مذکورہ مضمون میں ہم طلاق ثلاثہ پر سرسید کے خیالات تو جانیں گے ہی ساتھ ہی ہم طلاق ثلاثہ کی تعریف، نقصان،

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

فائدہ اور حکومت کی اس میں دخل اندازی پر بھی گفتگو کریں گے۔ سب سے پہلے طلاق اور اس سے متعلق چند اصطلاحیں ملاحظہ فرمائیں:

طلاق عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: نکاح کا فسخ ہو جانا، عورت کا نکاح سے آزاد ہو جانا۔

طلاق بائن: جدا کر دینے والی طلاق جس میں رجوع نہیں کیا جا سکتا۔

طلاق بدعت: بے قاعدہ طلاق جو ایک ہی دفعہ تین طلاق کہہ کر دی جائے۔

طلاق حسن: ایک ایک کر کے وقت مقررہ کے بعد دی جانے والی طلاق۔

طلاق رجعی: طلاق کا پہلا درجہ، وہ طلاق جس کے بعد آدمی بیوی کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

طلاق کنایہ: وہ طلاق جو صاف الفاظ میں نہ ہو۔

طلاق مغلظ: طلاق کا تیسرا درجہ۔ قطعی طلاق۔[۱]

مذہب اسلام میں طلاق ثلاثہ کو طلاق بدعت قرار دیا گیا ہے یعنی ایک ہی بار میں تین طلاق دے دی جائیں اور جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہی ہے۔ سرسید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔ شریعت محمدیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''گو طلاق جائز کی گئی ہے مگر کوئی چیز زمین کے پردے پر طلاق سے زیادہ خدا کو غصہ دلانے والی پیدا نہیں ہوئی۔''[۲]

اس سے پتا چلتا ہے کہ طلاق اسلام میں کسی مصلحت کے تحت ہی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کچھ مرد حضرات طلاق کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات مرد حضرات غصہ کی حالت میں تین طلاق ایک ساتھ دیتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں۔ اسی لیے 'طلاق حسن' کا راستہ زیادہ بہتر بتایا گیا ہے تا کہ ایک بار طلاق دینے کے بعد مقررہ وقت تک انتظار کرنا پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ اس مدت میں شوہر اور بیوی کے تعلقات پھر سے استوار ہو جائیں۔ اس بابت سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''شریعت محمدیہ نے طلاق کو ایسی حالت میں جائز قرار دیا ہے جب کہ زن و شوہر میں مرض ناموافقت و عدم محبت کا ایسے درجہ پر پہنچ جاوے جو علاج کے قابل نہ ہو یا یوں کہو کہ بجز طلاق کے دوسرا کوئی علاج اس کا نہ ہو مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا ہے کہ اس میں جو خرابی پیدا ہو سوائے انھی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کا

www.urduchannel.in

اندازہ نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں اس لیے اس میں شریعت حقہ کے بانی نے اس حد کی تعین انھی کی رائے اور انھی کی طبیعت پر منحصر کی ہے اور اسی کے اخلاق کو اس کا قاضی بنایا ہے جس کی تسلی و مواسلت کے لیے ابتدا میں عورت بطور انہیں دلنواز و مونس و غمگسار کے پیدا ہوئی تھی اور اس بات کا کہ وہ علاج بے محل و بے موقع بداخلاق اور بدخواہش نفسانی سے نہ کیا جاوے جہاں تک کہ انسان فطرت کے مناسب حال تھا۔''

آگے لکھتے ہیں:

''عورت کی نسبت فرمایا کہ جو عورت بغیر لاعلاج ضرورت کے اور بغیر سخت حالت کے اپنے شوہر سے طلاق کی خواہاں ہو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم طلاق سے ایسے ناراض ہوتے تھے کہ بعض دفعہ صحابہ کو شبہ ہوا کہ طلاق دینے والے نے ایسا جرم کیا ہے کہ قتل کرنے کے قابل ہے پھر ان ہدایتوں اور تہدیدوں ہی پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی تدبیریں فرمائیں۔''[۳]

مذہب اسلام میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جتنا ممکن ہو اتنی کوشش یہ کی جائے کہ میاں بیوی رجوع کرلیں لیکن جب معاملہ کسی صورت بن ہی نہیں پاتا تو طلاق کا راستہ آسانیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی کسی وجہ کے تحت ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں تو بھی انہیں طلاق سے باز رہنا چاہیے۔ جگ ظاہر ہے کہ رشتۂ ازدواج ایثار و محبت پر ہی قائم رہتا ہے اور جب یہی مفقود ہو جائے تو کیوں کر یہ رشتہ دیرپا قائم رہ سکتا ہے۔ رشتوں کا بوجھ کھینچنے سے بہتر طلاق ہی ہے لیکن اس میں بھی بہتر طریقہ 'طلاق حسن' کا بتایا گیا ہے کہ جس میں ایک خاص مدت کے بعد ہی اگلا طلاق دینا ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ شاید شوہر رجوع کرلے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یعنی پوری تفریق واقع ہونے کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے اور یہ اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جاوے اور رنجش مٹ جاوے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جاوے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں۔

www.urduchannel.in

دوسری طلاق کے بعد بھی اس طرح وہ آپس میں بدستور جوروخصم ہو سکتے ہیں لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دی جاوے تو ثابت ہوگیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ پوری تفریق ہوجاوے ایسی حالت میں کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے طلاق دینے کو منع فرمایا اس امید پر کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت والفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا دل سے جاتا رہے بس یہ تمام احکام نہایت عمدگی واعتدال سے فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔''[۴]

آج زمانہ اتنا ترقی یافتہ ہو چکا ہے کہ مرد وزن دونوں اپنے اپنے حقوق بخوبی جانتے ہیں۔Modernism اور جھوٹے Development کی اندھی آندھی میں جہاں ایک طرف حقوق نسواں کے نام پر ان کے جذبات برانگیختہ کرکے اپنے مفاد کے لیے انھیں ہر میدان میں اتارا جارہا ہے تو دوسری طرف Live in relation, Lesbianism اور Gay culture کی بھی حمایت کی جارہی ہے۔Internet پر ان سب کا Ratio دیکھا جائے تو ہندوستان بھی کہیں پیچھے یا کسی سے کم نظر نہیں آئے گا۔ایسے میں اس دوغلے سماج سے سوال یہ ہونا چاہیے کہ جب یہ ساری لعنتیں ان کے نزدیک جائز ہیں۔مرد وعورت کا بلا کسی سند کے میاں بیوی بن کے رہنا جائز ہے تو طلاق ثلاثہ میں قباحت کیسی؟ جس کے لیے آج کل وایلا مچا رکھا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ملک کی ترقی کا دارومدار مسلم عورتوں کے حقوق دلانے پر ہی ہے۔مانا جاسکتا ہے کہ کچھ عورتوں کے ساتھ طلاق کی وجہ سے زیادتی ہوئی ہے اور اس کی ممانعت بھی ہے (ایک بار میں تین طلاق کی) لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حکومت شریعت میں ہی دخل اندازی کرنے لگے۔حکومت کا یہ امر سراسر غلط اور قابل مذمت ہے۔آج مرد وزن دونوں میں صبر کا مادہ وہ نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات میں ایک دوسرے سے بیزارگی ہوجاتی ہے۔اگر طلاق کا آپشن نہ استعمال کیا جائے تب الگ ہونے کے لیے عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔ یا جب کچھ نہیں ہوگا تو اس بات کا کوئی ضامن ہے کہ دونوں کو باندھ کر رکھا جائے گا.....؟ یعنی میاں بیوی اگر ساتھ میں رہنا نہیں چاہتے تو کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرکے وہ الگ ہو ہی جائیں گے۔انہیں کسی کورٹ اور کچہری کی بھی ضرورت نہیں۔معاشرے میں ایسے بھی کئی معاملات مل جائیں گے جو بغیر طلاق یا عدالتی فرمان کے بھی الگ ہوجاتے ہیں اور پوری پوری عمر گزار دیتے ہیں۔ایسے میں اگر کوئی شریعت کی حد میں رہ کر جائز طریقہ سے علیحدگی اختیار کرے تو اس میں کس کے حقوق تلف ہوئے جارہے ہیں؟ عورت کو جلا کر مارنے یا اس کا قتل کرکے اس سے چھٹکارا پانے سے کہیں بہتر ہے کہ طلاق لے کر الگ ہوجائیں۔اگر طلاق سماج کے

www.urduchannel.in

لیے اتنا ہی مضر ہے تو عدالتوں پر بھی یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ divorce paper نہ دیں۔ اگر کوئی شخص اپنی شریعت کے مطابق طلاق نہیں لے سکتا تو عدالت کے ذریعہ علیحدگی کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

سرسید نے بھی اپنے مضمون میں طلاق کو بہتر نہیں کہا ہے اور شریعت کی روشنی میں ہی اپنی بات کہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ نکال لیا جائے کہ طلاق نہیں دینی چاہیے۔ طلاق تب دی جائے جب میاں بیوی میں ذرہ برابر بھی اتفاق باقی نہ رہ جائے۔ اپنے مضمون کے اختتام پر سرسید بڑی ہی عمدہ بات طلاق پر اعتراض کرنے والوں کے لیے لکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

> ''یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں ان کو توڑنا نہیں چاہیے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ حدیں کچھ دیواریں یا خندقیں نہیں ہیں بلکہ یہ حدیں فطرت انسانی کی حدیں ہیں جن کو توڑنا انسانیت کی حد سے خارج ہونا ہے۔ پس جو لوگ مسئلہ طلاق پر معترض ہیں جب وہ اس کو بخوبی سمجھیں گے اور فطرت انسانی پر غور کریں گے تو بالیقین جانیں گے کہ بلاشبہ یہ حکم اسی کا حکم ہے جس نے فطرت انسانی کو بنایا ہے۔'' ۵

مندرجہ بالا اقتباسات اور بحث سے بتانا یہ مقصود تھا کہ کسی بھی شریعت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اس کو بغیر سمجھے اس پر حکم صادر کر دینا احمقانہ اور جاہلانا حرکت ہے۔ سرسید نے نہ صرف طلاق جیسے دقیق موضوع پر اپنی رائے دی تھی بلکہ ''عورتوں کے حقوق'' بیوہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے کا نتیجہ، اور بیوہ عورتوں کا نکاح نہ کرنے میں کیا فساد ہے؟'' جیسے مضامین لکھ کر اپنی فکر اور عبقریت کا لوہا منوایا۔ وہ حقوق نسواں کے بھی حامی تھے اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے متعلق بھی انھوں نے لکھا ہے۔ اسی طرح اپنے مضمون ''بیوہ عورتوں کا نکاح نہ کرنے میں کیا فساد ہے؟'' میں انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ بیوہ عورتوں کا نکاح کر دینے سے سماج میں برائیاں کم ہوں گی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پنڈت دیانند سرسوتی صاحب جہاں توحید کے متعلق وعظ کہتے ہیں ان کو ضرور ہے کہ وہ نکاح ثانی کے متعلق بھی نصیحت کو اپنے ذمے لازم کر لیں۔ کیا وہ معزز ہندو جو بڑے دانشمند ہیں بجائے اور کوششوں کے یہ کوشش نہیں کرتے کہ ایک کمیٹی بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کے واسطے قائم کریں اور اس کمیٹی کی اس غرض سے اعانت کریں کہ وہ اپنے کام کو ترقی دے؟ ہم کو امید

www.urduchannel.in

ہے کہ اس فیصلے کے پڑھنے کے بعد تمام ہندو اور وہ بے عزت مسلمان جو
اس باب میں ہندوؤں کے تابع ہیں ضرور کچھ کریں گے۔''(۶)

سرسید نے طلاق ثلاثہ کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق اور بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی پر لکھا ہی نہیں بلکہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی نہ کرنے کی وجہ سے جو برے نتائج برآمد ہو رہے تھے ان کی رپورٹ بھی پیش کی۔ سرسید کی فکر صرف طلاق ثلاثہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ وہ حقوق نسواں کے حامی تھے۔ اس سے ان کے سماجی حس کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حواشی:

(۱) فیروز اللغات، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۷۱-۲۷۲

(۲) مقالات سرسید ''حصہ سیزدہم''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۶۸

(۳) مقالات سرسید ''حصہ سیزدہم''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۶۸

(۴) مقالات سرسید ''حصہ سیزدہم''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۶۸-۲۶۹

(۵) مقالات سرسید ''حصہ سیزدہم''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۶۹

(۶) مقالات سرسید (حصہ پنجم) مرتبہ، مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۰۳

www.urduchannel.in

محمد شاهد*

سرسیداورتحریک نظم جدید

سرسید کا شمار دنیا کے ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت ،فکر وتخیل، دوراندیشی ،خلوص، قائدانہ صلاحیت ،اور جذبۂ قربانی کی بنا پر قومی ،ملکی ،سماجی، تعلیمی اور ادبی خدمات کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ان کی شخصی جہات اور بے شمار غیر معمولی کارناموں کا احاطہ کرنے کی کوششوں میں کتابوں کے بے شمار ذخیرے معرض وجود میں آ گئے مگر ان کے کارناموں کا احاطہ نہیں ہو پایا اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ سرسید کی شخصیت ایک عہد ساز شخصیت تھی ۔ان کی فکر غیر معمولی تھی ۔انہوں نے اپنی زندگی میں ایسے غیر معمولی کارنامے انجام دیے جو قوم اور ملک کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی تعلیمی ،سماجی اور سیاسی شعور کی بیداری اور احیائے نو سرسید کی رہین منت ہے۔سرسید نے جہاں ہندوستان میں جدید تعلیم کی بنیادیں استوار کیں وہیں زبان وادب کے جدید تقاضوں کے مطابق اصلاح کر کے زبان وادب کو نیا عہد و ماحول عطا کیا۔انہوں نے اپنے نظریات سے شعروادب کی تمام جہتوں اور پہلوؤں کو متاثر کیا۔ادب کو نوآبادیاتی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی روایت قائم کی۔شعروادب کو سرسید نے اجتماعیت سے روشناش کرایا اور اس میں مقصدیت اور افادیت کو زندہ کیا۔

سرسید تحریک دراصل ایک تعلیمی تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم ،سائنسی علوم اور انگریزی زبان کو عام کرنا تھا۔اس کے پیچھے سرسید کا واحد مقصد مسلمانوں کو تنزلی ، بدحالی اور پستی کے اندھیروں سے نکال کر ترقی کی طرف گامزن کرنا تھا۔مگر اس تحریک کے زیر اثر ابتدا ہی سے اردو زبان وادب کی اصلاح عمل میں آئی اور بڑی حد تک یہ تحریک ادبی بھی بن گئی۔سرسید تحریک کے زیر اثر ادب میں افسانہ اور ناول نگاری کا آغاز ہوا، غیر افسانوی ادب کو بہت ترقی ملی اور شاعری میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔اردو شاعری کو انگریزی کی معیاری شاعری پر پرکھنے پر زور دیا گیا اور انگریزی شاعری کی اتباع کا تصور عام ہوا۔انگریزی شاعری کی طرز پر نیچرل طرز اظہار اور بیان کو اہمیت

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

دی گئی اورغزل سے دانستہ طور پر گریز کر کے نظم کو ذریعۂ اظہار بنانے پر زور دیا گیا۔

سرسید کا زبان وادب سے متعلق واضح نظریہ تھا۔ وہ اردو زبان وادب کو حسب حال بنانا چاہتے تھے۔ ادب کی افادیت اور اجتماعیت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب سے قوم کی اصلاح اور اخلاقی وتہذیبی تربیت کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے ادب کی اصلاح پر بھی کافی زور دیا۔ سرسید کے اس ادبی اصلاح کے مشن کو پورا کرنے میں حالی، آزاد، نذیر احمد نے نمایاں کردار ادا کیا۔ سرسید نے اپنی تصنیفات اور مضامین کے ذریعہ اردو نثر میں علمی اور عام فہم نثر کی بنیاد ڈالی۔ شاعری میں بڑی تبدیلی اور ترقی حالی اور آزاد کے ذریعہ واقع ہوئی۔ حالی اور آزاد کے ذریعہ نظم جدید کی صورت میں ایک بڑا انقلاب ظہور پذیر ہوا اور نیچرل شاعری کی اردو میں باقاعدہ بنیاد پڑی۔ نظم جدید کی ابتدا اور پھر ارتقا سرسید تحریک کے زیر اثر ہی عمل میں آیا تھا۔ اگر چہ اس میں سرسید براہ راست شامل نہیں تھے مگر وہ شاعری میں فطری طرز اظہار اختیار کرنے اور مبالغہ آرائی اور بے جا تصنع سے گریز کرنے پر زور دے چکے تھے۔ وہ شاعری میں فطری موضوع کے بیان اور فطری طرز اظہار کے خواہاں تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے مضامین میں ادب پر اظہار خیال شروع کر دیا تھا۔ نثر میں تو انہوں نے خود نیا اسلوب اور طرز اظہار اختیار کر کے سادہ اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی اور براہ راست اردو نثر کے دھارے کو موڑنے کی عملی کوشش کی ساتھ ہی شاعری میں سادگی، فطرت نگاری اور انگریزی شاعری کی اتباع پر زور دیتے رہے۔

۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے جلسے میں کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد نے شاعری میں نئے خیالات اور نظم جدید کے نیچرل طرز اظہار کا تصور پیش کیا اور ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام لاہور میں نظم پر مبنی مشاعروں کا آغاز ہوا۔ ان مشاعروں میں حالی بھی شریک ہوئے اور اپنی نظمیں پیش کیں۔ حالی کی شرکت سے ان مشاعروں کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سرسید کو اس میں اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر نظر آئی اور انہوں نے واضح اور کھلے لفظوں میں اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

حالی اور آزاد کے ذریعہ جب انجمن پنجاب کے مشاعروں کی صورت میں باقاعدہ نظم جدید کی بنیاد پڑی تو سرسید نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تائید اور حمایت کی۔ سرسید کے نظریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم جدید کی شکل میں جو نیچرل شاعری وجود میں آرہی تھی، سرسید انگریزی شاعری کے تتبع میں اردو میں بھی ایسی شاعری کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سرسید انجمن پنجاب کے مناظموں کے بارے میں اپنے مضمون ''علم انشا اور اردو نظم'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو زبان کے علم وادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں

www.urduchannel.in

نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا، ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔ان (آزاد) کی مثنوی ''خواب امن'' ہمارے دلوں کوخواب غفلت سے جگاتی ہے۔مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ان کی مثنوی ''حب وطن'' اور مثنوی ''مناظرۂ رحم وانصاف'' درحقیقت ہمارے زمانے کے علم وادب میں ایک کارنامہ ہے۔ان کی سادگیِ الفاظ، صفائی بیان، عمدگئ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔''[۱]

سرسید نے حالی اور آزاد کو نظم جدید کی بنیاد ڈالنے پر ان کی حوصلہ افزائی اور بھرپور حمایت کی۔ان کی نیچرل شاعری پر مبنی نئے طرز کی نظمیں لکھنے کی اس پہل اور کوشش پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو اپنی دیرینہ آرزو کے پورے ہونے سے تعبیر کیا۔سرسید آزاد کو خط میں لکھتے ہیں اور ان کی مثنوی ''خواب امن'' پر مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ ابھی بھی اس میں خیالی باتوں کی فراوانی ہے لہٰذا اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو:

''میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔میں مدت سے چاہتا تھا کہ نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔آپ کی مثنوی ''خواب امن'' پڑھی، دل خوش ہوا۔درحقیقت شاعری اور سخنوری کی داد دی ہے۔اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو، جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزا دے گا۔اب لوگوں کے کانوں سے مت ڈرو۔ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیال لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔''[۲]

خط کے مذکورہ اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی شاعری سے متاثر تھے اور اردو میں ویسی ہی شاعری کو رواج دینا چاہتے تھے۔وہ اس آغاز پر خوش تو ہوتے ہیں، آزاد کو پہل کرنے پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں مگر وہ اپنے شعری نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل تبصرہ کرتے ہوئے خامیوں اور کمیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔سرسید آزاد کو اور زیادہ نیچرل زبان و بیان اختیار کرنے، انگریزی شاعری سے استفادہ کرنے اور اس سے خیالات اخذ کرنے اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو انگریزی شاعری کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔

سرسید نے نظم جدید کی تحریک پر جس ردعمل کا اظہار کیا وہ نظریاتی سطح پر نیا نہیں تھا کیوں کہ سرسید شاعری میں ایسی ہی کسی اصلاح اور تبدیلی کا ارادہ رکھتے تھے۔انگریزی زبان وادب اور شاعری سے استفادہ کرنے اور اس کو نمونۂ عمل

www.urduchannel.in

بنانے پر اس قدر زور اور اصرار پہلے بھی ان کے مضامین اور تقریر میں ظاہر ہو چکا تھا مگر آزاد اور حالی کے ذریعہ نیچرل شاعری کی صورت میں سرسید کے نظریات کی عملی توسیع عمل میں آ رہی تھی۔ سید عبداللہ، حالی کے تنقیدی نظریات کو بھی سرسید کے نظریات شعروادب کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں:

''مولانا حالی کا مقدمۂ شعروشاعری تقریباً انہی کے خیالات کی زیادہ منظّم اور مربوط تفسیر ہے۔ طرز ادا میں سادگی کی اہمیت، بے تکلفی اور مدعا نگاری کی ضرورت، شاعری کا اجتماع کے لیے مفید ہونا اور اس کی افادی اور تعمیری صلاحیت، یہ سب سرسید کے ارشادات کی صدائے بازگشت ہیں۔''[۳]

نظم جدید کے فروغ کے تعلق سے یہ بات بہت اہم ہے کہ اگرچہ انجمن پنجاب کے مشاعروں نے اس نئے شعری رجحان کو پروان چڑھایا مگر نظم کا اصل فروغ اور نیچرل شاعری کی صورت میں اس کا ارتقا سرسید تحریک کے زیر سایہ ہی عمل میں آیا تھا۔ سرسید نے تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی اصلاح کا عمل بھی اپنی تحریک کے اہم منصوبوں میں شامل کر رکھا تھا۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نظموں پر مبنی مشاعروں کا آغاز ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء میں باقاعدہ عمل میں آیا اور ۳۰ جولائی ۱۸۷۵ء کو انجمن کا دسواں اور آخری مشاعرہ منعقد ہوا۔ دس مشاعروں کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان میں سے بھی آخری چار مشاعرے وہ خاص اہمیت اور توجہ حاصل نہیں کر سکے تھے جو ابتدائی مشاعروں کے حصے میں آئی تھی۔ ان مشاعروں کے بند ہونے کے بعد علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہونے والے جلسوں، پروگراموں اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ نظم جدید کی اس تحریک کو استحکام حاصل ہوا۔ سرسید باضابطہ طور پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں نظمیں پڑھواتے تھے اور طلبہ کو بھی مواقع فراہم کرتے تھے۔ سرسید نے کالج میں طلبہ کے اندر اس نئے ادبی رجحان کو پروان چڑھانے کے لیے نیچرل اور قومی شاعری لکھنے اور پڑھنے کا ایک ماحول پیدا کر دیا تھا۔ سرسید کی کوششوں سے شاعری کی نئی فضا اس قدر عام ہو گئی تھی کہ کم گو شعرا بھی عام مضامین نظم کی شکل میں پیش کرنے لگے تھے۔ خطیب اپنی تقریر کے دوران نظمیں پیش کرتے تھے۔ یہ کوئی معیاری اور ادبی اہمیت کی حامل نظمیں نہیں تھیں مگر شاعری کی نئی فضا کو عام کرنے میں ان نظموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ حالی اور آزاد کی نظموں کو نمونۂ عمل سمجھتے تھے اور کسی قدر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اس کے سب سے بڑے محرک سرسید تھے۔ سرسید کی انہی کوششوں سے نظم جدید کا رجحان عام شعری رجحان کی شکل اختیار کر کے بہت قلیل مدت میں شاعری کا غالب رجحان بن گیا۔ سرسید کی کوششوں سے نئے نظم گو شعرا کی ایک نئی پود وجود میں آ رہی تھی اور سرسید کی تربیت کی بنا پر علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج نے ابتدا ہی میں نظم کے بہت سے پرگو اور بڑے شاعر پیدا کر دیے

www.urduchannel.in

تھے۔حالؔی نے اپنی شاہکار تخلیق ''مسدس حالی'' بھی سرسید کی فرمائش پر لکھی اور سرسید نے اس کے محرک ہونے پر نہ صرف فخر کا اظہار کیا بلکہ اسے اپنے لیے توشۂ آخرت قرار دیا۔حالؔی کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا۔کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دوراز کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے۔کیونکر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم نہیں پڑھے جاسکتے۔حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

> ''بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا، میں کہوں گا حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''[۴]

عام طور پر سرسید کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انگریزی حکومت کی ایما پر جدید تعلیم اور انگریزی زبان وادب کو فروغ دیا تھا۔بعض حضرات اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ انگریزوں کی سازش کا حصہ تھے۔سرسید کے بارے میں یہ کہنا اور ایسی فکر رکھنا بہت بڑا ظلم اور بعید از حقیقت ہے۔دراصل سرسید مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے بچانا چاہتے تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کا مقدر بن گیا تھا۔سرسید انگریزی زبان اور جدید تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کو روزگار اور ترقی کے مواقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔سرسید اپنے کام، مقصد اور کوشش میں بالکل مخلص تھے مگر انگریزوں کی کسی قدر حمایت سرسید کو اس لیے حاصل تھی کیوں کہ اس جدید تعلیمی اور انگریزی زبان وادب کے استحکام میں انگریزی حکومت اپنا استحکام دیکھ رہی تھی۔سرسید جدید نوآبادیاتی فضا میں مسلمانوں کو قابل رحم صورت حال سے نکالنے کے لیے مفادات تلاش کر رہے تھے۔اس نئی فضا میں سانس لینا سکھا رہے تھے ساتھ ہی اس میں انگریزوں کے تدابیر بھی پوشیدہ تھے۔سرسید انگریزوں کے لیے کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں تھے اور بڑی حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔سرسید مغربی نظام تعلیم سے بہت متاثر تھے۔یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تاثر ضرورت کے اعتبار سے ہو۔یہ بھی درست ہے کہ ان کے یہاں بعض دفعہ مرعوبیت کی حد تک مغربی نظام تعلیم اور انگریزی زبان وادب پر اصرار ملتا ہے۔مگر اس کے باوجود یہ تحریک اور ان کی

www.urduchannel.in

کوششیں مخلصانہ بنیادوں پر قائم تھیں اور زمانہ شناسی و مصلحت شناسی پر مبنی تھیں۔

سرسید مشرقی تہذیب اور اپنی تہذیبی قدروں سے واقف تھے۔ وہ اس کی عظمت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ حالؔی اور آزادؔ بھی مشرقی تہذیب اور زبان وادب کے پروردہ تھے اور اس کی عظمتوں سے واقف تھے۔ مگر یہ حضرات یہ بھی جانتے تھے کہ زبان وادب اور علوم وفنون کا دائرہ محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ روایت پر اصرار کرنے کے بجائے ان کو بامقصد، حسب حال اور افادی بنانے کو ضروری سمجھتے تھے۔ بعض دفعہ نئی تہذیب اور زبان وادب پر شدید اصرار قدرے بحالت مجبوری تھا اور کسی حد تک حکمراں قوم اور اقتدار کے رعب میں بھی تھا۔ یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ ان حضرات کی کوششوں میں انگریزوں نے اپنی منصوبہ بند سازشیں کرنا اور اپنے مفاد تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اقتدار اور حکومت کا جبر محکوم قوموں پر اپنے غیر معمولی اثرات نقش کرتا ہے۔ محکوم قومیں حاکموں کے تہذیبی، لسانی اور ادبی عظمتوں سے فطری طور پر مرعوب ہونے کی پابند ہوتی ہیں اور حاکم قوم کی ہر بدتہذیبی اور بے ادبی بھی تہذیب اور ادب کے اعلیٰ معیار پر فائز نظر آتی ہے۔ اقبالؔ حاکم کے محکوم پر مرتب ہونے والے اثرات، جبر، رعب، محکوم قوم کی حاکم کے بارے میں نظریاتی تبدیلی اور اقتدار کے جبر کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آبتاؤں تجھ کو رمز آیۂ انّ الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

سرسید کا انگریزی زبان وادب کی پیروی کرنا، نئے نظام ترقی سے ہم قدم ہو کر خستہ، پسماندہ اور انتہائی غربت اور بے سروسامانی کے شکار مسلمانوں کی رہنمائی کرنا اور روایتی تعلیم وادب کی بیڑیوں کو توڑنا ان حالات میں جس میں سر سید قوم کی تعمیر وترقی کا خواب دیکھ رہے تھے، ان کے اس خواب کی تعبیر کے لیے ناگزیر تھا۔ بہرحال ان کی خدمات، کارناموں اور افکار ونظریات کو موجودہ تناظر کے بجائے اس تخریبی عہد کے سماجی اور سیاسی تناظر میں دیکھنا چاہیے تبھی ہم انصاف کر سکتے ہیں۔

سرسید کی ادبی اصلاح اور ادبی کاوشوں سے اردو شعروادب میں جو تنوع اور وسعت پیدا ہوئی ہے اور اردو ادب آج ترقی کی جس معراج پر ہے اس میں ان کا کردار غیر معمولی ہے۔ سرسید نے ادب کے دھارے کو موڑا، اس کو ذہن دیا اور اس کو سماج سے جوڑ دیا۔ اردو شعروادب آج ترقی کی جس بلندی اور عظمت سے ہمکنار ہے اور فکر وخیال کا تنوع موضوعات کا جو بحر بے کراں اس میں موجود ہے، وہ سرسید کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سرسید کی اسی پہل اور اصلاحی

www.urduchannel.in

تحریک کی بنا پر آج اردو ادب دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے ادب کی برابری کرنے پر قادر ہے اور ہر زندہ ادب کی طرح اس میں وسعت اور تنوع موجود ہے۔

حواشی:

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص: ۵۵۵

(۲) جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، ص ۱۶، مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۱۲

(۳) سرسید کا اثر ادبیات اردو پر، علی گڑھ نمبر، علی گڑھ میگزین، مطبوعہ ۵۵-۱۹۴۵، ص: ۲۷

(۴) خطوط سرسید، مرتبہ: سر راس مسعود، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱، ص: ۳۱۲

www.urduchannel.in

محمد فرحان دیوان*

سرسید کا سفر مدرستہ العلوم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تک

سرسید کا نام سنتے ہی ایک تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جس میں ترکی ٹوپی و شیروانی زیب تن کیے ہوئے ایک بزرگ اپنی قوم کو ترقی دینے کے لیے در بدر بھٹک رہا ہے۔ اس کو منزل کی تلاش ہے لیکن راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ نے اس کی فکر میں وہ تڑپ پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں اس کے قلم کی جولانی نے ''اسباب بغاوت ہند'' کی شکل لے لی۔ سرسید احمد خاں کے لیے اتنا کافی نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں کی بے گناہی ثابت کرتے پھریں وہ اپنی قوم کا مستقبل روشن کرنا چاہتے تھے۔ اسی فکر میں دن و رات پریشان رہنے والے اس شخص کو منزل کا اشارہ انگلستان میں ملا جب وہ اپنے فرزند ''سید محمود'' کے ساتھ لندن تشریف لے گیے۔ بقول نواب محسن الملک:

> ''وہاں کے عجائبات کی سیر کی، بڑی بڑی شاپوں کو دیکھا، کارخانوں میں گیے اور وہاں کی لطیف اور خوش نما اور خوش رنگ دل لبھانے والی چیزیں دیکھیں۔ ایسے وقت میں ایک زندہ دل شخص کا دل للچانے لگتا ہے اور بقدر اپنی استطاعت بلکہ استطاعت سے بڑھ کر قرض دام کر کے ان چیزوں میں سے کچھ اپنے لیے کچھ اپنے عزیزوں کے لیے اور کچھ دوستوں کے لیے لیتا ہے۔ سرسید مرحوم جو انگلستان گیے تھے اس وقت نہ ان کے پاس روپیہ تھا نہ دماغ میں جوانانہ خیال، صرف ایک دل تھا جو قومی محبت سے لبریز تھا۔''[۱]

مضمون ''سرسید کا سفر مدرستہ العلوم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تک'' صرف اس لیے لکھ رہا ہوں تا کہ نونہالان قوم کو یہ حقیقت معلوم ہو سکے کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے کتنی مصیبتیں اٹھا کر ہمارے لیے یہ اعظیم الشان دارہ قائم کیا جسے آج پوری دنیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانتی ہے۔ میرا یہ مضمون پورے طور پر دو کتابوں

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

''محمڈن کالج ہسٹری یعنی تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان از سید افتخار عالم'' اور ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی اور اس کے ممبران از ساجد نعیم'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ مضمون میں مختصراً ''مدرسۃ العلوم'' کی تاریخ، سرسید اور ان کے عزیزوں کی جدوجہد کو سادہ سلیس زبان میں تحریر کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگلستان کی سیر اور وہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھ کر سرسید کے ذہن میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا خیال آیا جس میں ہندوستانی قوم کو ترقی کی راہ دکھائی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ پر انھوں نے اپنے بیٹے سید محمود اور چند یورپین ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا اور ان کے سامنے چند تدابیر و تجاویز پیش کیں جو درج ذیل ہیں۔

۱- سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے جو مسلمانوں کے دل میں گھر کر گئی ہے کہ یورپین سائنس اور لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے خلاف ہے۔

۲- خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ یورپین سائنس اور لٹریچر کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے۔

۳- کالج (ادارہ) کے لیے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت موقع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔

۴- مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت، قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول قومی ترقی کا زینہ ہے قائم رکھنا۔ سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں اور مذہبی عقائد ان کو سکھائیں۔

۵- مسلمانوں کو اخوت اسلامی کا سبق دیں اور بتلائیں کہ اخوت اسلامی کیا چیز ہے۔ جو نسبتی اخوت سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔

۶- ہم کو ان میں قومی ہمدردی پیدا کرنا چاہیے۔ قومی ہمدردی کا پیدا ہونا بجز اس کے کہ غول کے غول مسلمان بچوں کو ہم ایک جگہ جمع کریں وہ سب مل کر ایک جگہ رہیں، ایک جگہ پڑھیں اور ایک ساتھ کھائیں۔ اس مطلب کے لیے ہم کو ایک بورڈنگ ہاؤس بنانا چاہیے۔ جس میں کم سے کم ایک ہزار طالب علم رہ سکیں اور ان میں باہمی اخوت اور بھائی بندی پیدا ہو۔

ان تجاویز کے بعد دل میں قوم کا درد لیے سرسید احمد خاں انگلستان سے وطن واپس آگیے۔ ذلیل و خوار ہو رہی اپنی قوم کا علاج انھیں نظر آ گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس کے لیے ''دارالشفا'' بنانے کی کوشش شروع کی۔ ۱۸۷۲ء میں بمقام بنارس چندے کی فراہمی کے لیے ''محمڈن اینگلو اورینٹل فنڈ کمیٹی'' تشکیل کی۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کالج کے لیے چندہ جمع کیا جائے اور جلد از جلد کالج کی بنیاد ڈال دی جائے۔ کمیٹی تشکیل دیے زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا کہ بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کمیٹی نے ۳۰ر جون ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں چندہ وصول کرنے

www.urduchannel.in

کے لیے مقرر کر دیں۔ منجملہ ان سب کمیٹیوں سے ایک کمیٹی علی گڑھ میں بھی مقرر کی گئی جس کے ممبر اور اراکین ''مولوی سمیع اللہ خاں، جناب راجہ سید باقر علی خاں، مولوی مشتاق حسین اور وقار الملک بہادر وغیرہ تھے۔ اراکین مجلس کی کوششیں یہاں تک کامیاب ہوئیں کہ بنارس کمیٹی اسی سال مدرسہ قائم کر سکتی ہے لیکن جگہ کا مسئلہ درپیش تھا کہ مدرسہ کہاں قائم کیا جائے۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد ۸/نومبر ۱۸۷۲ء کے مبارک جلسے میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ''مدرستہ العلوم'' علی گڑھ میں بنایا جائے۔

ابتدا میں مولوی سمیع اللہ خاں نے ''مدرستہ العلوم'' کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا افتتاح ایک معمولی مکان میں ہوا تھا لیکن ۱۰/جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں کمیٹی نے مدرسہ سے متعلق متعدد تجویزیں منظور کیں۔ دو تجویزیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱- علی گڑھ میں جو زمین پرانی چھاونی فوج کی بیکار پڑی ہے۔ تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ سے لی جائے۔

۲- سکریٹری یعنی سرسید کو اجازت دی جائے کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں مدرسہ کا کام شروع کریں مگر تعمیر میں سرمایۂ مدرسہ کا روپیہ خرچ نہ ہو۔

پہلی تجویز کے مطابق سرسید حکومت برطانیہ سے زمین کی اجازت لینے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے تمام ممبران کمیٹی کو ۱۹/مارچ ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے زمین دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ جس کی تجویز ۱۰/جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں ہوئی تھی۔

زمین ملنے کی رپورٹ جارج ہنری لارنس صاحب بہادر کلکٹر ضلع علی گڑھ نے کی تھی۔ لیکن اسی زمین کے نزدیک جسے حکومت ہند نے اپنی خسروانہ عنایت سے مرحمت فرمایا تھا اس سے متصل چار بنگلے دوسرے اشخاص کی ملکیت تھے جن کا خریدنا لازمی تھا۔ بالآخر تمام اراکین کمیٹی اور بالخصوص مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی سعئ جمیلہ اور شبانہ روز محنت و مشقت کے بعد ۴/اکتوبر ۱۸۷۴ء کو چاروں بنگلے خرید لیے گیے۔

جب زمین کی طرف سے کامل اطمینان ہو گیا تو ۲۵/فروری ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں بنارس صدر کمیٹی نے علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولنا منظور کر دیا۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل ریزولیشن پاس ہوئے:

> ''تعلیم ابتدائی کا مدرسہ جاری کیا جائے اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ اس بات کی تجویز پیش کریں کہ اس تعلیم کے لیے کس قدر مدرس اور کس کس علم و زبان کے درکار ہوں گے اور کیا کیا ان کی تنخواہیں مقرر کرنا ضروری ہوں گی۔''[۲]

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے بنارس کمیٹی کے حکم سے لازم رپورٹ بھیجی اور تمام اخراجات ماہوار تجویز

www.urduchannel.in

کیے۔ کمیٹی بنارس نے ۱۸/اپریل ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں یہ خرچ دینا منظور کرلیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو لکھا کے یکم جون ۱۸۷۵ء سے مدرسہ جاری کریں اور اس کا اشتہار اخبار میں دے دیں۔ لیکن ۲۰/مئی ۱۸۷۵ء کو اجلاس میں اسی کمیٹی نے جو بنارس میں صدر کمیٹی کے نام سے تھی انھوں نے مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ تبدیل کرتے ہوئے ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء بروزِ سالگرہ ملکہ معظّمہ قیصر ہند قرار دی۔ تاریخ مقررہ پر سرسید احمد خاں اپنے چند رفیقوں کے ہمراہ بنارس سے علی گڑھ تشریف لائے اور مدرسہ کا افتتاح کیا۔

مدرستہ العلوم کے ابتدائی دور میں طلبہ کی قلیل تعداد ہونے کے ساتھ ساتھ رہائش کا بھی معقول انتظام نہیں تھا۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ طلبا کی آمد شروع ہوگئی۔ سرسید اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

> ''متعدد درخواستیں رئیسوں کے لڑکوں کے داخل کرنے کے لیے متعدد اضلاع سے کمیٹی کے پاس آئی ہیں جناب عالی مختار الملک سر سالار جنگ کی مرضی بھی پائی جاتی ہے کہ کچھ لڑکے خاندان حیدرآباد کے تعلیم کو یہاں آئیں مگر افسوس ہے کہ بورڈنگ ہاؤس اس قدر کافی نہیں ہے کہ کمیٹی ان سب کو آنے کی اجازت دے۔''[۳]

رفتہ رفتہ مدرسہ کی ہر ایک چیز میں ایسی تیزی پیدا ہوتی گئی کہ بہ فضلہ تعالیٰ مدرسہ کی ہر ایک چیز کی شکل تبدیل ہونے لگی۔

''مدرستہ العلوم'' کے افتتاح کے بعد اصل مسئلہ اسے چلانے، ترقی دینے اور طلبا کو سہولت فراہم کرنے کا تھا۔ لہٰذا سرسید احمد خاں نے قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے خود چندہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۴/مئی ۱۸۷۳ء بروز شنبہ کو سکریٹری خزینتہ البضاعتہ مع چند بزرگان قوم کے نواب سید ولایت علی خاں، جناب مولوی سید ابوسعید، جناب مولوی سید شمس الہدیٰ کی کوششوں سے پٹنہ پہنچے۔ آٹھ بجے دن کے پٹنہ کالج کے بڑے حال میں ''جناب اے سی بیلی'' کمشنر دیگر حکام یورپین کے جلسہ میں رونق افروز ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے جلسہ میں بہت ہی عالمانہ تقریر کی جس میں ہندوستان کی قابل نفرت جاہ وحشمت اور بے مصرف فیاضیوں کا ذکر کر کے انگلستان کی مفید فیاضیوں کا تذکرہ کیا، بے علمی کی مذمت کی، ہندوستان و انگلستان کی تعلیم کا مقابلہ کیا، علم قدیم اور علم جدید کا فرق بتایا، اہل ہند کے خیالات اور تحصیل علم کو نہایت عمدگی سے بیان فرمایا۔ سرسید احمد خاں کی گفتگو کا گیارہواں پیراگراف یہاں نقل کیا جارہا ہے تاکہ قارئین اس کو ملاحظہ فرمائیں اور عبرت حاصل کریں:

> اے عزیزو! اپنے باپ دادا کی عزت و بزرگی وحشمت و دولت پر ناز کرنا

www.urduchannel.in

بہت بڑی غلطی ہے۔نہایت تجربہ کار ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ’’دو چیز در دو چیز راست تیاد ید ذکر تونگری درفقیری و ذکر جوانی در پیری‘ ہمارے باپ دادا اگر بہت بڑے عالی قدر تھے اور ہم نہیں ہیں تو ہم کو اس پر ناز نہیں کرنا چاہیے بلکہ رونا چاہیے کہ ہم اپنے بڑوں کا نام ڈبونے والے پیدا ہوئے۔ اگر اولاد اور قوم کی تعلیم وتربیت اسی طرح پر ہو کہ جس زمانے میں وہ لوگ اپنی زندگی بسر کریں گے۔اس زمانے میں مناسب لیاقتیں ان میں پیدا ہوں تو ضرور اگلے خاندانوں کا نام برباد ہو جائے گا۔‘‘ ۴

سرسید احمد خاں آگے فرماتے ہیں:

’’نواب خلیل اللہ خاں شاہ جہانی کا آپ لوگوں نے نام سنا ہوگا ان کے پڑپوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔تغلق آباد کے گاؤں میں جس طرح مسلمان گھسیرے آباد ہیں جو سارے دن گھانس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطنت محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد ہیں۔پس اگلے بزرگوں پر فخر نہ کرنا ایسی حالت میں کہ ہم کچھ نہیں ہیں کیا فائدہ ہے۔‘‘ ۵

مدرستہ العلوم نے جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کی تو اس میں تمام طرح کے بدلاؤ کیے جانا ضروری ہو گئے قانونی لحاظ سے بھی اور تعلیم وتربیت کے اعتبار سے بھی۔اسی ذیل میں کالج کی تعلیم وتربیت اور رکھ رکھاؤ میں خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں۔مثلاً محمڈن کالج علی گڑھ میں عام علوم کے علاوہ جو گورنمنٹ کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے چند اور ایسے مفید و کارآمد علوم سکھائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ہم کو فخر کے ساتھ اس بات کے کہنے کا حق حاصل ہے کہ ’’محمڈن کالج‘‘ بہ نسبت دوسرے کالجوں کے ایک ممتاز کالج ہے۔جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی، مذہبی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

مدرستہ العلوم جس وقت سے قائم ہوا بلکہ قائم ہونے کے قبل ہی اس کے بانی سرسید احمد خاں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے یہ امر ضروری ہے کہ دنیاوی علوم کے ساتھ ان کی مذہبی تعلیم اور مذہبی تربیت بھی برقرار رہے۔کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر مسلمان تمام دنیا کے علوم وفنون کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کر لیں اور اعلیٰ درجہ کی سولائیزیشن تک ترقی کر لیں اور اپنے دین ومذہب سے ناآشنا رہیں تو ایسی علمی ترقی اور اعلیٰ درجہ کی

www.urduchannel.in

سولائیزیشن کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔سرسید احمد خاں کہتے ہیں:

''اس بات کی خوشی کہ مسلمان مختلف علوم وفنون میں ترقی کریں اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ دنیاوی علوم کے ساتھ مذہبی تعلیم وتربیت میں بھی وہ ترقی کریں۔''[۶]

ان ہی خیالات کے زیر اثر مدرستہ العلوم کے ہر ایک مسلمان طالب علم پر مذہبی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔خصوصاً جن طلبا کی نگرانی منتظمین مدرستہ العلوم کے حوالے کی گئی تھی یعنی جو مسلمان طالب علم ہاسٹلر تھے ان کے نماز روزہ کی پابندی سختی سے کرائی جائے۔ایسی بیش بہا تعلیم کا جو اثر طلبا پر پڑتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں دہریت، لامذہبیت یا نیچریت کا غلبہ طاری نہیں ہوتا۔

سرسید احمد خاں نے ادارے کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے قومی مقصد کو ہمیشہ ترجیح دی۔انھوں نے محمڈن اینگلواورینٹل کالج کے ہاسٹل میں قیام کرنے والے طلبا کی سہولت، ان کی حفاظت اور ڈسپلن کے لیے قواعد بنائے اور انھیں سختی سے برتنے کے لیے انتظامیہ کو سخت ہدایات بھی دیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں ڈسپلن کے اوپر کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔اسی وجہ سے کالج میں کچھ حادثات بھی ہوئے۔طلبا جس طرح چاہتے تھے اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لڑکے مہینوں اسکول نہیں جاتے تھے اور کسی استاذ کی یہ مجال نہیں کہ وہ انھیں اسکول جانے کے لیے مجبور کرے۔۱۸۷۶ء کے بعد انتظامیہ نے ایسی سختی کی کہ طلبا برادری کی نازیبا حرکات میں بہت حد تک کمی آئی۔

کالج کے افتتاح کے بعد جیسا کہ مذکور ہوا کہ چند برس تک وہاں کے حالات اچھے نہیں تھے طلبا قواعد کو نہیں مانتے تھے، نازیبا حرکات کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے والدین اور بزرگوں کو شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔لیکن انتظامیہ کی سختی اور بیش بہا کوششوں کی وجہ سے کالج کے لڑکوں میں حیا، ادب، جوانمردی، خودداری اور معتدل آزادی پیدا ہوگئی۔

سرسید احمد خاں نے کالج کے ضروری انتظامات کرنے کے بعد اہم کام یہ کیا کہ کالج میں ہی لڑکوں کے لیے شفا خانہ کا بھی انتظام کر دیا۔شفا خانہ کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہاں کے اسسٹنٹ ڈاکٹر کے پاس ایک ڈائری رہتی تھی جس میں بیمار طلبا کے نام درج ہوتے تھے۔وہ ڈائری روز پرنسپل، سول سرجن اور ہیڈ ماسٹر کے پاس دستخط کے لیے بھیجی جاتی تھی۔ہر مہینہ میں ایک مرتبہ ہاسٹل کے طلبا کا وزن ضرور کیا جاتا تھا تاکہ ان کی صحت کا صحیح طرح سے خیال رکھا جا سکے۔

طلبا کے لیے سرسید احمد خاں نے ہاسٹل میں ہی ڈائنگ ہال کا انتظام کیا تھا۔جس میں کالج کے تمام طلبا بیٹھ کر نہایت سلیقہ سے کھانا کھاتے تھے۔صاف صفائی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا تاکہ بچوں کو عمدہ کھانا کھلایا جا سکے۔میزوں پر سفید چاندنیاں لگائی جاتی تھیں۔کالج کے چند طالب علم فوڈ مانٹری کرتے تھے۔ان کا کام تھا کہ وہ کھانے کی کمی بیشی

www.urduchannel.in

اورصاف صفائی کا خیال رکھتے ہوئے کھانا کھلانے تک ڈائنگ ہال میں موجود رہیں۔

خلاصۂ کلام کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید نے اپنی پوری زندگی قوم وملت کو بیدار کرنے اور ترقی دینے میں گزار دی۔انھوں نے مدرستہ العلوم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تک کا سفر طے کیا، بے پناہ مصیبتیں اٹھائیں،قوم کی جانب سے غدار قوم اور گمراہ وکافر جیسے کریہہ القاب سے انھیں نوازا گیا باوجود اس کے ان کے پایۂ ثبات کو لغزش نہیں آئی۔انھوں نے اپنی قوم کو ترقی کا وہ زینہ عطا کیا جس کی بلندیوں پر چلتے ہوئے ان کے رفقا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں روشن مینار قائم کیا۔اوراس طرح انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی اور انگلستان کی تعلیمی فضا سے متاثر ہوکر جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کو ہندوستان میں ایک عظیم تعلیمی ادارہ (مدرستہ العلوم) قائم کرکے عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے۔دنیا سے رخصت ہونے سے قبل اپنا درد کچھ یوں بیاں کر گیے:

ہم نے سوکھی ہوئی شاخوں پہ لہو چھڑکا تھا
پھول اگر اب بھی نہ کھلتے تو قیامت ہوتی

حواشی:

(۱) محمڈن کالج ہسٹری یعنی تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان، جناب سید افتخار عالم صاحب، اولڈ اسٹوڈنٹ محمڈن کالج، ۱۹۰۱ء مفید عام آگرہ، ص: ۷-۸

(۲) ایضاً، ص: ۲۷

(۳) ایضاً، ص: ۲۸

(۴) ایضاً، ص: ۸۹

(۵) ایضاً، ص: ۹۰

(۶) ایضاً، ص: ۱۱۹

www.urduchannel.in

حنا فردوس*

اردو سفرنامہ اور سرسید کا مخصوص زاویۂ فکر
(’مسافران لندن‘ کے حوالے سے)

تاریخ وادب میں سفر کو وسیلۂ ظفر کہا گیا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سفر انسانی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی کا اہم ذریعہ ہے اور نئی دنیاؤں کی سیر سے انسان مرتبۂ کمال کو پہنچتا ہے بقول شاعر:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

سفر انسانی سرشت میں داخل ہے، ابتدائے زمانہ سے تا حال ہر دور میں اسے سفر کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ ذوق سیاحت، صنعت وحرفت، تعلیم وتجارت ودیگر ضروریات ومقاصد کی حصول یابی کے لیے وہ نئے مقامات کا سفر طے کرتا ہے، مختلف تجربات ومعلومات اور نصیحت وعبرت سے روشناس ہوتا ہے اور دوسرے شہر کے حالات سے رفقا کو متعارف کرانے کے لیے جب وہ اپنے تجربات ومحسوسات کو تحریری جامہ پہناتا ہے تو دنیائے ادب میں اس کا یہ عمل سفرنامہ نگاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تحقیق ومطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادب میں سفرنامہ کا باقاعدہ آغاز ۱۹ویں صدی (عجائبات فرنگ) میں ہوا اور رفتار زمانہ کے ساتھ اس صنف کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ دور حاضر میں سفرنامہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے جنھوں نے بے شمار سفرنامے قارئین کی نذر کیے، گرچہ ان پر گفتگو اور مطالعے کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہے، لیکن ان سب سے قطع نظر یہاں بحث طلب موضوع ’’مسافران لندن‘‘ میں سرسید کا مخصوص زاویۂ فکر ہے۔ ’’مسافران لندن‘‘ بالغ نظر، ذہن رسا اور مایۂ ناز شخصیت سید احمد خاں کی اس دور کی تخلیق ہے جب ملک وقوم کی

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

حالت دگرگوں تھی۔ انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے بیچ نفرت اور غم و غصے کا بازار گرم تھا۔ سرسید کا یہ سفرنامہ ہندوستان کو ان برے حالات سے نکالنے اور ملک وملت کی ذہنی بیداری اور فلاح و بہبود کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ مصلح قوم، مفکر اسلام اور خیرخواہ ہندوستان سرسید نے انگریز حاکم سر ولیم میور کی بے بنیاد اور بیہودہ کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کی تردید کرتے ہوئے، اس کا مدلل جواب لکھنے کے لیے مواد کی فراہمی و طلب علمی کی بابت یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کا رخ کیا، جس کے لیے انھیں بہت سی ذہنی، جسمانی، معاشی و دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر ان مصائب کا انھوں نے پامردی سے مقابلہ کیا اور تمام رکاوٹیں ان کے شوق بے پایاں اور قوت ارادی کے آگے بے حیثیت ہو کر رہ گئیں۔ سرسید کے بلند عزائم نے ان کے پائے استقلال میں ایک لمحے کے لیے بھی جنبش نہ ہونے دی، وہ مسلسل اور مستقل آگے بڑھتے گئے اور منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ سرسید ملک وقوم کی بدحالی اور ناکامی سے بیحد متفکر تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کا ہر فرد اعلیٰ و جدید تعلیم سے بخوبی واقف ہو اور ملک کے تئیں اپنی ذمہ داری اور فرائض کو پہچانے، مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لے اور ملک میں خوشگوار تبدیلی لانے کے لیے ہمہ وقت متحرک اور کوشاں ہو۔ سرسید نے ''مسافران لندن'' میں انگریزی حکومت کے مکمل حالات و واقعات، تعلیمی نظام اور اسباب ترقی کا باریکی سے جائزہ لیا اور ان سب کا موازنہ ہندوستان سے کر کے اپنے تاثرات کا واضح اظہار کیا ہے جس سے ان کی علمی بصیرت اور فکری دانشمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالرحیم قدوائی:

> ''مسافران لندن کے امتیازات متعدد ہیں ان میں سرفہرست سرسید کی علم و دانش کی مخلصانہ جستجو اور حصول کی سعی پیہم ہے۔ انھوں نے ایک درّاک جویائے علم کے طور پر برطانوی طرز معاشرت، بالخصوص نظام تعلیم کا بغائر مطالعہ کیا، اپنے مشاہدات کی بنیاد پر بکمال فراست اپنے نتائج مستنبط کیے اور اہم تر حقیقت یہ کہ اس مطالعے اور محاکے کی روشنی میں بے سمت، زوال کے شکار مسلمانان ہند کے بہتر، روشن مستقبل کے لیے ایک عملی، علمی اور فکری لائحہ عمل مرتب کیا۔''[۱]

سرسید کا سفر لندن علمی نوعیت کا تھا، لہٰذا انھوں نے ''مسافران لندن'' میں انگلستان کے مختلف تعلیمی اداروں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، لائبریریوں اور ادبی مجلسوں کا بغور مشاہدہ کیا، ان کی تعلیمی ترقی، ذہنی بیداری، معاملہ فہمی، دوراندیشی، خودشناسی اور تحرک پسندی نے سرسید کو بے حد متاثر کیا۔ مغربی طرز کی اعلیٰ و جدید تعلیم و تربیت کو وہ ہندستان میں بھی قائم کرنا چاہتے تھے، اس کی اہمیت و افادیت سے ہندوستانیوں کو متعارف کرا کر انھیں راہ ارتقاء کی طرف

www.urduchannel.in

گامزن کرانا چاہتے تھےاور ''مسافران لندن'' میں سرسید کے ان خیالات کی واضح ترجمانی ملتی ہے۔خواب غفلت میں سوئی ہوئی قوم کوان کی جہالت اور بے حسی کا احساس دلاتے ہوئے سید احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''جولوگ حقیقت میں ہندستان کی بھلائی اور ترقی چاہتے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندستان کی بھلائی صرف اس پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں انھیں دیے جائیں۔میری یہ رائے ہندستان کے ہمالیہ کی چوٹی پر بڑے بڑے حروف میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دیے جائیں۔اگر تمام علوم ہندستان کو اسی زبان میں نہ دیے جائیں گے تو کبھی ہندستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔یہی سچ ہے۔یہی سچ ہی۔یہی سچ ہے۔''[۲]

''مسافران لندن'' میں سرسید ایک ایسے سفرنامہ نگار کے طور پر نظر آتے ہیں جنھوں نے حالات و واقعات کا تجزیہ کر کے نہ صرف اپنے تاثرات کو بیان کیا ہے بلکہ معلومات کا ایک ایسا نادر ذخیرہ فراہم کیا ہے جس کو پڑھ کر اور اس پر عمل پیرا ہو کر قاری کی علمی جستجو،فکری بالیدگی اور ذہنی وسعت میں اضافہ ہونا فطری بات ہے۔ہندستانیوں سے مخاطب ہوتے وقت سرسید کا منطقی انداز قاری کے سامنے حقائق کو اجاگر کرتا ہے۔سرسید کے نزدیک قاری کو حالات و واقعات اور جذبات و تاثرات سے محض واقف کرانا کافی نہیں تھا، بلکہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو پس ماندگی اور زوال سے نکالنے کے خواہاں تھے اور روشن مستقبل کے لیے انھیں عملی قدم اٹھانے کی بھی ترغیب دیتے تھے۔سفرنامہ میں سر سید فطری نہیں بلکہ فکری سیاح کے طور پر نظر آتے ہیں،جنھیں ملک وقوم کی اصلاح کو لے کر اپنے فرائض کا بخوبی احساس تھا۔ان کا ایک ایک قدم اور ہر ایک عمل صرف اور صرف ہندوستان کی بھلائی کے لیے تھا۔دوران سفر سرسید ایک لمحے کے لیے بھی اپنے مقصد سے غافل نہیں ہوئے۔خالد محمود کے الفاظ میں:

> ''سرسید ایک مصلح قوم تھے۔قوم کی ترقی،شادمانی،خوشحالی اور کامرانی کی فکر انھیں ہر دم بے چین رکھتی تھی،وہ اپنی قوم کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے.....اسی فکر نے انھیں لندن میں بھی بے چین رکھا اور وہاں وہ ہمہ وقت قومی مسائل پر غور وخوض کرتے رہے۔''[۳]

سرسید نے لندن کے سیاسی،سماجی،مذہبی اور تعلیمی جیسے مختلف شعبہ ہائے زندگی کا جائزہ لیا،وہاں کے داخلی اور خارجی تمام تر پہلوؤں کا مطالعہ کیا،وہاں کی تہذیب ومعاشرت،مذہب وعقائد،علوم وفنون،صنعت وحرفت غرض ہر

www.urduchannel.in

اس نقطہ پر نگاہ ڈالی جو حکومت انگریزی کے خوشگوار حالات کے اسباب تھے۔ابتدائے سفر سے لے کر لندن پہنچنے اور دوران قیام تک کے تمام مراحل و مواقع پر سرسید کے فکری رویہ کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔سرسید نے لندن کے خوبصورت و سحر زدہ ماحول میں گم ہو کر مناظر کی تصویر کشی و ترجمانی میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ تقاضائے وقت کے پیش نظر ملک و قوم کے حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بالخصوص لندن کے اعلیٰ و جدید طریقۂ تعلیم پر توجہ دی اور حاصل کردہ تجربے کی بنا پر اقوام کو مفید مشوروں سے نوازا۔سرسید کی یہ انفرادیت ہے کہ انھوں نے مروجہ سفرنامہ نگاری کی روایت سے ہٹ کر جدید اور اعلیٰ خیالات کو پیش کیا اور سفر نامہ کو ایک نئی جہت اور فکر سے متعارف کرایا۔ ''مسافران لندن'' کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سفرنامہ کسی ملک کے تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی حالات سے واقفیت اور تفریح طبع کا نہ صرف ایک بہتر ذریعہ ہے بلکہ اس میں مثبت، صحت مند، کارآمد خیالات اور سنجیدہ موضوعات کو پیش کر کے ملک و قوم کی رہنمائی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

اسلوب بیان اور طریقۂ اظہار کے اعتبار سے بھی سرسید اپنی مثال آپ ہیں۔ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ بہت ہی جامع اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ان کی باتیں اترتی چلی جاتی ہیں۔بات کو گھما پھرا کر پیش کرنے کے بجائے براہ راست اور مدلل انداز میں بیان کرنا سرسید کی تحریر کا خاصہ ہے۔''مسافران لندن'' کا یہ اقتباس بطور مثال ملاحظہ ہو:

> ''اے میرے ہموطنوں! بتاؤ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم، جو حیوانوں کی طرح اپنی خودغرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے اور مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔''[۴]

سرسید کا طرز فکر، خطیبانہ انداز، مؤثر لب و لہجہ، سنجیدہ و علمی زبان، چست درست جملے اور خوبصورت پیرایۂ بیان نے سفرنامے کے حسن اور قاری کی دلچسپی میں اہم اضافہ کیا ہے۔سرسید کے انداز نگارش کی وضاحت کرتے ہوئے خالد محمود لکھتے ہیں:

> ''ان کا اسلوب سادہ سلیس اور حقیقت پسندانہ خطاب بن گیا، جس میں تلقین، تنبیہ اور تکرار سبھی کچھ شامل ہے اور جس سے وہ بار بار قوم کو مخاطب کرتے ہیں، لیکن اس تلقین اور تاکید میں ان کے دل کا درد اور خلوص صاف پہچان لیا جاتا ہے۔''[۵]

www.urduchannel.in

گویا مصنف کے منفرد افکار وخیالات، دلی کیفیات، ذاتی محسوسات اور کامیاب و موثر انداز بیان کے باعث ''مسافران لندن'' کو اردو سفرناموں کی طویل فہرست میں بلاشبہ امتیازی مقام حاصل ہے۔

○

حواشی:

(۱) تہذیب الاخلاق، جشن سرسید، خصوصی پیشکش۔۱، ۲۰۱۷ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص:۱۸۲

(۲) مسافران لندن، سرسید احمد خاں، مرتب: اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، ۱۸۶۹ء، ص:۱۹۷-۱۹۸

(۳) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۳

(۴) مسافران لندن، سرسید احمد خاں، مرتب:۔اسماعیل پانی پتی، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۸۶۹ء، ص:۱۷۴

(۵) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۴

www.urduchannel.in

ریاض احمد*

سرسید کا تصورِ تعلیم

سرسید احمد خاں کا شمار انیسویں صدی کی ان عہد ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی طور پر قیادت فرمائی بلکہ اس سے کہیں زیادہ ان کی سماجی، مذہبی، ذہنی، فکری، تہذیبی اور تعلیمی میدان میں بھرپور رہبری و رہنمائی فرمائی ہے اور ان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں جہاں کہیں بھی انھیں ذرّہ برابر کجی دکھائی دی سرسید نے اسے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے دور کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ بالخصوص انگریزی اور جدید سائنسی علوم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلانا اور اس کے حصول کے لیے ایک منظّم لائحہ عمل تیار کرنا سرسید کا ایک ایسا لازوال کارنامہ ہے جسے علمی و ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حالات نہایت ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ تعلیم کے شعبے میں بھی وہ دوسری قوموں کی بہ نسبت حاشیے پر تھے اور ان کی سماجی حیثیت تو بالکل نہ کے برابر تھی۔ انھیں سماج و معاشرے میں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں تھا جو دوسری قوموں کو تھا۔ سرسید ان تمام باتوں کو سوچ کر بہت زیادہ کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو گمنامی، پستی و انحطاط اور ذلّت بھری زندگی سے نکالنے، انھیں توہم پرستی سے باز رکھنے، سیاسی اور سماجی اعتبار سے انھیں ایک بلند ہمت اور زندہ قوم میں ڈھالنے کے لیے جدید تعلیم کو بطورِ آلہ استعمال کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مدارس قائم کیے اور ایسے کالج کی بنا ڈالی جس کا تعلیمی نظام آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے ہم پلّہ رہا لیکن اس حقیقت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا مقصد محض مسلمانوں کو ڈگریاں تقسیم کرنا تھا اور نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا کالج سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی حکومت کی دستبرداری میں مصروف ہو جائیں۔

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

سرسید تعلیم سے محض لکھنا پڑھنا اور سیکھنا مراد نہیں لیتے تھے بلکہ وہ تعلیم کو اخلاقی بلندی اور ذہنی کشادگی کا ایک بہترین وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہاں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر (۱۸۹۷ تا ۱۹۰۲) سر ولیم میکورتھ ینگ کی تقریر کا ایک اقتباس نقل کرنا بے جا نہ ہوگا جو انھوں نے ایم.اے.او. کالج کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر کی تھی اور جس سے سرسید نے کلّی طور پر اتفاق رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔

''ان کی ڈگریاں اس بات کے لیے ہیں کہ وہ اپنے یومیہ معاملات اور گفتگو میں معجز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں سوشل انتظام اور اپنے ہم جنسوں کی بہبودی کے قائم رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے برآوردہ شہریوں کے فرائض انجام ادا کرتے رہیں۔''[۱]

سرسید کے نزدیک تعلیم ایک ایسا جوہر ہے جس سے انسان میں زبردست تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے انسان کے اندرون میں پوشیدہ صلاحیتیں نکھرتی چلی جاتی ہیں۔ سرسید کا خیال ہے کہ کوئی انسان کتنا ہی نیک دل کیوں نہ ہو جب تک وہ عمدہ تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتا، اس وقت تک اس کی ہر خوبی اور اس کا ہر کمال اس کے اندر چھپے رہتے ہیں اور اس کی شخصیت کی سچّی تصویر ابھر کر سامنے نہیں آپاتی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جہالت، تعصب اور تنگ نظری کو دور کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سرسید نے فرمایا:

''میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں خوبیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں جرأت مندی اور بے باکی پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں قومی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان میں صبر وقناعت بھی ہے پر بے موقع پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی مفید ہوں۔''[۲]

یہ سچ ہے کہ سرسید پوری زندگی ہندوستانی مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی طرف رغبت دلاتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ انھوں نے انھیں مذہبی تعلیم کے حصول سے منہا کر دیا۔ البتہ ایک بات بالکل واضح تھی کہ وہ اس وقت کے مروجہ مذہبی تعلیم کے نصاب سے بالکل مطمئن نہیں تھے وہ چاہتے تھے کہ ہماری مذہبی تعلیم کا نصاب کلّی طور پر نہ صحیح مگر جزوی طور پر جدید علوم وفنون سے ضرور مطابقت رکھتا ہو۔ اس بات کی وضاحت سرسید کے اس مقالے سے بھی ہو جاتی ہے جسے محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے:

''ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سرسید کے خیال میں یہ بھی ضروری

www.urduchannel.in

ہے کہ ان کو جدید علوم وفنون کی فائدہ مند تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ کریں اور مذہبی تعلیم کے لیے ذی علم اور ذی فہم اصحاب یکجا جمع ہوں اور بحث ومباحثے کے بعد وہ ایسا نصاب مرتب کریں جو بلحاظ حالات زمانہ اور بنظر علوم وفنون جدیدہ مطابقت رکھتا ہو اور جو پرانی دقیانوسی تعلیم سے مختلف یعنی ترمیم شدہ ہو۔ ضروریاتِ وقت کے موافق ہو اور جو مذہبی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو۔''[۳]

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کو ان کے پڑھنے اور بولنے والوں سے حیات ملتی ہے۔ اور وہی زبانیں طویل عرصے تک زندہ رہتی ہیں جنھیں عوام کے ساتھ ساتھ حکومت کی بھی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جس زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی وہ انگریزی زبان تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کا حصول صرف تعلیمی ترقی کی خاطر نہیں بلکہ سیاسی، معاشی اور مذہبی اعتبار سے مستحکم بننے کے لیے بھی سخت ضروری ہے۔ وہ ہمہ وقت یہ سوچ کر بے حد متفکر رہا کرتے تھے کہ آخر مسلمان انگریزی تعلیم سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ سرسید کا اس بات پر یقین کامل تھا کہ انگریزی تعلیم کے حصول سے مسلمانوں کے عقائد اور مذہبی امور میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑے گا۔ اس ضمن میں ''سرسید کے آخری مضامین'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ حقیقت ہے کہ مسلمان انگریزی زبان سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کا بڑا گروہ خصوصاً علمائے وقت انگریزی کی تعلیم کو اسلام کے منافی تصور کرتے ہیں۔ سرسید نے اس خیال کی تردید میں کہا کہ اکثر ثقہ لوگ انگریزی پڑھے لکھے طبقے کو بدعقیدہ یا دہریہ کہتے ہیں۔ یہ خام خیالی ہے مگر میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی مطلق نہیں جانتے لیکن بدعقیدہ ہیں۔ سرسید نے مزید کہا کہ جو علمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے میں مسلمانوں کے ایمان پر خلل پڑتا ہے ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام میں اور دنیاوی عزت میں کوئی تناقض نہیں ہے۔''[۴]

تعلیم کے سلسلے میں سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صرف دینی مدارس ہی نہیں قائم کیے بلکہ ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ایسے کالج کی بنیاد ڈالی جہاں جدید سائنسی علوم پر مبنی تمام علوم کا مکمل

www.urduchannel.in

انتظام وانصرام ہو۔سرسید کا اس طرز کے کالج کو قائم کرنے کے پس پشت صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان جدید علوم وفنون سے آراستہ ہوکر دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل بن سکیں۔ظاہر ہے سرسید نے یہ فیصلہ اس وقت لیا جب مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ خاص کر علما حضرات جدید سائنسی علوم وانگریزی وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔لیکن سرسید نے ان تمام Challanges کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور ان تمام مشکلات کے باوجود بھی اپنے مقصد کی تکمیل کی طرف مسلسل بڑھتے رہے۔چنانچہ سید محبوب شاہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہولناکیاں اور ان کے بھیانک نتائج کو بہ چشم خود دیکھا تھا اور یہ جائزہ لیا تھا کہ انگریزی قوم سے ہندوستانیوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کی غلامی کے دور میں بہتری اور خوش حالی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ جدید علوم کی تحصیل ہے۔یہ کام زیادہ طویل اور مشکل ترین اس وجہ سے اور ہوگیا کہ ہندوستان کے لوگ خصوصاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور خاص کر بعض علما انگریزی علوم کے سخت خلاف ہوگئے اور ان کو اسلام خطرے میں نظر آنے لگا۔لیکن سرسید نے دشواریوں اور مشکلات سے ہمت ہارنے کے بجائے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔''۵

سرسید احمد خاں نے جب ہندوستانی مسلمانوں کے مابین جدید علوم کی ترویج واشاعت کا بیڑا اٹھایا تو اس وقت انھیں سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا ہندوستانی علما،مفکر اور شاعروں کی طرف سے کرنا پڑا،ان میں مولوی علی بخش خاں،مولوی امداد علی اور مشہور شاعر اکبرالہ آبادی وغیرہ پیش پیش رہے۔ان حضرات نے ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سرسید کو کسی قسم کا مالی تعاون نہ کریں اور نہ ہی اپنے بچوں کا داخلہ محمڈن اورینٹل کالج میں کروائیں۔ہندوستان کے اس اشرافیہ طبقے کے مسلسل حملے کے باوجود بھی سرسید ہمت نہیں ہارتے ہیں بلکہ اس حملے کے جواب میں اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرکے اس میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی وکالت شروع کردی۔سرسید کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان جدید سے جدید تر علوم حاصل کریں اور اخلاقی طور پر بہتر ہوں۔مسلمانوں میں سائنسی علوم رائج کرنے اور ان میں تحقیقی شوق پیدا کرنے کی خاطر ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔اس کے تحت مختلف سائنسی علوم مثلاً ریاضیات، معاشیات،سیاسیات،زراعت،منطق،جغرافیہ،طبقات الارض اور فلسفہ جیسے اہم موضوعات پر بڑے پیمانے پر کتابوں کا سادہ وسلیس اردو زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔تاکہ مسلمانوں کی نسل نو کی بہتر ڈھنگ سے تعلیمی آبیاری کی جاسکے اور وہ ان

www.urduchannel.in

کتابوں میں موجود افادی علوم سے بھرپور استفادہ کریں اور ایک ذی علم شہری بن کر ملک وقوم کا نام روشن کریں۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سرسید نے جدید علوم وفنون کی وکالت کرکے اور مسلمانوں میں اس کی رغبت دلا کر انھیں بہت حد تک گمنامی، پستی وانحطاط اور ذلت بھری زندگی گزارنے سے بچالیا۔

حواشی:

(۱) سرسید کے آخری مضامین، مرتبہ: امام الدین وامام مخدومی، مطبع کوآپریٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۸

(۲) ایضاً، ص: ۲۳

(۳) مقالات سرسید، پنجم، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۴۷

(۴) سرسید کے آخری مضامین، مرتبہ: امام الدین وامام مخدومی، مطبع کوآپریٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۳۶

(۵) سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، ڈاکٹر محبوب شاہ، خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی ۲۰۰۰ء، ص: ۴۸

www.urduchannel.in

عبدالرازق*

سرسید کی تصنیف ''آثارالصنادید'' اردو تحقیق کا پہلا نمونہ

اردو تحقیق کا معلم اول حافظ محمود شیرانی کو کہا جاتا ہے۔ محمود شیرانی معلم اول کی حیثیت سے اس لیے جانے جاتے ہیں کیوں کہ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں جدید اصول تحقیق کو مرتب انداز میں پیش کیا جس کا بین ثبوت ان کی تصنیف ''تنقید شعرالعجم'' ہے۔ اسی طرح انھوں نے جدید اصول تحقیق کا استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ''خالق باری'' امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے صاحب ضیاء الدین خسرو کی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے مسلّمات ہیں جن کی شیرانی نے مدلل انداز میں تردید کی۔ ان باتوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محمود شیرانی سے قبل بھی اردو میں تحقیق کا عمل جاری تھا۔ چنانچہ اس کے ابتدائی نمونے شعرائے اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں، تذکروں کے علاوہ جس شخصیت کے یہاں جدید اصول تحقیق کی کارفرمائی سب سے زیادہ نظر آتی ہے وہ سرسید احمد خاں (۱۸۹۸۔۱۸۱۷ء) ہیں۔

سرسید ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی ہر جہت ایسی ہے کہ اس کو مستقل طور پر موضوع بنا کر لکھا جائے اور لکھا بھی جاتا رہا ہے۔ سرسید ایک ماہر تعلیم، مصلح، مفکر، مدبر، منصف، مصنف اور انیسویں صدی کی ایک عبقری شخصیت کی حیثیت سے ساری دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا مضمون ان تمام جہات کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے زیر نظر مضمون میں ''آثارالصنادید'' کے حوالے سے ان کی محققانہ شخصیت پر گفتگو کی جائے گی۔ سرسید نے ''آثارالصنادید'' (اشاعت اول: ۱۸۴۷ء، اشاعت دوم ۱۸۵۴ء) ''آئین اکبری'' (۵۶۔۱۸۵۵ء)، ''تاریخ فیروز شاہی'' از ضیاء الدین برنی (۱۸۶۲ء) اور ''توزک جہانگیر'' (۱۸۶۳ء) میں تحقیق کے جدید اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مستند اور مدلل متن پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورالصدر کتابوں میں ''آثارالصنادید'' سرسید کی مستقل تصنیف ہے۔ جب کہ ان کے علاوہ دیگر کتابوں کی تصحیح کی ہے اور ان کو نئے انداز میں

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

مرتب کیا ہے۔ زیرنظر مضمون میں ''آثارالصنادید'' کے حوالے سے داخلی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کتاب اردو تحقیق کا پہلا نمونہ ہے۔ سرسید کی زندگی میں ''آثارالصنادید'' کی دو اشاعتیں عمل میں آئیں پہلی ۱۸۴۷ء میں اور دوسری ۱۸۵۴ء میں۔

پہلی اشاعت میں چار ابواب ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلا باب: شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں

دوسرا باب: قلعہ معلّٰی کی عمارتوں کے حال میں

تیسرا باب: خاص شہر شاہجہان آباد کے حال میں

چوتھا باب: دلّی اور دلّی کے لوگوں کے حال میں[۱]

دوسری اشاعت کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلا باب: دہلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات میں

دوسرا باب: دہلی میں قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کے بیان میں

تیسرا باب: بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے بیان میں

تتمہ کتبجات (کتبہ جات) مکانات کہنہ میں[۲]

مزید گفتگو کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ راقم السطور کے پیش نظر اشاعت اول کا نول کشوری ایڈیشن ہے جس پر سنہ اشاعت تحریر نہیں، اور اشاعت ثانی کا نامی پریس سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہونے والا ایڈیشن ہے۔ اس مضمون میں جو بھی گفتگو کی جائے گی اس کے حوالے ان ہی دونوں ایڈیشنوں سے دیے جائیں گے۔ کتاب کی دونوں اشاعتوں کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری اشاعت پہلی اشاعت سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اس کا فوری اندازہ درج بالا دونوں اشاعتوں کے مشتملات کی فہرست سے ہی ہو جاتا ہے۔ پہلی اشاعت میں چار ابواب تھے جبکہ دوسری اشاعت میں تین ابواب اور ایک تتمہ ہے۔

پہلی اشاعت کافی ضخیم تھی اور تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل تھی جبکہ دوسری اشاعت میں صفحات کی تعداد گھٹ کر دو سو ہو گئی ہے۔

پہلی اشاعت میں رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری اشاعت میں صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمود الٰہی: ''پہلے ایڈیشن کا انداز بیان جذباتی اور داستانی تھا۔ دوسرے ایڈیشن کا مورخانہ اور محققانہ ہے۔''[۳]

www.urduchannel.in

پہلی اشاعت میں کتابیات درج نہیں تھیں جب کہ دوسری اشاعت میں دیباچے کے آخر میں کتابیات درج ہیں۔

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اشاعت اول کے مقابلے میں اشاعت ثانی زیادہ بہتر اور مدلل ہے۔ دونوں اشاعتوں کے درمیان کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں خود سرسید نے بھی اشاعت ثانی کے دیباچے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اپنے مدعا کو زیادہ واضح کرنے کے لیے یہاں پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اس کتاب کا پہلا باب جس میں مختصر ہندوستان کی آبادی اور پرانی اور نئی عمل داریوں کا ذکر ہے پہلی کتاب میں نہ تھا۔

۲۔ پہلی کتاب کے دوسرے باب میں صرف شاہجہان آباد کے قلعہ کا ذکر تھا اس کتاب کے دوسرے باب میں اوس قلعہ کا بھی پہلی کتاب سے بہتر بیان ہے۔ اور علاوہ اوس کے ابتدائے آبادی سے آج تک جس قدر قلعہ اور بنے اور شہر بسے اون سب کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ پہلی کتاب کے پہلے اور تیسرے باب میں جس قدر مطالب تھے وہ سب اس کتاب کے تیسرے باب میں اکٹھے ہیں بلکہ بعضے پُرانے مکانات کا اور حال جو دریافت ہوا ہے وہ زیادہ ہے۔

۴۔ پہلی کتاب میں دو نقص تھے ایک یہ کہ بعضے پُرانے مکانات کا اصلی حال دریافت نہ ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ پہلی کتاب میں بعض جگہ بیان حالات میں کچھ غلطی ہوگئی تھی اس کتاب میں یہ دونوں نقص دور کیے گئے۔

۵۔ پہلی کتاب میں عمارت کا بیان متفرق اور غیر منظّم تھا اب کے دفعہ سب عمارات کا حال بہ ترتیبِ سالِ بنا انتظام سے لکھا گیا۔

۶۔ پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا اوس کی سند نہ تھی اب کی کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے اکثر اوس کی سند کے لیے نام اوس کتاب تاریخ کا جس سے وہ حال لکھا گیا حاشیے پر مندرج ہے۔

۷۔ بڑی عمدہ بات اس حال کی کتاب میں یہ ہے کہ جس قدر کتبے پُرانی عمارتوں پر ہیں وہ سب اصلی قطعے اور اصلی خط کے مطابق اس کتاب میں مندرج ہیں۔[۴]

درجِ بالا سرسید کے بتائے ہوئے فرق کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت ثانی میں پہلی اشاعت کے مقابلے میں بعض ترمیم و اضافے کے ساتھ ساتھ خاص طور سے اس کو مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی اشاعت کی ترتیب بھی منظّم نہیں تھی جبکہ دوسری اشاعت میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عمارتوں کا حال سالِ بنا کے اعتبار سے لکھا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اشاعت اول کو ناقابلِ التفات سمجھا جائے کیوں کہ اشاعت اول بھی سرسید کی تلاش و جستجو اور ذوقِ تحقیق کو ظاہر کرتی ہے۔

اشاعت ثانی کو ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان بہت زیادہ زمانی فاصلہ نہیں ہے اس کے باوجود سرسید کے ان

www.urduchannel.in

دونوں اشاعتوں میں اس قدر تفاوت کیوں نظر آتا ہے اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔اس کی ایک وجہ جو سامنے کی ہے وہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سرسید منصفی کے عہدے پر فائز تھے اسی دوران سرسید نے یہ کتاب تصنیف کی۔یہ بات سب کومعلوم ہے کہ منصفی کا سارا نظام دعوے اور دلیل پر قائم ہے۔اس سے سرسید کی شخصیت کے اندر بھی چیزوں کو مستند و مدلل انداز میں پیش کرنے کا مزاج پیدا ہوا۔یہ تو ایک داخلی شے ہے جس کو اس تبدیلی کی وجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خارجی وجوہات کی تلاش کی جائے تو اس کے بارے میں محققین نے ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ سرسید کے اندر یہ بدلاؤ انگریزی ملازمت اختیار کرنے کے بعد آیا ہے۔انھوں نے انگریزوں سے بھی استفادہ کیا اور سنہ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۴ء کے درمیان مغربی اصول تحقیق سے واقف ہوگئے تھے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت سرسید کے بعض انگریز دوست اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے انھوں نے کچھ حد تک اس کا ترجمہ کیا بھی لیکن وہ ناقص رہا۔ اشاعت اول پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ بھی ایک انگریز مسٹر رابرٹس نے دیا تھا۔ممکن ہے کہ لفاظی اور عبارت آرائی کو اس اشاعت سے اس لیے بھی خارج کیا گیا ہوتا کہ اس کا ترجمہ آسانی سے ہوسکے۔مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اسی دوسرے ایڈیشن کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور اس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی۔اس کے علاوہ اسی ترجمے کو دیکھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی کا اعزازی ممبر مقرر کیا۔

شہر دہلی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں سرسید نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیان کتاب کی دونوں اشاعتوں سے ذیل میں بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ باعتبار استناد دونوں اشاعتوں میں کس قدر تفاوت ہے اس کی وضاحت ہوسکے۔

(پہلا ایڈیشن):

> ''اس بات میں بڑا اختلاف ہے کہ اندر پت کو دلی کب سے کہنے لگے اور اس میں تین روایتیں ہیں۔ایک یہ کہ لفظ ڈھلی ہے ھندی ڈال سے اور ڈھلی ھندی میں نرم زمین کو کہتے ہیں کہ جہاں میخ نہ گڑ سکے یہاں کی زمین بھی بہت نرم تھی اور میخ نہ گڑ سکتی تھی اس واسطے اس کو بھی ڈھلی کہنے لگے۔دوسری بات یہ کہ دہاؤ ایک زمین دار تھا۔اس نے اپنے نام پر ایک ایک گاؤں آباد کیا جب سے اس کو ڈھلی کہنے لگے۔تیسری روایت یہ ہے کہ راجہ دلیپ نے اپنے نام پر شہر آباد کیا جب سے دلی کہنے لگے اور اب لوگوں کی زبان پر دلی بغیر 'ھ' کے جاری ہے اور اگلی کتابوں میں ڈھلی 'ھے' سے لکھا ہے۔قول فیصل اس میں یہ ہے کہ راجہ دلیپ سے پہلے ڈھلی'' ہے'' کے

www.urduchannel.in

ساتھ مشہور ہوگا اور پھر دلی بغیر ''ہے'' کے کہنے لگے ہوں گے۔اس سبب سے دونوں نام لکھنے بولنے میں آتے ہیں۔''۵

(دوسرا ایڈیشن):

''اس بات میں بڑا اختلاف ہے کہ اندر پت کا نام کیسے دلی ہوگیا۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو سورج بنسیوں میں اور چندر بنسیوں میں کا ایک راجہ ہے اپنے نام پر دلی آباد کی لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجہ دلیپ (الف) کا ذکر ہے مگر کہیں دلی کا نام نہیں بلکہ جہاں لکھا ہے اندر پت ہی کر کر لکھا ہے اور بعضے (ب) تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۳۰۷ھ مطابق ۹۱۹ء کے تنوروں کے خاندان میں سے ایک نے شہر اندر پت کے برابر دہلی شہر بسایا اور جو کہ (ج) وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں جہاں میخ نہ تھم سکے اس سبب سے وہ بستی دھلی کر کر مشہور ہوئی۔ مگر اس سنہ میں نہ تنوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دلی نام پڑ جانا قریب قیاس ہے۔ اس واسطے یہ بات قابل اعتماد کے نہیں۔ مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ راجہ دھلو (د) قنوج کے راجہ نے اس سبب سے کہ دلی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں، اندر پت میں اپنے نام پر شہر بسایا جب سے اس شہر کا نام دھلی مشہور ہوا بلکہ صحیح نام دھلی کا دھلو ہے چنانچہ (ہ) امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کر دھلو کا لفظ ایک شعر میں باندھا ہے: شعر:

باگ اسپم بخش یاز آخور بفرما بارگیر
یا بفرمان دہ کہ گردوں شینم و دھلوروم

راجہ دھلو راجہ پورس یعنی خود راجہ کمایوں کے ہم عصر تھا... یہ واقعہ تین سو اٹھائیس ۳۲۸ قبل حضرت مسیح ہوا کہ تخمیناً بھی زمانہ دھلی شہر بسنے کا خیال ہوسکتا ہے۔''۶

درج بالا دونوں اقتباسات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کی وجہِ تسمیہ کے سلسلے میں پہلی اشاعت میں

www.urduchannel.in

پیش کیا گیا بیان سرسری اور محض بیان واقعہ کے انداز میں ہے جبکہ دوسری اشاعت میں سنین وتواریخ کی روشنی میں محقّق انداز میں چیزوں کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے اقتباس میں قوسین میں 'الف'، 'ب'، 'ج'، 'د'، 'ہ' کی علامتیں مآخذ کی نشان دہی کرنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ راقم نے یہ دونوں اقتباس ڈاکٹر محمود الٰہی کے مضمون ''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز سرسید اوران کے بعض رفقا''، مشمولہ سہ ماہی فکر ونظر، علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۵ء سے نقل کیے ہیں۔ یہ علامتیں شاید ڈاکٹر صاحب کی اختیار کردہ ہیں۔ کیوں کہ میرے پیش نظر جو اشاعت ہے اس میں ان علامتوں کے استعمال کے بجائے مآخذ کا ذکر حواشی میں کیا گیا ہے اوران کے لیے نمبرات (۱۔۲۔۳) کی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اس اقتباس میں جہاں علامت ''الف'' کے ذیل میں حاشیہ لکھا گیا ہے وہ حاشیہ راقم کے پیش نظر ۱۹۰۴ء والے ایڈیشن میں نہیں بہت ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے جو ایڈیشن ہو اس میں یہ علامت اور حاشیہ موجود ہو۔ پہلی اشاعت میں مآخذ کا عدم ذکر اور دوسری میں ان کا ذکر ہونا اشاعت ثانی کو جدید تحقیق کے قریب کرتا ہے۔ ذیل میں مذکورہ بالا اقتباس کے حواشی کا ذکر کیا جاتا ہے:

الف: مرآت آفتاب نما ب: تاریخ فرشتہ ج: نزھۃ القلوب

د: مرآت آفتاب نما ہ: جواہر الحروف ے

خلاصہ یہ کہ ''آثار الصنادید'' کی تصنیف سرسید کی محققانہ حیثیت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اشاعت اول میں ان کی تلاش وجستجو اور ذوق تحقیق کی غمازی ہوتی ہے تو دوسری اشاعت میں ان کے جدید اصول تحقیق سے روشناس ہونے اس کے طریقِ کار سے واقف ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ان مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کی یہ شاہ کار تصنیف اردو کا پہلا تحقیقی نمونہ ہے۔

حواشی:

(۱) دیباچہ آثار الصنادید، مطبع منشی نول کشور، سنہ ندارد، ص:۹

(۲) دیباچہ آثار الصنادید، نامی پریس، کانپور ۱۹۰۴ء، ص:۵

(۳) اردو میں جدید تحقیق کا آغاز سرسید اوران کے بعض رفقا از ڈاکٹر محمود الٰہی (مضمون) مشمولہ فکر ونظر، علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۵ء

(۴) دیباچۂ آثار الصنادید، نامی پریس، کانپور، ۱۹۰۴ء، ص:۳

(۵) آثار الصنادید، جلد چہارم، نولکشور، ۱۸۹۵ء، بحوالہ: اردو میں جدید تحقیق کا آغاز سرسید اوران کے بعض رفقا از ڈاکٹر محمود الٰہی، ص:۳

(۶) آثار الصنادید، باب دوم، نامی پریس، کانپور، ۱۹۰۴ء، بحوالہ: اردو میں جدید تحقیق کا آغاز سرسید اوران کے بعض رفقا از ڈاکٹر محمود الٰہی

(۷) ایضاً

www.urduchannel.in

ریاض احمد وانی*

سرسید عصر حاضر میں مریض ملت کا معالج اعظم

برصغیر کے مسلمانوں کے مسیحا کہلانے والے سرسید احمد خان واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے دور میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے نہ صرف مرض کی تشخیص کی بلکہ عملی طور پر اس کا نسخہ بھی تجویز کر ڈالا۔ غور وفکر اور تدبر وتفکر کے نقطۂ نظر سے ان کے خیالات میں ہر وقت ارتقا اور نیا پن کا عکس نمایاں ہے، یہ ان کے غائر مطالعہ اور حالات وواقعات پر ان کی گہری پکڑ پر دال ہے۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک اس بادنو بہار کی مانند ہے جس سے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تازگی وتوانائی آئی بلکہ یہیں سے مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں ہندوستان میں ہر سطح پر مسلمانوں سے مبارک ومستحکم مفاہمت پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کسی سرسید کی ضرورت محسوس کی جائے گی اور اس جیسی شخصیت پچھلے دوسو سال میں پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی اس تحریک اور ادارے سے ہندوستان کے مسلمانوں کا دیرینہ اور جذباتی رشتہ ہے اور اسی کو اپنی تعمیری صلاحیتوں، اقدار اعلیٰ کی نشو ونما، وطن اور ہم وطنوں میں دیرینہ یگانگت کا محرک سمجھتے ہیں۔ اس ادارے کے تہذیبی تقاضوں کی بجا آوری سے طلبا نے وہ کچھ سیکھا اور برتا جس سے ملک وملت کی ناموری اور خوشحالی میں اضافہ ہوا اور مذہبی، اخلاقی، معاشرتی رواداری اور مساوات کی برکتیں نصیب ہوئیں۔ یہ اگر چہ اقلیت کی بقا کا ضامن تھا مگر اس سے اکثریت بھی مستفیض ہوئی ہے اور ہوتی رہیں گی۔ سرسید کی انگریز دوستی یا حکومت وقت کی پالیسیوں سے تعمل وتعاون محض مغرب کی طرز فکر اور علوم وفنون کی تحصیل اور ان کی عالمگیر اور ناگزیر اہمیت کے سبب سے تھی، دوسرے الفاظ میں یہ کسی فرمان الٰہی کی بنا پر نہ تھی کہ جس میں تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ اس پہلو کی تصدیق وقت کرتا ہے کہ اسی ادارے نے آگے جا کر مسلمانوں کو عزت وعافیت سے زندگی بسر کرنے کی مہلت اور مواقع فراہم کیے۔

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

سرسید نے جہاں قوم کے ابتذال میں بہت ساری وجہیں قرار دی ہیں وہیں مذہب سے دوری اس کی بنیادی وجہ قرار دیتے ہیں انہوں نے مذہبی پہلو کو بھی تہذیب کے دائرے میں رکھا اور یہ سمجھایا کہ تہذیب صرف اخلاقیات کے دائروں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عقائد میں تہذیب، اعمال میں تہذیب، خیالات میں تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ مذہب کی صحیح ترجمانی ہی قوم کو ایک واضح لائحہ عمل مہیا کرسکتا ہے۔ مذہب ایک انقلابی قوت ہوتا ہے جو نئی تحریکات کو جنم دے کر ان کو اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن کر دیتا ہے، اس ڈگر میں یا اس راہِ عمل میں وہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہتا ہے۔ مذہب کی صحیح تشریح ہی ایک قوم میں غیرت، عزت نفس، خلوص اور للہیت کے عظیم جذبات کو جنم دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کوتاہی، کاہلی، بے عملی اور توہمات جیسے فرسودہ خیالات کا قلع قمع کر کے ان کو ایک صحیح ڈھنگ سکھاتا ہے، یہی روشنی اور یہی راستہ تجسس، تلاش حق اور فطری اصولوں کو از سرنو جنم دیتا ہے جو آگے چل کر جہالت کی گرہیں کھول کر علم و عمل، تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ اور منفرد میدان ہموار کرتا ہے۔ سرسید کے اسی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں دوسرے محرکات کے مقابلے میں مذہب نے زیادہ کھل کر حصہ لیا ہے۔ سرسید کو ابتدا ہی سے مذہب کی اسی اہمیت کا احساس تھا، وہ جانتے تھے مسلمان کی قومی ترقی مذہب سے وابستہ ہے۔ جس زمانے میں مسلمان تیز رفتاری کے ساتھ منزلیں طے کر رہے تھے ان کا مذہب زندہ صالح اور جاندار تھا۔ جب تک مذہب میں زندگی کے آثار باقی رہے ان کی رفتار میں سستی نہ آئی۔ وہ جوش اور گرمی دل کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتے رہے، لیکن جونہی ان کے مذہب میں منفی تصورات اور باطل خیالات کی آمیزش شروع ہوئی۔ زندہ اور متحرک افکار کی جگہ جامد اور سکونی رسوم و روایات نے لے لی، مسلمان چلتے چلتے رک گئے۔ تقدیر کے خالق زندانی تقدیر بن گئے۔ سرسید جو مسلم قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔ اس سے پہلے مذہب کی طرف توجہ کی اور اس کے صاف وشفاف چشمے کو جو اوہام وخرافات کے خس وخاشاک سے اتنا چلا گیا تھا، صاف کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔''

اصل میں مذہب ہی ایک ایسا ادارہ ہے جب تک صحیح اور پاک نفوس کے ہاتھوں میں رہے گا ہدایت کے راستے

www.urduchannel.in

بھی کھلے رہیں گے جونہی یہ ادارہ نفس پرستوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے تو اس کی مضبوط دیواریں ہلنے لگتی ہیں اور ایسی توہمات اور فرسودہ روایات کو تقویت ملتی ہے جو معاشرہ کو اندر ہی اندر کھوکھلا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں سرسید نے دیگر شعبہ ہائے حیات پر قلم اُٹھایا وہیں مذہب کے بارے میں بھی کافی مضامین، کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے نزدیک مذہب کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور اس کے تمام ابعاد عقلی توجیہات چاہتے ہیں، ان کے نزدیک مذہب کا براہ راست تعلق قانون فطرت سے ہے اس میں کوئی تضاد نہیں۔

سرسید احمد خاں نے ترقی کے راستوں کو جب ٹٹولا تو انہیں معلوم ہوا کہ جس دور میں وہ جی رہے ہیں وہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے اسی کے ہی نتیجے میں کائنات اپنے سربستہ رازوں کو کھولنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ جب ہم ادبی صلاحیتوں کو جلا نہ دیں اور باطنی قوتوں کو نہ جگائیں تب تک قوم سے ترقی کا آرزومند ہونا خیال خام اور نری خوش فہمی قرار دی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اس چیز کو محسوس کیا کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ مغربی دنیا نئی ایجادات میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ اب ہر محاذ پر تبدیلی آگئی ہے اب ترقی کرنا آسان ہو گیا ہے صرف ترقی پسندوں کے نقشِ قدم کو اختیار کرنا ہوگا جو راہ وہ چلے اس کو ہمیں بھی اختیار کرنا ہوگا، ان کا پیغام ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دشمن کو اس کے ہی وسائل کا سہارا لے کر زیر کیا جائے، ترقی کسی کی میراث نہیں ہے اور قدرت نے اس کے لیے کوئی چہیتا مقرر نہیں کیا کہ فلاں کو دوں اور فلاں کو نہ دوں یا فلاں میرے صحیح معاوضے کے مستحق ہیں بلکہ قانون فطرت اپنے اصول میں ہمیشہ حق وانصاف کو اپنا آئینہ بنالیتا ہے۔ سرسید کو مکمل ایقان تھا کہ اگر ہندوستانی مسلمان مغربی علوم حاصل نہ کریں گے تو وہ ہمیشہ کے لیے دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''بے عملی مفلسی کی ماں ہے۔ جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کی باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کی حالت پر غور کرو کہ یہ بدبخت دن اُن پر آ گئے ہیں بڑے بڑے قدیم خاندان سب گر پڑے ہیں تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرضداری اور ذلت چھا گئی ہے .....تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کی قومی ترقی، قومی تعلیم وتربیت پر منحصر ہے۔ پس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے کی کوشش کریں۔'' (فکر ونظر، سرسید نمبر ۱۹۹۲، ص:۱۵۲)

سرسید کے مشن کی معنویت اس دور میں یہ ہے کہ قوم کے سرپرستوں کو ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے جو

www.urduchannel.in

مذہب، فرقہ بندی اور تعصب کے دائروں سے بالاتر ہو۔ اگر سرسید کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے تمام ملی، سماجی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی مسائل کا ایک ہی منجملہ حل ہے وہ ہے تعلیم اور بس ایک منظّم تعلیمی پروگرام۔ اس کو اپنا ہدف بنانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ مسلم قوم کو وہ ادارے دستیاب ہوں جو ان کے نہ صرف تعلیمی بلکہ اقتصادی بوجھ کو برداشت کرسکیں۔ اس میں رنگ، نسل یا اور کوئی تمیز روا نہ رکھی جائے۔ اسی تعلیمی پروگرام سے دوبارہ عروج حاصل کرنا ممکن ہے اور اسی ہتھیار سے بادِ مخالف کا ڈٹ کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان طالب علموں کی ذہنی تطہیر میں سرسید کا مشن بلاشبہ ایک سائنسی کامیاب مشن تھا۔ اس مشن نے فکر کو پروان چڑھانے اور ادب کی تطہیر اور تہذیب کی بقا وتحفظ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ اس کا اثر ان کے رفیقوں اور ساتھیوں میں بھی رچ بس گیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ مذہبی ہم آہنگی کے زبردست حامی تھے۔ وہ قوم کو سمجھانا چاہتے تھے کہ مذہب کی بنیاد پر الگ الگ خانوں میں تقسیم ہوجانے سے قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی ہے۔ اس طرح انھوں نے سوچ کے دائروں کو وسیع کیا اور سمجھایا کہ ملک میں ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں لیکن وطن سے باہر نکل کر ہر کوئی ہمیں ہندوستانی ہی پکارتا ہے۔ مسلمانوں کی ذلت مسلمانوں کی ذلت نہیں ہوتی ہے اسی طرح ہندوؤں کی پسماندگی صرف انہی کی پسماندگی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ قوم کا ذہنی معیار کتنا پسماندہ اور قابلِ مذمت ہے۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد مسلمان جمود، خود فریبی اور مجہولیت کا شکار ہوگئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں کسی بھی چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ تعلیمی پسماندگی، ذہنی انتشار، معاشی بدحالی کے باعث قوم مایوسی کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس دور میں سرسید نے تنہا ایک انجمن کا کام کیا۔ ان کا دور تاریخ کے نازک ترین ادوار میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس میں تذبذب، انتشار، تشکیک اور بے یقینی کا ماحول ہر سو چھایا ہوا تھا۔ سرسید نے اس ماحول کو مبدل کرکے علم وعقل، صبر واستقلال اور اتحاد باہمی کی تعلیم کا بیڑا اُٹھایا۔ اس پر خود گامزن رہے اور قوم کو بھی آہستہ آہستہ اپنا ہمنوا بنالیا اور یہ ثابت کیا کہ عظیم مقاصد کے حصول میں کتنی آزمائشیں آتی ہیں اور یہ بھی سکھایا ان آزمائشوں سے کس طرح نبرد آزما ہونا ہے، یہ سرسید کی مثالی زندگی تھی جو آج بھی نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیروں کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ کمال دوراندیشی کا پیکر سرسید آج بھی ہندوستان کے نام نہاد مسلم حکمرانوں کو آواز دیتا ہے کہ کس طرح کی مفاہمت سے اور فریقین کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اپنی قوم کی بہبودی اور ترقی کی راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں اور سب سے بڑی بات ان میں مذہب کی صحیح اسپرٹ اور اس پر عمل کرنے کی تلقین تھی۔ سرسید زندگیوں میں توازن لانے کے علمبردار تھے وہ صرف شخصیت کے ایک ہی پہلو کو قوی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنے وقت میں اگر انہوں نے

www.urduchannel.in

کسی کو نیک پایا تو اس میں ناشائستگی کا عنصر غالب پایا، اگر کسی کو دلیر دیکھا تو یہ دلیری خوفناک رنگ اختیار کر لیتی تھی اسی طرح اگر کسی کو دانا اور عقلمند دیکھا تو اس میں مکر وفریب جیسے جرائم عروج پر دیکھے، سرسید دراصل عمدہ صفات کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنا چاہتے تھے اور اسی کو دین ودنیا کے لیے مفید گردانتے تھے۔

موجودہ دور میں جو مسئلے سر اٹھا رہے ہیں ان کا حل بھی سرسید احمد خاں کی ہمہ جہت زندگی میں ملتا ہے، سب سے اہم مسئلہ مکمل خواندگی، جو ہر حکومت کے سامنے اہم چیلنج بن کر سامنے آجاتا ہے، اس سلسلے میں سرسید کی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔انہوں نے اس مسئلہ کی تہہ میں جا کر اس بات پر زور دیا کہ اس ذمہ داری کا احساس سب سے پہلے والدین یا بچوں کے دیگر سرپرستوں پر رکھی جائے۔اسی طرح پچھڑے اور پسماندہ علاقوں میں نہ صرف مدرسوں اور اسکولوں کے قیام کی کوشش ہونی چاہئے بلکہ ان اداروں میں جدید وسائل بھی مہیا ہونے چاہیے تبھی جا کے یہ غریب طبقہ مسابقت کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ مادری زبان کی اہمیت کے حوالے سے آج کے دور میں سنجیدہ بحث چھڑ گئی ہے۔نہ صرف وقتی سمیناروں اور کانفرنسوں پر اکتفا کیا جاتا ہے بلکہ باضابطہ طور پر عالمی سطح پر الگ سے ایک دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔سرسید نے اس مسئلہ پر اُس دور میں اپنے طور پر جو بحث کی اس کی اہمیت آج کے دور میں اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔سرسید کی درج ذیل بات آج بھی سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے:

> ''میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے واسطے کھود دی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اس کی زبان میں نہ دی جائیں تو کبھی ہندوستان کو شائستگی وتربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔''

سرسید احمد خاں کے خطبات، مضامین یا خطوط کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا وہ اپنی قوم کو جدید فکر سے متصف اور ہم آہنگ دیکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے ملکی سطح پر بھی مسلمانوں اور اپنے وقت کے حالات پر گہرا تدبر کر کے یہ پیشن گوئی کی کہ اگر چہ مسلمان ایک عرصہ تک اس ملک کے حکمراں رہے لیکن وقت بتا رہا ہے کہ اب ان کے لیے دوبارہ اس منصب پر براجمان ہونا ناممکن اور خیال خام ہے کیوں کہ اب ہر محاذ کا میدان تبدیل ہو گیا ہے۔سرسید نے اپنی قوم کی دوبارہ علمی عروج پر اپنا تن من دھن نچھاور کر کے وقتی طور پر اعتراضات بھی مول لیے لیکن دانشور حضرات نے ان کی اس دوررس بصیرت کا صحیح اندازہ بھی لگایا یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کہہ اُٹھے:

> ''سرسید کا ہم پر کوئی ذاتی احسان نہیں ہے، سرسید نے ہمیں ملک ودولت نہیں دے دی پھر ہم اس کے فدائی ہو رہے ہیں۔صرف اس لیے کہ اس

www.urduchannel.in

کے کام ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ اس کی تعریف کریں۔اس کی تعریف ہماری ذاتیات میں داخل ہوگئی ہے اور ہماری زبان اس کی ستائش سے بند نہیں ہوسکتی۔اگر ایسی ہی تعریف کا مستحق بننا چاہتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ کام کرتے جائیں زمانہ خود ایک دن تعریف کا ڈنکا بجادے گا۔''

آج کے انتشار اور پرفتن دور میں جہاں تعلیم نے تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی کا روپ دھار لیا ہے، جہاں مادیت سے لیس، خواہش نفس کے پجاری کی ایک کھیپ روز بہ روز نکل کر معاشرے کو زہر آلود بنا رہی ہے وہاں سرسید کا پیغام آج بھی تاثیر سے پُر ہے جو انسان کی پوری سائیکی کو توازن سے ہمکنار کرتا ہے اور اسی سے آگے جا کر ایک صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔سرسید کی نظر میں تعلیم و تربیت کا بنیادی مقصد انسان کو انسانیت کے اوصاف سے مملو کرنا ہے:

''اگر میری رائے غلط نہ ہو تو نری تعلیم کسی کام کی نہیں جب تک اس کے ساتھ تربیت نہ ہو۔تربیت کے یہ معنی نہیں کہ بچہ دوزانوں ہو کر بیٹھے اور ہاتھ جوڑ کر ہماری ہاں سے ہاں ملائے، یہ تو انسان کی تعلیم نہیں ہے یہ تو بندر کو سکھا دیا جاتا ہے۔بچوں کی تربیت کے لیے سچائی، نیکی، لحاظ میں آزادی ہونی چاہیے۔اور یہ تمام باتیں گھر پر تعلیم پانے سے نہیں آسکتیں جب تک ان کے لیے ایک ایسی تعلیم گاہ نہ ہو اور وہ اس تعلیم گاہ کے اڈگڈے میں نہ ڈال دی جاویں جہاں بجز تعلیم اور تربیت کے اور کوئی چیز نہ ہو'' (سرسید)

سرسید نہیں چاہتے تھے کہ تعلیم کو تعلیم کی ہی حد تک رکھا جائے بلکہ وہ اس تعلیم کے خلاف تھے جو صرف ذاتی انا اور انفرادیت کو تقویت پہنچائے۔ان کا کہنا ہے کہ کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے۔حالات کیسے دگرگوں ہوں اگر ہمیں کوئی امید کی کرن اپنے گردوپیش میں ملتی ہے وہ ہے سرسید کی شخصیت کا وہ commitment اور صبر جو آج بھی ہمارے لیے کسی قیمتی اثاثہ سے کم نہیں ہے، الغرض سرسید کی زندگی، ان کے خیالات آج بھی تمام مسلمانوں کے لیے بالعموم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بالخصوص ایک مینارِ نور کی طرح راہنما ثابت ہو سکتے ہیں اور مرورِ زمانہ ان کی اہمیت کو مٹا نہیں سکتا ہے۔

○

www.urduchannel.in

غلام سرور*

سرسید احمد خاں اور ہماری ذمہ داریاں

انیسویں صدی کے ہندوستان کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جس قوم نے برسوں تک ملک کی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی اس کی حالت ناگفتہ بہ کیسے ہوسکتی ہے۔عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے والے حکمراں یہ بھول گئے تھے کہ ہر عروج کا زوال ہوتا ہے۔جنوبی ہندوستان میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور شمالی ہند میں بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد ہندوستان انگریزوں کا پوری طرح سے محکوم بن چکا تھا۔انگریزوں کو اگر کسی سے خوف تھا تو وہ مسلمان تھے اس لیے ان کے ظلم وستم کا سب سے زیادہ شکار مسلمان ہی ہوئے۔ان نامساعد حالات میں مصلح قوم و ملت سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور پسماندگی کا جائزہ لیا اور عزم مصمم کے ساتھ مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے کی سعی کی،جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

سرسید احمد خاں کے علمی وادبی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے،جس کا شمار کرنا اس مختصر سے مضمون میں سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔تاریخ پر سرسید احمد خاں کی گہری نظر تھی۔مورخ کی حیثیت سے ان کی الگ شناخت ہے۔مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ سے ان کا وژن وسیع ہوگیا تھا۔۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ہندوستانیوں کی شکست اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی نے انہیں قوم کی فکر پر مجبور کردیا۔۱۸۵۹ء میں اس جنگ کے احوال کو اپنی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' میں تحریر کیا اور یہ واضح کیا کہ اس بغاوت میں مسلمانوں کی خطا نہیں تھی بلکہ انگریزی حکومت کی غلط پالیسیوں کی بنا پر یہ بغاوت ہوئی۔یہ ثابت کرنا آسان کام نہیں تھا،اس کے لیے بڑے جگر کی ضرورت تھی۔انگریزی حکومت میں ملازم ہونے کے باوجود انہیں ہی مورد الزام ٹھہرانا،سرسید احمد کا یہ جرأت مندانہ قدم تھا جس کو انگریزوں نے تسلیم بھی کیا۔

سرسید احمد خاں جہاں علم وادب کے بحر زخار تھے وہیں دانشور بھی تھے۔دانشمندی ہی نے ان کو اس مقام پر پہنچایا

* ریسرچ اسکالر،شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

www.urduchannel.in

کہ وہ کس طرح حالات کا جائزہ لیں۔انھوں نے اس دور کے مسلمانوں کی حالت کو پہچان لیا اوران کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔قوم کو پسماندگی اورزبوں حالی سے نکالنے کا واحد راستہ تعلیم کی شکل میں تلاش کیا کیوں کہ تعلیم ہی ایک ایسا راستہ تھا جس کے ذریعہ کھویا ہوا مقام حاصل کیا جاسکتا تھا۔اس کے پیش نظر دوران ملازمت ۱۸۵۹ء، مرادآباد میں ایک مدسہ قائم کیا جو فی الحال ڈگری کالج کی شکل میں تشنگان علوم کو سیراب کررہا ہے۔۱۸۶۰ء ہی میں مرادآباد میں ایک سہ ماہی ذولسانی رسالہ ''رسالہ خیرخواہان مسلمان' اورانگریزی میں ''لائف محمڈنز آف انڈیا'' کا اجرا کیا۔سرسیداحمد کا مرادآباد سے تبادلہ ہونے کی وجہ سے غالباً یہ دونوں رسالے جاری نہ رہ سکے۔

۱۸۶۲ء میں سرسیداحمد خاں کا تبادلہ غازی پور میں ہوگیا یہاں بھی انھوں نے اپنے تعلیمی مقاصد کو جاری رکھا اور ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مغربی زبانوں میں بالخصوص انگریزی زبان پر مشتمل کتابوں کواردو میں ترجمہ کرنا تھا۔سرسیداحمد خاں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی اس کا اہم حصہ قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک تعلیم کا تصور تربیت کے بغیر نامکمل ہے۔تربیت ہی کے لیے ۱۸۷۰ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا، جس میں وہ خود تعلیم کی اہمیت، تربیت کی افادیت اور تہذیب وتمدن پر مضامین لکھتے اوراپنے اصحاب سے بھی لکھواتے تھے۔آج بھی یہ رسالہ پوری شان وشوکت کے ساتھ جاری وساری ہے۔تعلیم وتربیت کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''تربیت اورتعلیم دوچیزیں ہیں،صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ تعلیم وتربیت مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔تعلیم کا اصل مقصد مارل کی درستی ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ ہیں جن کا طرز اخلاق ایسا خراب ہے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا اور کہا جاتا ہے کہ کاش وہ بے تعلیم ہی رہے تو اچھا تھا۔'' (بحوالہ سرسیداحمد خاں اوران کی معنویت موجودہ دور میں،ص:۴۳)

اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''اصل مقصود تو ہمارا اس پرچے کا قومی تہذیب ہے۔مسائل مذہبی کی بحث بدرجہ مجبوری آجاتی ہے۔''
>
> (بحوالہ سرسیداحمد خاں اوران کی معنویت موجودہ دور میں،ص:۲۹)

سرسیداحمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم (ایم اے او کالج) کی بنیاد رکھی، جو ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم

www.urduchannel.in

یونیورسٹی کی شکل اختیار کر کے علم وادب اور تہذیب وتمدن کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ انشاءاللہ تا قیامت آنے والی نسلیں علم کے اس میکدے سے جام پیتی رہیں گی۔ مذکورہ بالا کام کے لیے سرسید نے بہت سی قربانیاں پیش کیں، مسلسل جدوجہد کی، مختلف جگہوں کا سفر کیا، لوگوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تقاریر کیں اور سب سے مشکل کام جس کے بغیر کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہے وہ مالی امداد ہے، جس کے لیے انھوں نے چندہ کیا۔ ہم غور کرتے ہیں کہ یہ چندہ کون کر رہا ہے ایک ایسا مرد آہن جس کو برٹش حکومت کی جانب سے سر کا خطاب ملا ہے۔ جج کے منصب پر فائز رہ چکا ہے واقعی یہ ایسا کام ہے جس کو کرنے سے لوگ گریز کرتے ہیں۔

۱۷/اکتوبر ۲۰۱۷ء میں ملک اور بیرون ملک میں سرسید احمد خاں کے عقیدت مند حضرات ان کے دوصد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں اور کرنا بھی چاہیے اس لیے کہ جو قوم اپنے اسلاف کو فراموش کر دیتی ہے اس کا وجود تاریخ سے محو ہو جاتا ہے۔ لیکن غور وفکر کرنے والی بات یہ ہے کہ کیا اس سے سرسید کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے؟ اس دوصد سالہ تقریب کے موقع پر ان کے افکار ونظریات، ان کے عقائد اور غیر مسلموں کے روابط وغیرہ پر مقالے تحریر کیے جا رہے ہیں، جو کتابوں کی زینت اور چند مخصوص لوگوں تک جن کی رسائی ہوتی ہے آج اس دور میں اس کی کیا معنویت وضرورت ہے؟ سرسید احمد خاں نے جو افکار ونظریات پیش کیے قوم کو اس سے براہ راست فائدہ ہوا۔ آج حالات پھر سرسید کی تلاش میں ہیں کہ کوئی سرسید علم کے پرچم کو بلند کرے تا کہ قوم کی تعلیمی پسماندگی دور ہو سکے۔ سرسید احمد کو سچی خراج عقیدت اسی وقت پیش کر سکتے ہیں جب تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں۔ تعلیمی سطح پر ہماری شرح خواندگی بہت کم ہے۔ علی گڑھ تحریک کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ قوم کے سرمایہ دار طبقہ کو اس کی طرف متوجہ کیا جائے اور N.V.S. K.V.S. D.A.V., D.P.S. اور آرمی پبلک اسکول کے طرز پر مختلف شہروں میں اسکول قائم کیے جائیں تا کہ ابتدائی اور بنیادی تعلیم میں ہمارے طلبا مضبوط ہوں۔ جب ابتدائی تعلیم بہتر ہوگی تو ہندوستان کے کسی بھی کالج اور یونیورسٹی میں ان کو داخلہ مل جائے گا۔ سرسید احمد خاں کے دوصد سالہ یوم تقریب کے موقع پر ابتدائی تعلیم کی تحریک پر نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہو جائیں تو یہ سرسید کے لیے سچی خراج عقیدت ہوگی۔ امید ہے کہ اس دوصد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر قوم کے مفکر و مدبر اور سرمایہ دار طبقہ سرسید احمد کے تعلیمی مشن اور ان کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوں گے۔ انشاءاللہ!

www.urduchannel.in

ارشد رفیق*

سرسید احمد خاں: حیات اور کارنامے

سرسید احمد خاں ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم ان کی نیک نفس اور خداترس والدہ کی زیرنگرانی ہوئی۔ان کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرتؐ سے ملتا ہے اور جیسا کہ شجرۂ نسب خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے ان میں سب سے آخری امام تقی ابن موسیٰ رضا علیہم السلام ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔تاہم باپ کی طرف سے وہ حسینی سید ہیں۔سرسید سے ایک دفعہ ان کے بچپن کے حالات دریافت کئے گئے تو انہوں نے جواب دیا کہ میری تمام سرگذشت کے بیان کے لیے ایک شعر کافی ہے ؎

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں کشتیم سرگرداں شدیم

حضرت شاہ غلام علی صاحب کے طفیل میں انہوں نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ کر اقراء کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔اس کے بعد ننہال میں ایک شریف گھرانے کی پردہ نشین بی بی سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔قرآن پڑھنے کے بعد وہ مکتب میں پڑھنے لگے مولوی حمیدالدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی جوان کے نانا کے ہاں نوکر تھے۔ان سے ابتدائی کتابیں کریما، خالق باری، آمدنامہ وغیرہ پڑھیں، مولوی حمیدالدین کے انتقال کے بعد بعض دوسرے لوگوں کو ان کی پڑھائی پر معمور کیا گیا۔انہوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں، اور دوسری کتابیں بھی پڑھیں پھر عربی پڑھنی شروع کی۔اس کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کے ننہال کے لوگ دلی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی کتابیں تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہئیات اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا پڑھا۔اسی زمانہ میں طب پڑھنے کا شوق ہوا۔حکیم غلام حیدر خاں سے جو کہ خاندانی حکیم تھے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفسی امراض عین تک

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب کا کام بھی کیا چوں کہ ان کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا لہٰذا وہ تواتر کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے اور اس وقت کے دہلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں مشہور تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ پابندی سے ان کی محفلوں میں بیٹھ کر مستفیض ہوتے رہے۔

۱۸۳۸ء میں جب سرسید کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۱ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے انتہائی قلیل رقم سرسید کی والدہ کو ملتی تھی باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں۔ اس لیے سرسید نے گورنمنٹ کی نوکری کا ارادہ کیا۔ اس وقت ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں دہلی میں صدر امین تھے۔ ان سے درخواست کر کے کچہری میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مسٹر رابرٹ ہملٹن کے ہمراہ فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا۔ انہیں دنوں انہوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ ''جام جم'' سے جو کہ ۱۸۴۱ء میں چھپ کر شائع ہوئی اس میں امیر تیمور سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک کے خاندانوں کا حال قلم بند کیا ہے۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے اور جنوری ۱۸۴۲ء کو تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آ گئے حسن اتفاق سے اکبر کی خوابگاہ میں رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس زمانے میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے۔ ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' یہ مختصر رسالہ جس میں آنحضرتؐ کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں سرسید نے زمانے کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا۔ دوسرا ''تحفۂ حسن'' مؤلفہ ۱۲۶۸ھ یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے۔ اس میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں اور تولاً اور تبرّا کا بیان بھی ہے تیسرا ''تسہیل فی جر الثقیل'' مطبوعہ ۱۸۴۴ء یہ اردو ترجمہ ہے اس رسالے میں مصنف کے جر ثقیل کے پانچ اصول بیان کئے ہیں۔

۱۸ر فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتح پور سیکری سے دہلی آ گئے اس دوران انہوں نے ''آثار الصنادید'' کے علاوہ کئی اور رسالے لکھے ۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور چلے گئے۔ بجنور میں سوا دو برس ان کو گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انہوں نے فرائض منصبی کے علاوہ فرصت کے وقت میں دو کام انتہائی جانفشانی سے کیے جو قابل ذکر ہیں ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا دوسرے آئین اکبری کی تصحیح و تکمیل۔

''آثار الصنادید'' جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی خاصی مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر گارساں دتاسی نے پیرس سے ۱۸۶۱ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا جس کی بنیاد پر سرسید ۱۸۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔ مرآد باد میں قیام کے دوران انھوں نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی جس میں ۱۸۵۷ء کے غدر کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص پالیسی، حکومت کے نظم و نسق میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت، عوام کے مسائل سے ارباب اقتدار کی بے خبری اور بے توجہی اور مذہبی معاملات میں پادریوں کی بے جا مداخلت کا نتیجہ قرار دیا۔ اپریل ۱۸۶۹ء میں سرسید کو اپنے بیٹے

www.urduchannel.in

سید محمود کے ساتھ انگلینڈ جانے کا موقع ملا تو ''خطبات احمدیہ'' لکھی یہ سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب ہے۔

سرسید احمد خاں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ دیگر زبانوں سے علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے کی ضرورت بھی محسوس کی اور اس کے لیے ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کے ذریعہ سرسید اپنے وطن میں علوم جدیدہ کو عام کرنا چاہتے تھے اس سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے جاری ہوا اس میں سیاسی، سماجی، اخلاقی، عملی اور معاشرتی اور ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔

تصنیف و تالیف اور تخلیقی عمل سے گزرنے کے بعد سرسید کو ملک وقوم کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی تب مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ابتری کو دیکھنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ قوم کو اس تباہی و بربادی سے نکالا کیسے جائے، بہت غور وفکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم یعنی جدید مغربی تعلیم ہے ہماری ساری مصیبت پس ماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جہالت تمام عیوب اور برائیوں کی جڑ ہے چنانچہ اپنا کتب خانہ بیچا اور گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو ولایت چلے گئے وہیں انہوں نے اپنے منصوبے کا خاکہ تیار کیا چنانچہ ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم کے خلاف انہوں نے انگریزی میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ ان کا اصل منشا مسلم یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔

انگلستان سے واپس آکر سرسید نے دو عظیم الشان کام کیے جو ان کے کارناموں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ایک ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء جس کا مقصد نہ صرف معاشرت، تہذیب اور مذہبی خیالات کی اصلاح تھا بلکہ اس کے ذریعہ اردو ادب اور انشاء پردازی میں انقلاب پیدا کرنا تھا دوسرا مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام جو اپنی نوعیت کا واحد کالج تھا جو اقامتی اصول پر قائم کیا گیا تھا اس کالج نے قوم میں نئی بیداری پیدا کی رفتہ رفتہ یہ کالج مسلمانوں کی روشن خیال، تعلیم وتہذیب، سیاست اور علم وادب کا مرکز بن گیا۔ کالج کے قیام کے بعد محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی جو بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہوا جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا شوق پیدا کرنا تھا۔ سرسید ایک یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے تاہم حکومت نے ان کا ساتھ نہ دیا لیکن ان کی زندگی کے بعد ان کی آرزو پوری ہوئی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

سرسید اپنی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے چھوڑ گئے جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں اس برّ اعظم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، دانش ور، بزرگ اور مصلح گزرے ہیں تاہم ان کا دائرہ علم محدود تھا لیکن سرسید احمد خاں کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔

○

www.urduchannel.in

ثنا ریاض*

رسالہ اسباب بغاوت ہند

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا اس سے سب واقف ہیں۔اس بغاوت میں انگریزوں کے سب سے زیادہ غیظ وغضب کا شکار مسلمان ہوئے۔سیکڑوں مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں، دلی سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی اور مسلمان اسی خوف و ہراس میں جیتے رہے۔حالاں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں بخت خاں، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، نانا صاحب، منگل پانڈے، کنور سنگھ وغیرہ نے مل کر آزادی کا علم بلند کیا تھا لیکن مسلمان اس بغاوت میں پیش پیش تھے۔ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد اس بغاوت میں کہیں زیادہ تھی لہٰذا مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔

چوں کہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے گیا تھا۔انگریزوں نے مغلوں سے حکومت چھینی تھی لہٰذا ہندوستان پر انگریزوں کے قابض ہونے کا سب سے زیادہ غم مسلمانوں کو تھا۔اس بات کا حکومت کو بخوبی اندازہ تھا لہٰذا وہ ہر مسلمان کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے بھی مسلمانوں کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔حکومت کو مسلمانوں پر ذرہ برابر یقین نہ تھا محض شک کی بنا پر مسلمانوں کو قید خانوں میں ڈال دیا جاتا، مسلمانوں کی صنعتوں کو برباد کر دیا گیا، سرکاری ملازمتوں اور دیگر سرکاری سہولتوں سے محروم کر دیا گیا یعنی ہر طرح سے مسلمانوں کو زدوکوب کیا گیا۔عرصۂ دراز تک مسلمان اس طرح انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوتے رہے۔مولانا حالؔی لکھتے ہیں:۔

> ''گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی خیر خواہ ہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔مسلمانوں کو مجرم قرار دینے

*ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے
کے لیے کافی تھا۔''[۱]

سرسید ان تمام حالات سے باخبر تھے اور مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے سلوک کو دیکھ رہے تھے۔ان کا دل قوم کی روز بروز ہوتی ابتری سے بے حد مغموم تھا۔وہ جانتے تھے کہ جب تک حکومت کی ہمدردی اور سرپرستی مسلم قوم کو حاصل نہیں ہوگی تب تک اس کا ابتری اور ذلت سے نکلنا ناممکن ہے۔

سرسید اس فکر میں مستغرق تھے کہ کس طرح حکام کے دل سے مسلمانوں کے لیے نفرت کو مٹایا جائے اور اس غلط فہمی کو دور کیا جائے کہ مسلمان حکومت کے دشمن اور بدخواہ نہیں ہیں۔اس الزام سے مسلمانوں کو بری کرانے کے لیے انھوں نے ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' تصنیف کیا جو ۱۸۵۹ء میں ''مطبع مفصیلٹ گزٹ آگرہ'' سے چھپ کر تیار ہوا۔

یہ رسالہ سرسید کی بے شمار قومی وملی خدمات میں سے ایک اعلیٰ ترین خدمت ہے۔سرسید نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں انگریز حکام کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ یہ بغاوت کوئی سوچی سمجھی سازش نہیں بلکہ فوج کے چند سپاہیوں کی نافرمانی تھی اور اس فوجی سرکشی کی ذمہ دار بھی خود برطانوی سرکار کی بدعنوانی اور بدسلوکی تھی، جو ہندوستانیوں کے ساتھ کی جارہی تھی۔اس رسالے میں سرسید نے ان تمام اسباب کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔سرسید نے جن حالات میں یہ رسالہ تصنیف کیا وہ ہندوستانی عوام کے لیے بے حد پرخطر دور تھا۔ادنیٰ سی کوتاہی انگریزوں کے عتاب کا سبب بن سکتی تھی لیکن سرسید انجام کی پرواہ کیے بغیر قوم وملت کی آبیاری کرتے رہے اور اس جذبے کے ساتھ انہوں نے یہ رسالہ تصنیف کیا اور اس کی پانچ سو جلدیں ولایت روانہ کیں اور ایک جلد حکومت ہند کے سامنے پیش کی۔

رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کا آغاز اس سوال سے کیا گیا ہے کہ ''کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟''۔پہلے ''سرکشی'' کے معنی ومفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سرسید نے اس کی پانچ مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔اول نوکر یا رعیت کا اپنے گورنمنٹ سے لڑنا یا مقابلہ کرنا دوسرا مخالفانہ ارادے سے حکم کا نہ ماننا اور نہ بجالانا، تیسرا مخالفوں کی مدد کرنا اور ان کا شریک ہونا، چوتھا رعیت کا نڈر ہوکر آپس میں لڑنا اور حد معینہ سے تجاوز کرنا اور پانچواں یہ کہ اپنی گورنمنٹ کی محبت اور خیرخواہی دل میں نہ رکھنا اور مصیبت کے وقت طرف داری نہ کرنا۔سرکشی کی معنوی وضاحت کے بعد بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بہت سی وجوہات تھیں جو عرصۂ دراز سے ہندوستانیوں کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔جو ایک جذباتی ابال کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی فوجی سرکشی کی شکل میں منظر عام پر آئیں۔سرسید لکھتے ہیں:

''سرکشی کا ارادہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اس کا سبب ایک ہی ہوتا ہے یعنی
پیش آنا ان باتوں کا جو مخالف ہوں ان لوگوں کی طبیعت اور طینت اور ارادہ

www.urduchannel.in

اورعزم اوررسم ورواج اورخصلت اور جبلت کے جنہوں نے سرکشی کی۔''[۲]

چوں کہ کوئی بھی بغاوت اچانک رونما نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے اسباب وعلل کا ایک طویل سلسلہ کارفرما ہوتا ہے لہٰذا ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پیچھے بھی بہت سے اسباب پوشیدہ تھے۔ سرسید نے اپنے اس رسالے میں ان اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جو اس بغاوت کی وجہ بنے۔ اس سرکشی کے تمام اسباب کو انھوں نے پانچ اصولوں کے تحت بیان کیا ہے۔ عوام کا گورنمنٹ کی تجاویز کو غلط سمجھنا، ایسا طریقہ حکومت کا اختیار کرنا جو ہندوستانیوں کے مزاج اور عادات کے مناسب نہ تھا، گورنمنٹ کی عوام کے حالات اور ان کے مصائب سے ناواقفیت، حکومت کے لازمی امور کا ترک کر دینا اور فوجی بدانتظامی۔ سرسید کے مطابق یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے سرکشی رونما ہوئی۔

سرسید نے لیجس لیٹیو کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی نہ ہونے کو بغاوت کا اصل سبب قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ سے حکومت اور عوام میں کوئی رشتہ مستحکم نہ ہوسکا اور عوام حکومت کے نئے قوانین اور اصول وضوابط سے ناواقف رہی۔ مذکورہ قضیہ کی تصدیق کے لیے ان کا ایک قول نقل کرنا مناسب ہوگا:

''اصل سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں
وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔''[۳]

یہی وجہ تھی کہ عوام گورنمنٹ کی تجاویز کو غلط سمجھنے لگی اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط فہمی کا شکار ہوئی۔ دوسرا بڑا سبب مذہبی امور میں مداخلت ہے۔ لوگوں کو لالچ دے کر یا مجبوری کا فائدہ اٹھا کر مذہب تبدیل کرانا، مشنری اسکولوں کا استحکام، پادری کی وعظ ونصیحت، پادریوں کا دوسرے مذاہب کی مجالس میں شریک ہونا اور بائبل کی تعلیمات اور عیسائی مذہب کو فروغ دینے کے ساتھ دوسرے مذاہب کی ہتک کرنا عوام کے لیے بے حد غم وغصے کا باعث بنا۔ لوگوں کو اس سے شدید صدمہ پہنچا۔ ہندوستانیوں کو اس بات کا خوف تھا کہ حکومت ان کو ہر طرح سے مجبور کر کے عیسائی بنا دے گی اور جیسے جیسے برطانوی حکومت بڑھتی جائے گی اسی قدر ہمارے رسوم ورواج اور مذہبی عقائد کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسکولوں اور کالجوں میں طریقۂ تعلیم کی تبدیلی بھی لوگوں میں وحشت کا سبب تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جدید تعلیم نسواں کے نام پر عورتوں کو بے پردہ کرنا ہے۔ انہیں حالات میں جب کہ لوگ اس ذہنی انتشار میں مبتلا تھے۔ ایک عیسائی پادری ''سے ایڈمنڈ'' نے تمام سرکاری ملازموں کو خطوط بھیجے، جس میں عیسائی مذہب قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے بعد لوگوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور وحشت پھیل گئی اور ہندوستانی انگریزی حکومت کو اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔

دوسرے اصول میں سرسید نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں خواتین کی خودمختاری، ارضیات کی ضبطی اور

www.urduchannel.in

زمینداروں کی بربادی کو بھی بغاوت کا ایک بڑا سبب بتایا ہے۔ ارضیات کی ضبطی عوام میں گورنمنٹ سے متنفر ہونے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ حکومت نے لوگوں سے ان کی آبائی زمینیں چھین لیں اور معاشی طور پر ان کو بالکل محتاج کر دیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے حیلوں سے غریب عوام کی زمینیں ضبط کر لی گئیں جو ان کی معاش کا واحد ذریعہ تھیں۔ حکومت نے مال گزاری کا بہت سخت بندوبست کیا تھا چوں کہ مال گزاری کا سارا بوجھ کاشتکاروں پر تھا لہذا مال گزاری ادا نہ کر پانے کی پاداش میں ان کو اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ ان حالات نے کسانوں اور زمینداروں کو مفلسی کا شکار کر دیا ایسے میں عوام کا حکومت سے متنفر ہونا لازمی تھا۔ ہندوستان میں تعلقہ داراور عملداری کا نظام برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ یہ زمینداری ان کے آباواجداد کا ورثہ تھی لہٰذا تعلقہ دار اپنی عمل داری کو بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حکومت نے رہن وقرض کے عوض میں زمینداریوں کی نیلامیاں کرادیں اور تعلقہ داروں کو تباہ و برباد کر دیا جس سے پورے ملک میں فساد برپا ہو گیا۔ اس طرح زمینوں کی ضبطی، مال گزاری کے لیے سخت بندوبست اور زمینداری کی نیلامی نے ملک میں ایک بڑی آبادی کو مفلسی، معاشی تنگی اور محتاجی میں مبتلا کر دیا۔ جس سے پورے ملک میں حکومت سے بیزاری پیدا ہو گئی۔

تیسرے اصول میں گورنمنٹ کی عوام سے ناواقفیت کو سرکشی کا سبب بتایا گیا ہے۔ گورنمنٹ ہندوستانیوں کی عادات واطوار اور خیالات سے یکسر ناواقف تھی۔ عوام کے مصائب اور دکھ درد کا حکومت کو ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا اور نہ ہی حکام نے عوام کے حالات سے باخبر ہونے کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ جس سے لوگ حکومت کو بے درد اور ظالم سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ جو حاکم اضلاع پر نافذ کیے گئے تھے وہ عوام کے ساتھ بہت ہتک آمیز سلوک کرتے اور لوگوں سے کوئی ہمدردی نہ رکھتے تھے۔ ان کی بدزبانی اور سخت مزاجی نے ہندوستانیوں کو بہت رنجور کیا۔ پنشن کا بند ہونا بھی ایک اہم سبب ہے۔ مغلوں کے زمانے سے عوام کے لیے مخصوص رقم بطور پنشن مقرر کی گئی جو ایک زمانے سے عوام کو مل رہی تھی۔ انگریزی حکومت نے ان پنشنوں کو بھی بند کر دیا جس سے حالات اور ابتر ہو گئے۔

چوتھے اصول میں سرسید بادشاہانہ دربار کا نہ ہونا، انگریزی دور حکومت میں ہندوستانیوں کی کوئی ترقی نہ ہونا، حکومت کا ہندوستانیوں سے محبت اور اتحاد نہ کرنا، ہندوستانیوں کی بے توقیری اور حکام اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی کو بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اہم اسباب قرار دیتے ہیں۔ مغلوں کے زوال سے پہلے ہندوستانی عزت کی زندگی گزار رہے تھے خاص طور پر مسلمان جو طویل عرصے تک اس ملک میں حکمراں رہے لہٰذا ان کی عزت نفس پر یہ بے توقیری بے حد گراں گزرتی تھی اور وہ جو عزت دار زندگی گزارنے کے اہل تھے وہ برطانوی حکومت میں ان کو نصیب نہ ہوئی اور آئندہ بھی اس کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی لہٰذا یہ لوگ سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔

www.urduchannel.in

پانچویں اصول میں فوجی بدانتظامی کا ذکر کیا گیا ہے۔فوجی بدانتظامی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی خاص وجہ تھی۔میرٹھ کے فساد کے بعدفوج کواس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ حکومت کواب ہندوستانی فوج پر بھروسہ نہیں رہا لہٰذا موقع پاتے ہی حکومت ہندوستانی فوجوں کا خاتمہ کردے گی اس خیال نے فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا،سرسید نے انگریزی سرکار کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر حکومت ہندواور مسلمان کی الگ الگ فوج تیار کرتی ہے تو اس بغاوت کو رونما ہونے سے پہلے ہی فرو کیا جاسکتا تھا چوں کہ ہندواور مسلمان دونوں قوموں نے متحد ہوکر بغاوت کی تھی لہٰذا اس پر قابو پانا حکومت کے لیے مشکل ہوگیا۔

سرسید تاہم اسی فکر میں مستغرق رہے کہ کس طرح قوم کو پستی سے نکالا جائے اور مسلم قوم کو کامیابی وکامرانی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ان کی پوری حیات ایک مسلسل جدوجہد ہے جو قوم کے لیے کی گئی۔رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' بھی ان کی بے شمار خدمات میں سے ایک ہے سرسید نے اس پرآشوب دور میں اپنی قوم کے لیے انگریزوں کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور بڑے عزم وحوصلے کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔

حواشی:

(۱) حیات جاوید،مولانا الطاف حسین حالؔی،اشاعت اول،ترقی اردو بیورو نئی دہلی،۱۹۷۹ء ص:۹۴

(۲) ایضاً،ص:۸۰۶

(۳) ایضاً،ص:۸۱۳

www.urduchannel.in

تصنیف عزیز*

سرسیداحمدخاں کی تاریخی حسّیت

انیسویں صدی میں نمایاں ہونے والی چند ایسی تاریخ ساز ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔ان میں ایک اہم اور روشن نام ''سرسیداحمدخاں'' کا ہے۔جوایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔دوراندیشی اورحکمتِ عملی ان کی شخصیت کی خاص خوبی ہے جس کی مدد سے سرسیداحمدخاں نے اپنے دور میں ناسازگار ماحول کے باوجود اپنے فکروعمل اورحکمتِ عملی سے وقت کے دھارے کا رخ موڑا اوراپنی قوم کوروشنی کی کرن دکھائی۔

سرسیداحمدخاں کی ہمہ گیرشخصیت یوں تو کئی اعتبار سے منفرد ہے۔کیوں کہ ان کی شخصیت میں بیک وقت اتنی ساری صلاحیتیں موجود تھیں کہ کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔وہ ایک مذہبی مفکر،مفسّر، مصلح قوم،صحافی،اورانشاء پرداز تھے اورساتھ ہی ایک مؤرخ کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ان کی ابتدائی زندگی پرنظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرسیدکوشروع سے ہی تاریخی واقعات وحقائق میں دلچسپی تھی۔اوریوں بھی انھیں اپنے بزرگوں کی تاریخ اوران کے ورثہ کی اہمیت وقدر کا احساس تھا۔اورساتھ ہی احساسِ فخر بھی۔سرسیداپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:

> ''ہمارے بزرگوں نے اس دنیا میں،کیاعلم میں اورعمل میں،کیادولت میں کیا حکومت میں،کیاشان میں اورکیاشوکت میں،کیارزم میں اورکیابزم میں،کیسا کچھ اعلیٰ درجہ حاصل کیا تھا۔جس کے سبب تمام قوموں میں منفرد تھے۔''[۱]

چنانچہ سرسید کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی تاریخ سے واقفیت رکھنا دوسروں کے لیے بھی ضروری ہے۔اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

> ''کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بےعزّتی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی قوم کی

*ریسرچ اسکالر،شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

www.urduchannel.in

تاریخ کو بھول جائے۔اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔''[۲]

یہی سبب ہے کہ سرسید کی شروع کی تحریریں ان کی ذات میں تاریخی حسّیت کا پتہ دیتی ہیں۔سرسید احمد خاں ایک ایسے دور میں جی رہے تھے جب مغل حکومت زوال پذیر ہورہی تھی اور ساتھ ہی مسلم حکمرانوں کے فن تعمیر کا بھی خاتمہ ہورہا تھا۔چنانچہ سرسید نے اپنے ملک کی زوال پذیر ہوتی ہوئی تہذیب اور قدروں کے لیے ضروری خیال کیا کہ ہم اپنے بزرگوں کے ورثہ اور تہذیب واقدار کی حفاظت کریں۔لہٰذا انھوں نے ہندوستان کے قدیم اثاثہ کو محفوظ رکھنے کے لیے تاریخ سے متعلق چند کتابیں لکھیں۔جن کا یہاں مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں نے اپنی علمی اور تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۸۳۹ء سے کیا۔جسے آخری وقت تک جاری رکھا۔۱۸۳۹ء میں وہ آگرہ میں تھے۔جہاں انھیں کمشنری میں نائب منشی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔انھوں نے وہاں رہ کر ایک کتاب ''جامِ جم'' آگرہ کے ہی ایک کمشنر رابرٹ ہیملٹن کی فرمائش پر لکھی۔اس کتاب میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے مختصر لیکن جامع حالات درج ہیں۔جس میں بادشاہوں کے آبا اجداد کے نام، بادشاہوں کی پیدائش، تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔اس طرح یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں شامل مواد حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کے موضوع پر سرسید کا ایک اہم کارنامہ ''آثارالصنادید'' ہے۔جسے سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔یہ کتاب تاریخ نگاری کی نئی جہات سے آشنا کرتی ہے۔یہی سبب ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ ہوجانے کے باوجود یہ کتاب آج بھی دلی کے آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے لیے اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔حالاں کہ ''آثارالصنادید'' سے قبل سنگین بیگ ولد علی اکبر بیگ کی ''سیرالمنازل'' نامی کتاب سامنے آتی ہے جس نے دہلی کی تاریخی عمارتوں کا بغور مطالعہ کیا اور ۱۸۱۹ء میں اپنے اس کام کو کتاب کی شکل میں پیش کیا۔لہٰذا ممکن ہے کہ سرسید نے ''آثارالصنادید'' اس کتاب سے متاثر ہوکر لکھی ہو۔سرسید نے آثارالصنادید جیسی مستند کتاب ۱۸۴۶ء میں لکھنا شروع کی اور بڑی محنت وکاوش سے اس پر کام کرنے کے بعد اسے مکمل کرکے ۱۸۴۷ء میں شائع کرایا۔اس کے پہلے ایڈیشن میں چار باب تھے۔جس کی ترتیب جغرافیائی اعتبار سے ہے۔پہلے باب میں مغل دور سے پہلے کی عمارتوں کا ذکر ہے۔دوسرے باب میں مغلوں کے قلعہ کی عمارتوں کو پیش کیا گیا ہے۔تیسرے باب میں شاہجہاں آباد شہر کا بیان ہے۔آخری اور چوتھے باب میں دلی اور اس کے عوام کا بیان شامل ہے۔اس کے علاوہ اس پہلے ایڈیشن میں شاعری بھی ملتی ہے اور اس میں اردو نثر بھی مرصع استعمال کی گئی ہے۔غرض سرسید نے انتھک محنت کے بعد یہ کتاب تیار کی۔

لیکن کچھ عرصہ بعد سرسید نے اس پہلی اشاعت میں مزید اضافوں کی گنجائش محسوس کی۔اور ایڈورڈ طامس نے بھی

www.urduchannel.in

سرسید کواس کام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنے پر اصرار کیا۔جس میں پہلے ایڈیشن کے بقدر کافی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔شاعری سے احتیاط برتی گئی۔اردو نثر بھی سادہ،آسان،اور غیر مرصّع انداز میں استعمال کی گئی تھی۔کتاب کے آخر میں تین تقاریظ بھی شامل ہیں۔جو غالب،امام بخش صہبائی اور مولانا صدرالدین آزردہ کی ہیں۔اس کے علاوہ فرانسیسی مفکر گارساں دتّاسی نے ''آثارالصنادید'' کا فرانسیسی میں ترجمہ کر کے اسے ۱۸۶۰ء میں پیرس سے شائع کیا۔اور انگریزی میں اس کا ترجمہ آرناتھ نے ۱۹۷۹ء میں کیا۔

سرسید نے اپنے تاریخی کارناموں میں ایک کام تاریخی مرقعوں کے متون کی صحت سے متعلق بھی انجام دیا۔اور اس سلسلے میں سرسید نے ''آئینِ اکبری''،''تاریخِ فیروز شاہی''،''تزک جہانگیری'' تین کتابیں ترتیب دیں۔بقول ''خلیق انجم''سرسید پہلے متنی نقّاد ہیں جنھوں نے انتہائی سائنٹفک انداز میں تین فارسی کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن تیار کئے۔''

ان میں ''آئینِ اکبری''ابوالفضل کی مشہور کتاب ہے جو اکبر کے عہد میں لکھی گئی۔اس میں اکبر کے عہد میں نظامِ حکومت میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہے۔اس کتاب کی تصحیح کا کام سرسید نے ایک تاجر کی فرمائش پر شروع کیا اور مختلف نسخوں کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی،اس میں مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح کی۔تصاویر کا اضافہ کیا اور تنقیدی تحقیق کے بعد ۱۸۵۵ء میں اس کتاب کی پہلی اور تیسری جلد شائع کرائی۔اس پر غالبؔ نے سرسید کی ہی فرمائش پر ۱۳۸ اشعار پر مشتمل تقریظ لکھی۔لیکن سرسید نے اس تقریظ کو اپنی مرتّبہ کتاب میں شامل نہیں کیا۔اس سلسلے میں ناقدین کی مختلف آراء ہیں کہ سرسید کو غالبؔ کا یہ ترقی پسندانہ انداز اچھا نہیں لگا۔لیکن ''خلیق انجم''اس کے برعکس اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آئینِ اکبری'' کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے میں سرسید نے بہت جان کھپائی تھی۔انھوں نے متنی تنقید کے اس طریقۂ کار کو برتا تھا،جو متنوں کے تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کے لیے مغرب میں رائج تھا اور جس سے ہندوستانی بالکل نا آشنا تھے۔ہندوستان میں یہ پہلا تنقیدی ایڈیشن تھا،جسے متعدد نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا اور جس کے حواشی اور تعلیقات خاصے سائنٹفک انداز میں لکھے گئے تھے۔سرسید اپنے اس کام کی داد چاہتے تھے۔یہ ممکن نہیں ہے کہ سر سید نے غالبؔ سے فرمائش کرتے ہوئے اپنے طریقۂ کار اور محنت کا ذکر نہ کیا ہو۔ان کی یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ غالبؔ تقریظ میں ان چیزوں کا ذکر کریں گے۔غالبؔ متنی تنقید کے فن سے ناواقف تھے۔انھیں دیدہ ریزی اور جانفشانی

www.urduchannel.in

سے کئے گئے اس کام کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔''[۳]

اس وضاحت کے بعد مزید آگے لکھتے ہیں:

''وجہ صرف یہ تھی کہ غالبؔ نے سرسید کی محنت کی داد دینے کے بجائے مغربی تہذیب اور ان کی سائنسی ایجادوں کی تعریف کی تھی۔اس لیے سرسید نے تقریظ شامل نہیں کی۔''[۴]

اس کے بعد سرسید نے ''آئینِ اکبری'' کی دوسری جلد کچھ وقت کی تاخیر سے تیار کر کے چھپنے کے لیے پریس بھیجی،لیکن غدر ہو گیا۔جس سے دوسری جلد کا تمام مسودہ اس کی نذر ہو گیا۔

ضیاالدین برنی کی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' کی تصحیح سرسید نے بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سیکریٹری کی فرمائش پر کی۔اس میں بھی سرسید نے بڑی محنت سے کام کیا۔اور ایک مستند نسخہ تیار کر کے ۱۸۶۲ء میں شائع کرایا۔ضیاالدین برنی کی یہ کتاب اپنے وقت میں بھی معتبر تھی۔اور سرسید کی ترتیب وتصحیح کے بعد آج بھی مستند مانی جاتی ہے۔

''تزک جہانگیری'' تاریخ سے متعلق یہ سرسید کا آخری تاریخی کام ہے۔اگر چہ تاریخ سے ان کی ذوق اور دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن سرسید قوم کی اصلاح،فلاح و بہبود اور دوسرے کاموں میں زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔اس لیے اس کتاب کی ترتیب میں بھی زیادہ وقت نہیں دے سکے۔اور مختلف نسخوں کی مدد سے صرف متن کی تصحیح کر کے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں غازی پور سے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔

مذکورہ بالا کتابوں کے مختصر جائزے کے بعد سرسید کی ذات میں ان کے تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے کس ذوق وشوق اور دلچسپی سے اپنی تحریروں میں ہندوستان کی تاریخ اور خاص طور سے دہلی کی تاریخ،تہذیب اور آثارِ قدیمہ کو یکساں طور پر محفوظ کیا ہے جو آج بھی اہمیت کی حامل ہیں۔اور بعد میں آنے والوں کے لیے بھی ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

حواشی:

(۱) سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح،مرتبہ:منشی سراج الدین،تاجر کتب قومی لاہور،۱۸۹۰ء،ص: ۱۶۳

(۲) سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح،مرتبہ منشی سراج الدین صاحب،تاجر کتب قومی لاہور،۱۸۹۰ء،ص: ۱۴۴

(۳) خلیق انجم،از مضمون: سرسید بحیثیت مؤرخ،مشمولہ فکر وآگہی،علی گڑھ نمبر،۲۰۰۰ء،ص: ۱۳۴

(۴) ایضاً

www.urduchannel.in

ناهیدہ خاتون*

سرسید کے تعلیمی تصور میں تعلیم نسواں کے عناصر

اقوام کی تاریخ میں سرسید احمد خاں انیسویں صدی کے وہ بالغ نظر اور مآل اندیش مرد قلندر ہیں جن کی شخصیت تقریباً دو صدی گزر جانے کے بعد بھی اپنی معنویت اور افادیت میں کلیدی شاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کس قدر اعتدال، سلجھاؤ، ژرف نگاہی اور دور بینی ملتی ہے اور بعض مسائل کے متعلق ان کی رائے اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ صائب اور قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل ہند خصوصاً مسلمانان ہند کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ جسے دیکھ سرسید مضطرب ہو اُٹھے انھوں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ دگرگوں سیاسی حالات اور تہذیبی و اقتصادی انحطاط بالخصوص مسلمانانِ ہند کی ناگفتہ بہ صورت حال کا معروضی مطالعہ کر کے قوم وملت کی تعمیر نو کا بیڑا اُٹھایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو خواب وخیال کی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا کی طرف، ذاتی فلاح سے قومی بہبود کی طرف، اندھی وفرسودہ رسم ورواج کی گرفت سے نکال کر حیرت فکر اور عقلیت کی طرف اور قدیم اسالیب فکر سے جدید عالمی معیاروں کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے لوگوں کو صرف خواب ہی نہیں دکھائے بلکہ اسے حقیقت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسی خواب کو حقیقت بنانے کی خاطر انگلستان کا دورہ کیا۔ ایک سال پانچ مہینے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے۔ وہاں انھوں نے تعلیمی اداروں اور ان کے نظم ونسق کا عمیق مشاہدہ کیا، شرفاء اور ماہرین علوم وفنون کی محفلوں سے روبرو ہوئے۔ مغربی عورت کی شائستگی ان کے تعلیمی وعلمی رجحانات کے علاوہ طریقۂ زندگی سے کافی حد تک متاثر ہوئے۔ ان کو نہایت تاسف ہوا کہ ہماری ہندوستانی عورت کے متعلق مغربی عورت کے قلوب واذہان میں کیسے ادنیٰ وفرسودہ خیالات ہیں۔ اپنے سفرنامہ ''مسافرانِ لندن'' میں صفحہ نمبر ۱۰۹ پر سرسید فرماتے ہیں کہ..... ''جب عورتیں یہ سنتی ہیں کہ

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو وفارسی، ویرکنور سنگھ یونیورسٹی آرا (بہار)

www.urduchannel.in

ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور صلہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو بڑا تعجب ہوتا تھا۔''

دوسری جانب سرسید کے متعلق لوگوں کی ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ان کی ساری تعلیمی سعی صرف لڑکوں کی خاطر تھی لڑکیوں کے لیے نہ تھی۔ ایسے تخیلات کے لوگ اپنے محدود مطالعہ اور تعصب و تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ تعلیم نسواں سے متعلق سرسید کے تصورات و نظریات کو جاننے و سمجھنے کے لیے اس دور کے معاشرتی نظام اور مسلمانوں کے مزاج و تخیلات کی واقفیت بے حد ضروری ہے۔ سرسید کے عہد میں انگریزی حصولِ تعلیم اور فروغ کو جرم تصور کیا جاتا تھا ان کے حمایتی کو کافر خیال کیا جاتا تھا۔ مردوں میں انگریزی تعلیم سے رغبت کا فقدان تھا اور عورت میں تو بالکل تھا ہی نہیں۔ ایسے پر اصرار حالات میں لڑکیوں میں جدید تعلیم کی تحریک سرسید کا دانش مندانہ قدم ثابت نہ ہوتا، بلکہ قوم میں تفریق ڈالنے کے مترادف خیال کیا جاتا۔ انہیں وجوہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ پہلے مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ جب ان کے اندر تعلیم کی روشنی پھیلے گی اور وہ علم کی اہمیت سے روشناس ہو جائیں گے تو خود بخود عورتوں کی تعلیم کی طرف راغب ہوں گے۔ اپنے اس تصورات کی وضاحت انھوں نے پنجاب کے سفر کے دوران خواتین کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ.....''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو.....تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے''۔ اس نظریے کی تائید میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں.....''اس وقت ہم عام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں۔ عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کے فرسودہ خیالات نے ان میں بہت سی دینی اور معاشرتی خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔ جس کے باعث عورتیں اسلام کی عطا کردہ سیاسی، اقتصادی و معاشرتی حقوق سے بھی محروم تھیں۔ جو حقوق مغرب والوں نے عورتوں کو انیسویں صدی میں جدوجہد کے ذریعہ عطا کیے اسے اسلام مذہب نے ساتویں صدی میں ہی دے دیا تھا۔ پس ہمیں اس پر عمل درکار ہے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں کی پستی، عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کی وجہ سے ہے۔ قوم کی ترقی میں عورتوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ قوم کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ صحت مند تربیت بھی درکار ہوتی ہے جو عموماً عورتوں سے ہی ممکن ہے بڑے تاسف کی بات ہے کہ ہماری قوم میں خواتین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سرسید

www.urduchannel.in

کے نظریے کے مطابق عورت ہی ایسی ہستی ہے جو سماج کو خواب سے بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ ایک دفعہ خاتون پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں سرسید نے ان الفاظ میں عورتوں کی عزت افزائی کی..... ''اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔''

سرسید احمد خاں عورتوں کے پردے کے بھی علم بردار اور نقیب تھے۔ اس کے باوجود عورتوں کی تعلیم و تعلم کے آرزو مند تھے۔ وہ ہر دل میں علم کی شمع روشن کرنا چاہتے تھے تاکہ قوم کی تمام ترقی کی منازل کو طے کیا جا سکے۔ جب مس کارپینٹر نے ان سے تعلیم نسواں کی بابت رائے معلوم کی تو انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ..... ''میں خدا سے چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں مرد کیا عورت بھی سچائی و علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہیں روشن ضمیری حاصل کریں''۔ مرد و زن کی معاونت سے ہی ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ دونوں کو خود کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا ہوتا ہے۔ عورت کی حقیقی دنیا گھر ہوتا ہے وہ اپنے حسنِ تدبیر سے گھر کو نمونۂ جنت بنا دیتی ہے یہ ذمہ داریاں اس کی مخصوص فطرت کی وجہ سے ہی اس پر عائد ہوتی ہیں۔ درحقیقت یہ ساری خوبیاں خواتین کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہی منحصر ہیں۔ جب تک خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی وہ بچوں کی تربیت اور معاشرے کی تشکیل میں تعاون کرنے میں قاصر رہیں گی۔ سرسید نے تعلیم نسواں اور حقوق نسواں دونوں پر خصوصی توجہ دی۔

لندن کے سفر میں جہاز پر اتفاقاً انگریز مصلح میری کارپینٹر کی ملاقات سرسید سے ہوئی اور تعلیم نسواں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ ''جب سے میں نے ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورت کے سنا تھا میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان کی ملاقات ہوگئی''۔ سرسید احمد کی یہ حکیمانہ بصیرت اور مآل اندیشی بالکل درست ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کی جانب سے عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیم سے متعلق مطالبات کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لوگوں نے اعتراف کیا کہ عورتوں کی جہالت قوم کی ترقی میں مانع ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی قرارداد میں تعلیم نسواں سے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالتوں میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی کوشش لازمی ہے کیوں کہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔ یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو''۔

بعد ازاں ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ ''شعبۂ تعلیم نسواں'' قائم کیا گیا اور لوگوں کو سرسید کی

www.urduchannel.in

اصلاحی مصلحت اور حقیقت بینی کا قائل ہونا پڑا۔ ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا پہلا مدرسہ بالائے قلعہ علی گڑھ کے ایک مکان میں استانی اختری بیگم (شیخ عبداللہ کی شریک حیات) کی نگرانی میں قائم ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں لڑکیوں کا یہ اسکول انٹرمیڈیٹ تک ہوگیا جو سرسید کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔

سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانان ہند کے لیے تمام پستی وتنزلی کے امراض کا نسخۂ کیمیا قرار دیا۔ قوم کی ترقی و سربلندی کے متعلق ان کی تمام ترسعی وپیہم بارآور ثابت ہوئیں۔ آج ہماری قوم میں تہذیب و شائستگی، ترقی یافتہ رجحانات، دینی اخوت اور روشن خیالی رفتہ رفتہ امتیازی حیثیت حاصل کرتی جارہی ہے۔

○

www.urduchannel.in

فرحان خان*

رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا اور اس کے اغراض ومقاصد

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حامل صدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک طرف ملک وقوم میں سیاسی انتشار، ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ عظیم، بغاوتی ہنگاموں اور انقلابی دور کا شکار رہی جس کے زخم تاریخ کے صفحات سے کبھی نہیں دھل سکتے، دوسری طرف ملک میں مختلف علماء، دانشور، اور محسن الملک نظر آتے ہیں جنہوں نے نہ صرف ملک وقوم کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔غرض کہ انیسویں صدی مجموعی طور پر ملکی، سیاسی، مذہبی اور ادبی تحریکات کا پیش خیمہ رہی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ عظیم حکومت کے خلاف ایک قومی بغاوت تھی جس کی بنا پر ملک کو مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑا چوں کہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے حاصل کی تھی اس لیے یقینی طور پر انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن مسلمان ہی تھے جس کے سبب انگریزوں کے ظلم و بربریت اور عتاب کی بجلی مسلمانوں پر گرنا فطری بات تھی۔اس ہنگامی صورت حال سے مسلمان تباہی اور بربادی کے طوفانی بھنور میں ایسے پھنس گئے کہ کنارے پر آنے کا موقع نہیں ملا۔سیاسی اور سماجی طور پر مسلمان اپنا وقار اور مقام مکمل طور پر کھو چکے تھے۔مسلمانوں کو راہ راست پر لانے اور ان کا کھویا ہوا وقار و مقام واپس دلانے کے لیے سرسید احمد خاں نے منظّم کوشش کی اور ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے کہ جس سے ملک وقوم کو دوبارہ ترقی کے راستے پر لایا جا سکے۔سرسید احمد خاں کے مختلف کارناموں میں ایک اہم کارنامہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا تھا جس کا مقصد مسلمانان ہند کو تعلیم وترقی کی طرف رجوع کرانا تھا۔سماجی، معاشرتی، اور تہذیبی قدروں کو برائی سے پاک کرنا، پسماندگی اور بداخلاقی سے نجات دلانا تھا۔

سرسید احمد خاں کا سفر انگلستان ان کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کی ایک اہم کڑی ہے۔انھوں نے انگلستان کا سفر ایک مقصد کے تحت کیا تھا، وہ مقصد تھا سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' (جس میں نبی پاکؐ کی شان میں گستاخی کی تھی)

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

کا مدلل اور سائنٹفک انداز میں جواب لکھنا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم مقصد مغربی طریقۂ تعلیم کی نسبت معلومات، اسباب وعلل دریافت کرنا جس نے مغربی ممالک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا اور تعلیمی پالیسی، تہذیبی صورت حال کا جائزہ لینا مقصود تھا۔ سرسید احمد خاں اس وقت بنارس میں جج کے عہدے پر فائز تھے لہٰذا بنارس سے ہی وہ اپنے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود خداداد بیگ اور اپنے خادم چھجو کے ہمراہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہوگیے۔

سرسید احمد خاں نے جب انگلستان کی تعلیم وتہذیب کا مطالعہ وموازنہ کیا۔ وہاں کے عجائب خانوں، کتب خانوں اور دیگر تعلیمی اداروں کا بغور معائنہ کیا جس سے متاثر ہوکر انہوں نے بھی مغربی طرز تعلیم اور جدید علوم وفنون کو ہندوستان میں رائج کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چوں کہ وہ مغربی تعلیم اور جدید علوم وفنون کو ہندوستان کے فرسودہ نظام تعلیم و تہذیب اور قدیم طرز تعلیم پر فوقیت دیتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ ماضی کی داستان کو بھلا کر مستقبل کی ترقی کا ذریعہ مغربی اور جدید علوم وفنون میں پیوست ہے۔

انگلستان میں جوزف ایڈیسن اور چرڈ اسٹیل نامی دو ایسے ادیب گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اسپیکٹیٹر (یکم مارچ ۱۷۱۱ء) اور ٹیٹلر (۱۲/اپریل ۱۷۰۹ء) جیسے معروف رسالے جارے کیے۔

انگلستان میں چوں کہ سر رچرڈ اسٹیل نے ۱۲/اپریل ۱۷۰۹ء میں ایک پرچہ ٹیٹلر جاری کیا تھا جو کچھ عرصہ بعد بند ہوگیا پھر جوزف ایڈیشن نے ۱/مارچ ۱۷۱۱ء کو اسپیکٹیٹر نام سے ایک پرچہ جاری کیا جس کا مقصد وہاں کی تعلیم وتہذیب اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح کرنا تھا اور انگریزی معاشرے کی غلط روایات، تہذیب ورواج کو مہذب بنانا تھا۔ ممکن ہے کہ سرسید کی نظر سے یہ دونوں رسالے گزرے ہوں اور انہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہو جس سے ان کی سوچ وفکر اور ذہن کو پختگی حاصل ہوئی ہو۔ ایڈیشن اور اسٹیل کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

> ''ان پرچوں کے مذاق تحریر اور خیالات کے رنگ ڈھنگ نے بری تحریروں کے اسباب کو بتادیا۔ اور جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشاء پردازی کو جو کسبیوں کے بناؤ سنگار کے مانند تھی اور رنڈیوں کے سے طعنے مینے یا لونڈیوں کی سی گالم گلوچ کو تحریروں میں سے بالکل دور کردیا۔ اچھی اور بری تحریروں میں تمیز کرنا اور سنجیدہ ومتین نکتہ چینی اور تحقیقات کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت دونوں کو ترقی دی اور تحریر میں مناسب اور تہذیب کا خیال لوگوں کے دل میں بٹھادیا۔ ایڈیشن کی تحریروں سے بالتخصیص طرز عبارت بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ صاف وشستہ وسلیس اور نہایت دلچسپ ہوگی

www.urduchannel.in

اور درحقیقت ایڈیشن صاحب کی تحریر سے انگریزی زبان کے علم انشاء میں
ایک انقلاب عظیم واقع ہوگیا۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں ایڈیشن اور اسٹیل کی اصلاحی کوششوں سے حد درجہ متاثر ہوئے ہوں گے جس کے سبب انہوں نے بھی پختہ ارادہ کرلیا کہ لندن سے واپس جاکر ہندوستان میں اسی قسم کا رسالہ جاری کریں گے ''تہذیب الاخلاق'' کا خاکہ اور سرورق کا بلاک انہوں نے لندن میں ہی تیار کرلیا تھا۔ جس کے بارے میں محسن الملک کو یکم شوال ۱۸۷۰ء میں ایک خط میں لکھا:

''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا
ہے۔ اور ''تہذیب الاخلاق'' اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں ''محمڈن
سوشل رفامر'' رکھ لیا ہے اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے
کاغذ بھی ایک برس کے لیے لائق یہاں خرید لیا ہے۔''

سرسید نے دوسری جگہ محسن الملک کے نام ایک خط میں اپنے عزم کا بھی اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کردیں گے۔ اور اخبار مفت میں
باٹیں گے۔ اور بقیمت بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص
مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے۔ اور کچھ نہیں
ہونے کا اس میں اور آپ دونوں آرٹیکل لکھنے والے ہونگے۔ اور اگر اصلاح
ہوگئی تو منشی ذکاء اللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر بھی
آرٹیکل لکھنے شروع کریں گے۔''

بہرکیف انگلستان سے واپس آکر سرسید نے تہذیب الاخلاق کا اجراء ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو کیا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ خاص طور سے معاشرے کی تہذیبی، و اخلاقی قدروں کا حامل ہوگا ''تہذیب الاخلاق'' کے اغراض و مقاصد کے متعلق سرسید لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان کے حسن و معاشرت
اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام، مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور جو
حقیقت مذہب اسلام کے برخلاف ہے وہ بھی مٹائی''

www.urduchannel.in

''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ سرسید احمد خاں قوم کو تنگ نظری سے نجات دلا کر روشن خیالی پیدا کرنا چاہتے تھے لہٰذا مزید رقم طراز ہیں۔

> ''اس پرچے کے اجرا سے مقصد ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کو کامل درجے کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سولائزیشن یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔''

''تہذیب الاخلاق'' کے اغراض و مقاصد میں سب سے اہم مقصد بالخصوص معاشرے کی اصلاح کرنا تھا۔ سرسید نے معاشرے میں پھیلی ہوئی فرسودہ رسم و رواج، بداخلاقی، مذہبی کشمکش، توہم پرستی، قدامت پرستی وغیرہ جیسے پہلوؤں پر غور کر کے انہیں ان کی حقیقی شناخت کا چولا پہنانے کی کوشش کی۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء بالخصوص (محسن الملک، ذکاء اللہ، الطاف حسین حالؔی، وقار الملک اور محمد احسان اللہ) نے مختلف نوعیت کے مضامین لکھے۔ جو معاشرے کی اصلاح کے لیے مفید اور سودمند ثابت ہوئے لہٰذا اس کے سبب بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ ہندوستان مختلف عقائد کا مرکز و محور رہا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے عقیدے اور مذہبی رسومات پر یقین رکھتا ہے سرسید کے عہد میں بہت سی ایسی رسم و روایات شعوری طور پر پیدا ہو چکی تھیں جن کو مذہب کا لازمی جز تصور کیا جاتا تھا جس کی بنیاد عام طور پر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر قائم تھی لیکن حقیقت میں مذہب اسلام سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بات باور کرائی کہ وہ جن رسم و رواج کو مذہب سے جوڑ کر دیکھتے ہیں، اسلام میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سرسید چوں کہ عقلیت اور مقصدیت کے قائل تھے لہٰذا وہ سماج اور انسان کے تمام تر مسائل کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی، ادبی ہوں یا اخلاقی انہیں عقل پر فوقیت دیتے تھے۔ مسلمانوں میں توہم پرستی، قدامت پرستی، ترک دنیا، اندھی تقلید کی انھوں نے شدید مخالفت کی۔

سرسید ایک ایسے معاشرے کے خواہاں تھے جس کی عمارت تعلیم و تربیت، علم و ادب کی بنیاد پر قائم ہو۔ لہٰذا انھوں نے سماجی، مذہبی، تہذیبی اور قومی ترقی کے لیے تعلیم کو اولیت کا درجہ دیا۔ خاص طور سے تعلیم اطفال کو والدین پر فرض قرار دیا۔ چوں کہ بچوں کی پہلی درس گاہ والدین کی گود ہوتی ہے، ان کا کہنا تھا کہ والدین اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی جانب متوجہ ہوں علاوہ ازیں انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں تعلیمی مضامین کے ذریعہ جدید مغربی تعلیم کو درسی نصاب میں شمولیت کا پیغام دیا۔

کسی بھی معاشرے میں انسانی زندگی کے لیے حسن و اخلاق بنیادی اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید نے

www.urduchannel.in

تعلیم وتہذیب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی قوم بالخصوص مسلمانوں کو اخلاق کا درس دیا۔ان کے خیال کے مطابق اعلیٰ اخلاق ہی انسانی فطرت کے محافظ ہیں''تہذیب الاخلاق'' کا مقصد معاشرے میں تہذیبی واخلاقی قدروں کی نمائندگی کرنا تھا۔سرسید نے''تہذیب الاخلاق'' کے مقاصد کے تحت اپنے خیالات کے ذریعہ حسن وسلوک خصوصاً خواتین سے حسن وسلوک، خاتون خانہ کا احترام اوران کا مقام ومرتبہ متعین کرانے پرزور دیا۔مذہب اسلام میں چوں کہ خواتین کو خاص طور سے ان کے احترام ومقام کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اس لیے وہ بھی چاہتے تھے کہ عورتوں کے ادب واحترام کو برتری اور بلندی بخشی جائے۔

قومی ترقی اوراس کی اصلاح کے لیے سرسید نے جو خاکہ اپنے خطبات اور مضامین میں پیش کیا اس میں ہندو مسلم دونوں کو ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا۔''تہذیب الاخلاق'' میں اسی نوعیت کے مختلف مضامین کو شائع کر کے ہندوستانی عوام کو اتفاق واتحاد اور راہ حق کی تلقین کی گئی۔سرسید احمد خاں کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بغیر ترقی اور حصول آزادی کے خواب دیکھنا کوئی عقل مندی نہیں لہٰذا تاریخ عالم میں سرسید ایک ایسی غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں جنہوں نے باضابطہ سیکولر نقطۂ نظر کو اہمیت دی۔

مختصر یہ کہ سرسید نے''تہذیب الاخلاق'' میں جو مضامین شائع کیے جس کا مقصد خاص طور پر مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، قومی، اور معاشرتی اصلاح کرنا تھا''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ انھوں نے اصلاحی تحریک کو عام کرنے اور مسلمانوں میں جدید تعلیم وتہذیب کی روشنی میں معاشرتی شعور کو پیدا کرنے کی غرض سے صحافت کا سہارا لیا۔غرض کہ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے مردہ قوم کے جسم میں روح پھونکنے کا کام کیا۔

○

www.urduchannel.in

محمد سفیان احمد*

مقاصدِ سرسید اور عداوتِ فرنگ

سرسید احمد خان جامع الکمال اور جامع الاوصاف شخص تھے۔ وہ ایک مصلح، مفکر اور قوم کے رہبر تھے۔ انھوں نے قوم کی فلاح و بہبود کے لیے نئی فکر اور نیا نظریہ قائم کیا۔ ترقی کے لیے بہترین راہیں ہموار کیں اور قومی مفاد کے لیے حکومتِ وقت سے مطالبات بھی کیے۔ جس کے لیے انھیں اپنوں اور بے گانوں سے الٹی سیدھی باتیں سننی پڑیں، مذہبی رہنماؤں نے فتوے لگائے اور انگریزوں کی مخالفتیں بھی سہیں، اس کے باوجود سرسید نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ ان کے دل میں قوم کے لیے محبت اور جذبہ تھا۔ ان کے اندر انسانیت اور ہمدردی تھی۔ پہلی جنگِ آزادی میں شکست ہونے کے بعد مسلمانوں کی صورت حال خراب ہو چکی تھی، جس نے سرسید کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ قوم کو اس قیامتِ صغریٰ اور بدحال صورت سے کیسے نکالا جائے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

> ''سرسید احمد خان ان خاص بندگانِ خدا میں سے ہیں جنھوں نے خلقِ خدا، یا اپنی قوم یا دھن کی سچی اور بے لوث خدمت کی اور قوم کو ذلت و زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی کے راستے پر لگایا۔''[۱]

سرسید احمد خان کے زمانے میں برطانوی حکومت کا دبدبہ اپنے عروج پر تھا۔ اس حکومت کے آگے مغلیہ سلطنت کا دائرہ سمٹ گیا تھا، اور برطانوی حکومت آہستہ آہستہ ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے تک پھیل چکی تھی۔ یہ دور ہندوستانیوں کے لیے بڑا مشکل بھرا تھا، جس نے ۱۸۵۷ء کے ہولناک اور انتقامی حادثہ کے ذریعے دعوتِ قتل دی۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بیچ قتل عام شروع ہو گیا، لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ انگریزوں نے اس جنگ کا محرک مسلمانوں کو جان کر اپنی وحشت کا نشانہ بنایا اور مسلم قوم کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ زندگی بدتر اور خوفناک بن گئی۔ ۱۸۵۷ء غدر کے نام پر جہاں لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے وہیں سرسید نے لوگوں کی

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

مدد کی۔انہوں نے کئی انگریزوں کی جان بچائی اور ہندوستانیوں کو سمجھایا کہ جنگ مسئلے کا حل نہیں ہے۔اس عمل سے صرف اور صرف ہمارا نقصان ہوگا،اور ہوا بھی۔

سرسید نے غدر کے سلسلے میں ہوئی غلط فہمیوں پر غور وفکر کیا اور اس کے اسباب ومحرکات پر ایک کتاب رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے نام سے لکھ کر ۱۸۵۹ء میں شائع کیا۔جب یہ کتاب کاؤنسل میں پہنچی تو اس پر بحث ہوئی۔ کاؤنسل کے کئی ممبران سرسید کے مخالف ہو گئے۔لارڈ کیننگ اور بارٹر فریر نے اسے حکومت پر زبردستی کا الزام بتایا۔سسل بیڈن انڈیا گورنمنٹ کا فارن سیکریٹری تھا اس نے سرسید پر سخت اعتراض کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

> ''اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔اس سے حسبِ ضابطہ باز پرسی ہونی چاہئے اور جواب لینا چاہئے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہئے۔''[۲]

مذکورہ بالا بیان سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ انگریزوں کا نظریۂ عمل مسلمانوں کے لیے کیسا تھا۔جبکہ سرسید نے غدر میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بیچ ہوئی ان غلط فہمیوں کی نشاندہی کی تھی جو حقیقتاً پیدا ہوگئی تھیں۔انگریز تعصب پسند تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ''اسباب بغاوتِ ہند'' میں پیش کی گئی حقیقت پر اعتراض کیا۔۱۸۶۸ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے فرخ آباد میں دربار کیا تو اس محفل میں انگریز عہدے داروں کے ساتھ سرسید بھی مدعو تھے۔ یہیں سسل بیڈن اور سرسید کی پہلی بار ملاقات ہوئی دونوں کے درمیان ''اسباب بغاوتِ ہند'' کو لے کر طویل باتیں ہوئیں۔سسل بیڈن نے سرسید سے کہا:

> ''اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔سرسید نے کہا کہ میں نے اس کتاب کی کل پانچ سو جلدیں چھپوائی تھیں۔جن میں چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔اور کچھ کم پانچ سو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔میں جانتا ہوں کہ آج کل بسبب غیظ وغضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹے سمجھتے ہیں اس لیے جس طرح میں نے ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔صرف ایک کتاب گورنمنٹ کو بھیجی ہے۔

www.urduchannel.in

اگراس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک
ہزار روپیہ دوں گا۔''[۳]

مذکورہ بالا اقتباس سے سرسید احمد خان کی سچائی اور صاف گوئی کا پتا چلتا ہے۔انہوں نے حکومتِ وقت کو چیلنج کیا جو بڑی استقامت اور جگر کا کام تھا۔اس کے باوجود بھی سسل بیڈن کو یہ یقین نہیں ہوا کہ کتاب ہندوستان میں تقسیم نہیں ہوئی، کئی دفعہ بیڈن نے ''اسباب بغاوت ہند'' کے شائع ہونے پر سرسید سے سوال کیا۔اسی طرح کے اختلافی خیالات سے پتا چلتا ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے کس طرح کا وہم وگمان تھا۔وہ کسی حال میں مسلمانوں کی وفاداری قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔لہٰذا انہیں یہ یقین تھا کہ یہ قوم غدار اور بے وفا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی دو قوموں کے بیچ غرور اور تعصب کی وجہ سے تفریق پیدا ہوتی ہے۔اس وقت ایک مفکر، مصلح اور رہبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔غدر کے بعد سرسید احمد خان نے مسلمان قوم کی رہنمائی کی، وہ قوم کو ان برے حالات سے نکالنا چاہتے تھے۔اس کے لیے سب سے پہلا فریضہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین پل رہی نفرتوں کو دور کیا جائے۔بالخصوص انگریزوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ مسلمان پیدائشی باغی نہیں ہوتا اور نہ ہی بغاوت کرنا اس کا پیشہ ہے۔وہ اس رسول کو ماننے والا ہے جنھوں نے پوری زندگی امن ومان کا درس دیا۔سرسید دونوں قوموں کے بیچ صلح اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔لیکن اسی دوران مسٹر ولیم ہنٹر نے ایک کتاب ''آور انڈین مسلمانز''(Our Indian Musalmans) کے نام سے لکھی جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔مسٹر ہنٹر کی اس کتاب نے لوگوں میں ایک الگ تاثر پیدا کیا۔ان کے بارے میں یہ عام تھا کہ انھوں نے مذہبِ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔یہ کتاب اسی مطالعے کی کلیہ تھی۔لہٰذا سرسید نے جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اس میں مسلمانوں کے خلاف بہت سی غلط باتیں لکھی ہوئی تھیں۔مثلاً اس قوم سے وفاداری یا ایمانداری کی امید نہیں کی جاسکتی، یہ قوم لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتی ہے۔اس لیے انگریز حکومت کو اس قوم کی جانب سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔مسٹر ہنٹر نے ''آور انڈین مسلمانز'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آموز نصیحتوں کو
نہایت ذوق وشوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی
طبیعت سے اپنی شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھہرا کر بغاوت کے بڑے فرض
سے بچ جاتے ہیں۔''[۴]

سرسید احمد خان جہاں دونوں قوم کے بیچ مفاہمت اور یگانگت کی راہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور قومی مفاد

www.urduchannel.in

کے لیے انسانی محبت، رواداری اور بھائی چارگی کا نظریہ پیش کر رہے تھے، وہیں یہ کتاب سرسید کے نظریات کی پوری طرح مخالفت کر رہی تھی۔ ہنٹر کے سطحی خیالات نے سرسید کی پہلی کوشش کے خلاف آگ بھڑکانے کا کام کیا۔ ہنٹر کی اس غلط روی سے ہندوستان کے مسلمانوں اور فرنگیوں کے دل و دماغ پر منفی اثر پڑا۔ پر سرسید نے اس کتاب پر ایک زوردار ریویو لکھا اور لوگوں پر پڑے منفی اثرات کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ ہنٹر نے مذہبِ اسلام کے بارے میں بعض غلط چیزوں کو صحیح ثابت کیا تھا۔ سرسید کے اس ریویو نے حکومت اور لوگوں پر اچھا اثر ڈالا۔ بعد میں عصر حاضر کے اخباروں نے اس کتاب پر تحریری سلسلہ شروع کیا اور ولیم ہنٹر کی غلط بیانی کی تردید کی۔

سرسید نے قوم کے سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کے لیے تعلیمی ذرائع پر سب سے زیادہ زور دیا۔ انہیں اغراض و مقاصد کے سبب ۱۸۶۷ء میں کمیٹی کی جانب سے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغرب کو بھیجی گئی جس کے ڈائریکٹر مسٹر کیمسن تھے۔ اس درخواست میں سرسید نے ہندوستان میں تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے ایسوسی ایشن سے ایک ورنی کلر کالج قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس میں جدید علوم و فنون کی تعلیم انگریزی کے بجائے دیسی زبان میں دی جائے۔ مسٹر کیمسن کو یہ محسوس ہوا کہ سرسید احمد خان انگریزی زبان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو انگریزی زبان کا باغی قرار دے کر ان کے نظریے کو رد کیا گیا۔ جس سے ورنی کلر کالج کا مسئلہ انجام تک نہ پہنچ سکا۔ سرسید احمد خان نے بنارس انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''مسٹر کیمپسن (ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے اور اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانہ جائے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے۔ مگر اس کے ساتھ ایک سررشتہ قایم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعے سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلایا جائے۔''[۵]

سرسید احمد خان کی اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے خواہاں تھے۔ انہوں نے انگریزی کو تو اہمیت دی لیکن ان کا کہنا تھا کہ اہل یورپ کی تمام روشن ضمیری اور ان کا علم و فضل علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ چوں کہ اس وقت عوامی زبان اردو تھی۔ انگریزوں کو یہ لگا کہ سرسید تعلیمی حصول کے لیے انگریزی زبان کو نحیف اور اردو کو بہتر سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے اردو زبان کی حمایت میں سرسید کی اس رائے پر

www.urduchannel.in

جی.کیمبل، ڈاکٹرفیلن، رسل اور مسٹرانٹونی میکڈانل وغیرہ نے سخت اعتراضات کیے۔

جی.کیمبل ۱۸۷۱ء میں سنٹر کالج مظفر پور کی مجلسِ سنگِ بنیاد میں مدعو تھے۔انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو زبان میں اتنی وسعت نہیں کہ اسے تعلیم کا ذریعہ بنایا جاسکے، کیوں کہ یہ غیر ملک کی زبان ہے۔اس سلسلے میں جی.کیمبل نے ایک یادداشت بھی شائع کرائی۔جس میں بہار کی جانب بولی جانے والی اردو کے فحش اور ذو معنی الفاظ شامل کرار دو کو ایک خراب اور دوغلی زبان قرار دیا اور گورنمنٹ سے سفارش کی کہ اس زبان کو تعلیم حاصل کرنے کا درجہ نہ دیا جائے۔اردو زبان کی مخالفت انگریزوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی کھل کر کی۔اور ہندوستان میں اردو کے بجائے دیو ناگری کورائج کرنے کی مہم چلائی۔

سرانٹونی میکڈانل ہندی کے زبردست حامی اوراردو زبان کے بہت بڑے مخالف تھے۔۱۸۹۸ء سرسید کے زمانۂ آخر میں سرانٹونی میکڈانل یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوکر آئے تو اردو کے مخالفین اور ہندی زبان کے سربراہوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔انہوں نے گورنر کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی اور یہ درخواست کی کہ ہندی زبان کو سرکاری مقامات پر استعمال کی اجازت دی جائے۔سرسید کی زندگی میں تمام تر کوششیں بے کار تھیں۔ان کے انتقال کے کچھ دن بعد اردو زبان کے مخالفین اور ہندی کے طرفداروں کی کوششیں رنگ لائیں۔دفتروں وعدالتوں میں اردو کے ساتھ ہندی کا بھی رواج عام ہوگیا۔

سرسید احمد خان کا سب سے اہم کارنامہ علی گڑھ میں تعلیمی ادارہ قائم کرنا تھا۔اس کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے سیکریٹری مولوی سمیع اللہ تھے۔سرسید نے کمیٹی کی جانب سے ادارہ قائم کرنے کی درخواست علی گڑھ کے کلکٹر ہنری لارنس کودی۔لارنس نے اس درخواست کو گورنمنٹ کے پاس بھیج دیا۔جسے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے قبول کرلیا۔ادارے کے لیے ابھی زمین گورنمنٹ کی جانب سے نہیں ملی تھی کہ سرسید کو مخالفین کا سامنا کرنا پڑا۔ہنری لارنس کی جگہ مانٹی گیوٹ اوراس کے بعد مسٹر کالون ایک کے بعد علی گڑھ کے کلکٹر منتخب ہوکر آئے۔لہذا انہوں نے سرسید کو تعلیمی ادارے کے لیے زمین دینے پر سخت اعتراض کیا۔جس کے بعد گورنمنٹ اور انگریزی حکام سب کے سب مانٹی گیوٹ اور مسٹر کالون کے ہم نوا ہوگئے۔مانٹی گیوٹ اور مسٹر کالون کا کالج کے بارے ایسا قدم اٹھانا مسلم قوم کے متعلق تعصب پسندی اور بدنیتی واضح ہوتی ہے۔اس اختلافات سے بانیانِ اسکول کا حوصلہ کمزور پڑنے لگا، اب امید کی کرن نظر نہیں آرہی تھی کہ سر ولیم میور کی جگہ سرجان اسٹریچی لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے۔سرجان اسٹریچی سے علی گڑھ کالج کے بارے میں کافی بات چیت ہوئی۔اس بات چیت سے کمیٹی کے ممبران کو بڑی حد تک تسلی ہوگئی۔آخر میں برطانوی حکومت کی جانب سے یہ طے ہوا کہ کالج بنانے سے قبل اس کا نقشہ گورنمنٹ کو بھیجا جائے۔اور کالج کسی

www.urduchannel.in

بھی صورت میں بند ہوتا ہے تو اس کی تمام بلڈنگیں سرکار ضبط کر لے گی۔ خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''سید احمد خان نے اپنے دور کے ہندوستان کی تمام سماجی، سیاسی، اور معاشی خرابیوں کا علاج تعلیم میں پایا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو لوگ مٹ جائیں گے۔''(۶)

سرسید احمد خان اس دور کی پیداوار ہیں جس دور میں مسائل اور مشکلات اپنے عروج پر تھے۔ انہوں نے اس دور کے مسائل کو دیکھا، سوچا اور سمجھا، پھر زندگی کا ایک مقصد متعین کیا۔ ان کا مقصد قوم کی فلاح اور ترقی کا تھا۔ انہوں نے قوم کی بدحالی پر مرثیہ نہیں پڑھا بلکہ اس غم کو ضبط کر لیا اور خود کو قوم کی خدمت کے لیے صرف کر دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو معاشرتی بدحالی اور سماجی رسوائیوں سے بچایا اور ترقی کے نت نئے نظریے پیش کیے۔ تعلیم کے لیے بہتر پلیٹ فارم اور کالج کا انتظام کرایا، حکومت سے اپنے حقوق کے مطالبے کیے اور معاشی ضروریات کے لیے نئے اقدام اٹھائے۔ انہوں نے پوری زندگی قوم کی خدمت کی ورنہ مسلمانانِ ہند کا کیا حال ہوتا یہ وقت ہی طے کرتا۔ بہرکیف سرسید نے قوم کی ترقی اور فلاح کے لیے جو کچھ خدمات انجام دیں وہ مستقبل کے لیے حسن المآب ثابت ہوا۔

حواشی:

(۱) مولوی عبدالحق، سرسید احمد خان حالات وافکار، اردو مرکز۔ اردو بازار، نئی دہلی، ۱۹۶۰، ص: ۱۸۰

(۲) مولانا الطاف حسین حالؔی، حیاتِ جاوید، ترقی اردو بیرو، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص: ۹۶

(۳) مولانا الطاف حسین حالؔی، حیاتِ جاوید، ترقی اردو بیرو، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص: ۹۷-۹۶

(۴) سرسید احمد خان، ریویو، ہمارے ہندوستانی مسلمان، سرسید اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۹، ص: ۵

(۵) مولوی عبدالحق، سرسید احمد خان مجوزہ ورنی کلر یونیورسٹی، مشمولہ، مطالعہ سرسید احمد خان، مرتب، مولوی عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹، ص: ۱۳۱

(۶) خلیق احمد نظامی، جدید ہندوستان کے معمار سید احمد خان، مترجم، اصغر عباس، پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۹۷۱، ص: ۶۹

www.urduchannel.in

نیاز الحق*

چمن سرسید اور عہد حاضر میں اس کی معنویت

دے جزا، اللہ تو اس باغبان علم کو
جس نے غنچوں کو کھلایا اور گل تر کر دیا

جب بات باغبان، غنچہ اور گل سے شروع ہو رہی ہے تو ضروری ہے کہ اس کی مناسبت سے چمن کا تذکرہ کیا جائے، اور میرے تصور میں دنیا کے خوبصورت ترین چمنستانوں میں سے ایک چمن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ اس کی خوبصورتی کا راز یہ ہے کہ اس کی باغبانی کا ذمہ سنبھالنے والا کوئی معمولی انسان نہ تھا بلکہ وہ مرد درویش تھا جس نے اس کی آبیاری کے لیے پانی کے ساتھ ساتھ اپنا خون پسینہ بھی بہایا تھا۔ اپنے خاندانی جاہ وحشم کو بالائے طاق رکھ کر قوم کے ہر چھوٹے بڑے شخص کے دروازے پر ایک سائل کی حیثیت سے ایسے وقت میں دستک دی تھی جب قوم سو رہی تھی اور وہ شخص اپنی قوم کے مستقبل کے لیے بیداری کے عالم میں اپنے خوابوں کا چمن تیار کرنے میں منہمک تھا۔ جس کی تعبیر بقول غضنفر علی:

> ''ہر شب، شبِ شیراز اور ہر شام، شام مصر والی زمین اس مخلص انسان کے خوابوں کی زمین ہے جس کی تعبیروں کے ابر ایسے اٹھے اور اس طرح برسے کہ ساری دنیا سیراب ہوگئی، ریگ زاروں میں پھول کھل اٹھے، بنجر زمینوں کے دہانے نرم پڑ گئے، ویران سرسبز شاداب ہو گئے، سنسان اور خاموش خطے چہک مہک اٹھے..... سرسید کے خواب کا یہ رنگ کڑی دھوپ میں بھی دمکتا رہا، زمانے کی گرم آندھیاں بھی اسے جھلسا نہ سکیں، وقت کی مار اور موسم کے تھپیڑوں سے بھی یہ مدھم نہ ہو سکا اس لیے کہ اس رنگ میں خواب دیکھنے والے کا خونِ جگر بھی شامل تھا''[۱]

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

قرآن کی یہ آیت ''ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین'' دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کسی محسن کی محنت کو ضائع نہیں کرتا، اس چمن کی شادابی اور چہل پہل سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس باغبان کی محنت، لگن اور شوق و جذبے میں اتنا خلوص تھا کہ آج ڈیڑھ سو سال پورے ہونے والے ہیں مگر اس کے لگائے ہوئے پودوں کا کوئی ایک پتہ بھی خشک نظر نہیں آتا، یہاں کا ذرہ ذرہ آج بھی اپنی مخصوص زبان میں اس کی مالا جپ رہا ہے، جس طرف نگاہ اٹھایئے موسم بہار کی صورت میں ننھے ننھے پودے، رنگ برنگے پھول، زمین پر بچھے سبز مخملی بستر، شہر فطرت کے تمام راہ گیروں کو یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر آرام وسکون کے ساتھ گلستانِ سرسید میں کھو جانے کی دعوت دے رہے ہیں اور شاخوں پر بیٹھی خوش آواز بلبلیں اپنے طرب انگیز نغموں سے فضائے عشق میں موسیقی کا رس گھول رہی ہیں۔ گویا زبان حال سے وہ یہ کہنا چاہتی ہیں:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یہ حقیقت ہے کہ اس کا در کل بھی تمام مسالک و مذاہب کے لیے کھلا تھا اور آج بھی، بس وہ محسن ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن اس کے لگائے ہوئے چمن کا ایک ایک پھول اور اس کی بنائی ہوئی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ اپنی جاذبیت میں یدِ بیضا اور حیات نو عطا کرنے میں دمِ عیسیٰ کی تاثیر لیے کسی موسیٰ اور عیسیٰ کے انتظار میں ہے۔

اگر ایک طرف افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری زبان کے وہ ماہرین اور ہندوستان کے وہ سحر نگار ارباب قلم جنھوں نے اپنی جادو بیانی سے مردہ قوم میں روح پھونکی تھی، جن کا وجود ہمیشہ ملکوں اور قوموں کا تاج بنا رہا وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہمارے دامن کا ایک ایک موتی اور ہمارے علمی خزانے کا ایک ایک جوہر ہم سے کھو چکا ہے اور آج ہندوستان کی علمی فضا میں فضل وکمال کا چراغ اپنی مدھم لو کے ساتھ ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے، تو دوسری طرف علامہ اقبالؔ کا یہ مصرعہ: ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی'' حوصلہ بخشتا ہے اور ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کو سہارا دیتا ہے، علامہ اقبالؔ نے بہت پہلے اس قوم کے حالات و جذبات کو دیکھتے ہوئے شاید اسی لیے کہا تھا کہ اس قوم میں جذبات و احساسات کی کمی نہیں ہے، بلکہ اس قوم کو بس بیدار کرنے کی اور اپنی ذمہ داری یاد دلانے کی ضرورت ہے، پھر اسی زمین سے وہ ماہرین اور وہ سحر نگار ارباب قلم پیدا ہوں گے جو اپنی جادو بیانی سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کریں گے۔

جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں سن میں فلاں صاحب کی ولولہ انگیز تقریر سے قوم میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور پھر پچاس سال بعد فلاں واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے ملت جاگ اٹھی اور پھر ساٹھ سال بعد فلاں سانحے سے یا جنگ وغیرہ سے قوم کے جوان بیدار ہو گئے اگر دیکھا جائے تو ہر پچاس اور ساٹھ سال بعد اٹھنے والی یہ بیداری کی لہریں بتاتی ہیں کہ بیچ کے عرصے میں قوم سوتی رہی اور اسے جگانے کے لیے کوئی نہ کوئی مصلح

www.urduchannel.in

ضرور اٹھا جن میں ایک نمایاں نام سرسید احمد خاں کا بھی ہے، جنھوں نے خوابِ غفلت میں پڑی قوم کو یہ کہہ کر بیدار کیا:

''اے میرے عزیز ہم وطنو..قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو، غور کرو تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح عمدہ ہو، تا کہ تم بھی ایک معزز قوم ہو، کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا، وضع ولباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل واشغال کا، تمہاری اولاد کے لیے ہے، اس سے اس کی شخصی چال چلن، اخلاق وعادات، نیکی وسچائی میں ترقی ہوسکتی ہے؟ حاشاوکلاّ''[۲]

سرسید کی مذکورہ باتوں پر نظر ڈالی جائے تو کیا آج ان چیزوں کی کمی نہیں ہے؟ بالکل ہے کیوں کہ آج صرف وقت بدلا ہے حالات وہی ہیں، اشخاص بدلے ہیں فطرتیں وہی ہیں، بس ضرورت ہے پیہم سعی وعمل، ایک مسلسل حرکت و استقلال، ایک ہمالیہ کا سا عزم، آگے بڑھ کر کبھی نہ پیچھے ہٹنے والا قدم اور ان پر ثابت قدم رہنے کے لیے سرسید جیسے جذبات کی، جیسا کہ جذبات سے متعلق مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا ہے:

''دنیا میں جو کچھ رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔ اگر خوشی غم، محبت، عداوت، نفرت، خوف، ہمدردی وغیرہ یہ سب جذبے ناپید ہوجائیں تو دنیا میں ایک سناٹا چھا جائے کہ نہ گلاب کے چمن سے فرحت ہو، نہ ببول کی بن سے وحشت۔ نہ ساما کی سحری نغموں سے روح بیدار ہو، نہ کوے کی بے ہنگام صدا کانوں پر بار ہو۔ نہ کسی سے ملنے کا اشتیاق ہو نہ کسی سے چھوٹنا شاق ہو۔ ایک بے امتیازی اور بے تعلقی کا عالم پیدا ہوجائے''[۳]

اعلیٰ تعلیم کے ہر ادارہ کی ایک مخصوص شناخت ہوتی ہے جس کا دارومدار اس کی تاریخ، قیادت، علمی خدمات اور وہاں کے طلبا اور اساتذہ کی جماعت پر ہوتا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو کہ ہندوستان میں تقسیم ہند سے پہلے کی دانشگاہوں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے، ایک ایسے کردار کی حامل ہے جو ہندوستانی معاشرے کی تکثیری ہم آہنگی اور کثرت میں وحدت کی مثال ہے کیوں کہ اس کی بنیاد رکھنے والے کے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی بات مستحضر رہی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''ہم کو یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں، گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں جس نے ہم مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے، شریک نہیں ہیں، مگر

www.urduchannel.in

بہت سے تمدنی امور میں جس میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں، اسی زمین پر ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی، دکن کی ہو یا ہمالیہ کی ہم دونوں رہتے ہیں، اسی ملک کی ہوا سے اسی ملک کے پانی سے اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور وتمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں، ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے۔''[۴]

سرسید کا ایک بڑا مقصد یہاں کے رہنے والوں کے لیے قومیت کے جذبے کو فروغ دینا تھا کیوں کہ سرسید بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے اگر وہ ایک دوسرے سے ہمدردی ومحبت کے جذبے سے عاری ہوئے تو ملک کا امن وسکون غارت ہوجائے گا اور یہاں کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکے گی۔ سرسید کی یہ وہی کوششیں تھیں جس کے متعلق ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی نے لکھا ہے:

اتحاد باہمی تھا ان کا فطری مشغلہ
تھے اسی کی راہ پر وہ زندگی بھر گامزن
ہر طرح کی عصبیت سے پاک تھا ان کا ضمیر
محترم تھے ان کی نظروں میں سب اہل وطن
اس سے بڑھ کر قومی یکجہتی کی کیا ہوگی مثال
ہند کی کثرت میں وحدت ہی ہے اس کا بانکپن

حواشی:

(۱) پروفیسر غضنفر علی، فضائے سرسید کے تخلیقی رنگ وآہنگ، فکر ونظر سہ ماہی سرسید نمبر، مارچ ۲۰۱۷، ص: ۳۴۸

(۲) پروفیسر شاہ محمد وسیم، مضمون، علی گڑھ تحریک: اس کا اقتصادی پہلو اور ہماری ذمہ داری، مشمولہ: تہذیب الاخلاق، خصوصی شمارہ، جشن سرسید، ۲۰۱۷ء، ص: ۱۷۰

(۳) سید مسعود حسن رضوی ادیب؛ ہماری شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن ۲۰۱۶، ص: ۱۹

(۴) مقالات سرسید بارہواں حصہ، مضمون، قومی تعلیم، قومی ہمدردی اور باہمی اتفاق، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ص: ۱۳۴

www.urduchannel.in

حارث حمزہ لون*

سرسید احمد خاں: ایک شش جہات شخصیت

انیسویں صدی میں مختلف خطّہ ہائے عالم میں اصلاح وتجدید کی جن نابغۂ روزگار شخصیتوں نے اپنے فکر وعمل کے جوہر بکھیرے ہیں اور اپنے اپنے مخصوص انداز سے قوموں کے لیے جن گراں قدر خدمات کا نذرانہ پیش کیا ہے، ان میں ہندوستان کے اُفق سے ابھرنے والی شخصیت سرسید احمد خاں ہیں۔ سرسید احمد خاں ایک ہمہ گیر اور عہد ساز شخصیت تھی۔ ان کی پوری زندگی علم وعمل سے عبارت تھی۔ ان کی ذات مختلف الجہات پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ایک عبقری، نابغۂ روزگار، عہد ساز، عظیم مصلح، مدبر، ممتاز مفکر، مورخ، ماہر تعلیم، ادیب، بے باک صحافی، سیاست داں، عالم دین اور نباض وقت تھے۔ اپنی انہیں ہمہ گیر صفات کی بنا پر انھوں نے نے مسلمانوں کے فکر وعمل کے ہر گوشہ پر اثر ڈالا ہے۔ سرسید نے اپنی زندگی میں قوم کی اصلاح وترقی کے لیے جس کام کا بھی عزم کیا اسے ایک باعمل انسان کی طرح پورا کر کے دکھایا۔ ان کا تدبر بے مثالی، ان کی فکر وسیع، ان کی صفت وخوبی لاجواب۔ اسی طرح ان کے مزاج میں جو افلاطونیت تھی اس کا جواب نہیں۔

سرسید احمد خاں دہلی کے ایک معزز خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے اسلاف مغل تاجدار شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور شاہی حکومت میں اہم مناصب سے پر فائز ہے۔ سرسید کی ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں اکبر شاہ ثانی برسرِ اقتدار تھے اور ان کی سلطنت لال قلعہ تک محدود تھی۔ سلطنت کی معاشی صورت حال روز افزوں خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس زمانہ میں یورپی تہذیب کے اثر سے جو تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں ان کے نتیجے میں قدیم اور جدید افکار ونظریات کی کشمکش بھی اپنے عروج پر تھی۔ تغیر اور تبدیلی کی ان علامتوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر بھی کیا تھا اور منتشر بھی۔ لیکن شورش اور انتشار کے زمانہ میں بھی دہلی میں شعر وادب اور دوسرے علوم وفنون کی ترقی ہوئی جس کی تفصیل تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ خود سرسید نے اپنی

* شعبۂ اُردو، دیوی اہلیہ وشودھیالیہ، اندور (ایم. پی)

www.urduchannel.in

معروف تصنیف ''آثارالصنادید'' کے چوتھے باب میں آخری مغل بادشاہوں کے عہد میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں: ''دراصل قوموں اور حکومتوں کا عروج وزوال تاریخ کا مسلسل عمل ہے۔''

سرسید کا ظہور جس دور میں ہوا، اس وقت ملک کے حالات انتہائی ناسازگار تھے اور ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی عوام بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں پر ایسی آفت ٹوٹی کہ ہر شخص سہم کر رہ گیا لوگ انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار تھے۔ انتہائی بے رحمی سے انسانوں کا خون بہایا جارہا تھا۔ انگریزوں کی یہ زبردست نفرت صرف مسلمانوں کے ساتھ تھی اس لیے مسلمان سیاسی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی طور سے بھی زوال پذیر تھے۔ ہر طرف خوف وہراس، مایوسی، ناامیدی تھی اور امید کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے پُرآشوب اور سنگین حالات میں سرسید قوم کے مسیحا بن کر سامنے آئے۔ جنھوں نے قوم کو ذلت کی پستی سے نکالا۔ ظلمت کے اندھیروں کو دور کیا اور فلاح وبہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی دینی، علمی، فکری، اصلاحی، سیاسی اور سماجی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس پر انھوں نے توجہ نہ کی ہو۔

سرسید احمد خاں کا دور شعوری بیداری اور برسوں کے ذہنی جمود ٹوٹنے کا ہنگام تھا، مغربی علوم اور ادبیات کے خوش گوار جھونکے بڑی سرعت کے ساتھ سوچ وفکر کے لب بستہ شگوفوں کو اذنِ سخن دے رہے تھے۔ اسی فضا میں سوچ، احساسِ ندامت، شکست خوردگی اور اندیشہ ہائے دور دراز کے ساتھ ہی اپنی تہذیبی قدروں کی جانچ پڑتال کے لیے طبیعتوں کو آمادہ کیا۔

سرسید احمد خاں کا دل قوم کے درد سے تڑپ اُٹھا اور علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا مقصد حاکم ومحکوم میں مصالحت اور مفاہمت کی راہ ہموار کرنا، مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا، انھیں مایوسی اور احساسِ کمتری کے اندھیرے غار سے نکالنا اور زندگی کے تمام میدانوں میں ترقی کی اعلیٰ منزل تک پہنچانا تھا، لیکن ترقی کی اعلیٰ منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہو۔ سرسید نے اپنے آس پاس کے حالات کا مشاہدہ کیا اور غور کیا کہ کیسے اپنی قوم کی حالت کو بدلا جاسکتا ہے چنانچہ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سرسید نے محسوس کیا کہ قوم کی اس حالت کا اصل سبب قدیم روایات اور رسم ورواج کی اندھی تقلید ہے۔ ساتھ ہی تعلیم سے بے پروائی بھی۔ کیوں کہ مسلمانوں میں تعلیم وتربیت نہیں تھی اور جو تھوڑی بہت بھی وہ مذہبی تعلیم تھی۔ اس پر فرسودہ روایات کا جال پڑا ہوا تھا۔ سرسید نے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے اور اس سے نجات کے حصول کے لیے تعلیم کو ضروری بتایا۔ غدر ہندوستان اور اس کے مضمرات، مسلم قوم کی بدحالی، مظلومی اور بے کسی کا احساس اور سدباب پر غور کرنا، اسے منظر عام پر لانا، قوم میں بیداری اور شعور کا پیدا کرنا اور ایک قطعیت کا معجزانہ نظریہ پیش کرنا، کیا کسی اور فرد سے ممکن نہ تھا؟ تعلیم کو مسلمانوں

www.urduchannel.in

کی پس ماندگی اور بدحالی کا ذمہ دار بتانا اس کے عواقب پر بحث وتکرار کرنا، توجہ دلانا، کیا معمولی امر ہے؟ ہم آج جس حدتک بھی اپنے ملک اور دیار میں اگر سکون کی سانس لے رہے ہیں تو اس کا نسخۂ اول کس نے تجویز کیا تھا؟ سچی بات یہ ہے کہ اگر مفکر اعظم سرسید نے اس رمز کو نہ پالیا ہوتا، تو ہمارا حشر عبرت ناک ہوتا۔

سرسید لکھتے ہیں:

''سب کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کرو''[۱]

علم سے سرسید احمد خاں کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ سرسید نے یہ ذہن بھی دیا کہ علم مسلمانوں کی میراث ہے۔ جس سے ملے جہاں سے ملے، حاصل کرنا چاہیے، خواہ وہ انگریز قوم اور انگریزی زبان ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے زمانہ کے حالات کے مشاہدہ اور ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی، معاشی وسیاسی مسائل کے تجزیہ کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینا ان کی اصلاح وترقی کا اہم ذریعہ ثابت ہوگا اور اسی سے انھیں معاشرہ میں عزت ووقار کا مقام حاصل ہوگا۔ اس ضمن میں انھوں نے تین نکات پر خاص زور دیا۔ اول یہ کہ تعلیم کو عام کیا جائے، اسے کسی بستی یا شہر کے لوگوں یا چند گھرانوں تک محدود نہ رکھا جائے۔ دوم یہ کہ تعلیم کے نصاب و نظام میں عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے اور سوم یہ کہ جدید مضامین وسائنسی علوم کے ساتھ دینیات ومشرقی علوم کی تدریس کا بھی اہتمام کیا جائے۔

سرسید احمد خاں نے تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑا۔ انہوں نے تعلیم اور انفرادی زندگی کے حوالے سے سماجی اور اقتصادی پہلو پر زور دیا، اور اسے معاشی بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے سرکاری ملازمتوں اور حکومت کے دفاتر چلانے کے لیے بابو تیار کرنے پر قناعت کرنے کے بجائے تجارت اور دوسرے پیشوں کو ترجیح دی اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب دلائی تاکہ ملک میں زیادہ سے زیادہ کمپنیاں قائم ہوں اور اس سے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بن سکے۔

جن سخت اور ہمہ گیر حالات میں انھوں نے نسخۂ کیمیا تجویز کیا، تجویز ہی نہیں، عملاً کر کے دکھایا۔ وہ کیا کسی اعتبار سے بھی فراموش کیے جانے کے لائق ہے؟ یہ درست ہے کہ سرسید نے اپنے اردگرد ایسا حلقہ مدوّر کیا جو ان کا مزاج آشنا تھا۔

سرسید احمد خاں کا قائم کردہ مدرسۃ العلوم (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) دنیا کی دیگر دانش گاہوں کے مقابلے میں بالعموم اور ہندوستان کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بالخصوص اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ تربیت کو تعلیم کے جزو لاینفک کے طور پر اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ تعلیم کا مقصد اس عظیم الشان ادارے کے بانی کے نزدیک یہی تھا کہ قوم کے بچے اعلیٰ تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان اوصاف واقدار کے حامل بن جائیں جو شرافت وانسانیت کے ضامن ہوں اور جن سے کوئی قوم صحیح معنوں میں کوئی خاص قوم بنتی ہے اور جن اوصاف کی بنا پر وہ خود اپنی، اپنے خاندان کی،

www.urduchannel.in

اپنے ہم وطنوں کی اور پوری انسانی برادری کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے عظیم معمار قوم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میر کارواں سرسید اور ان کے احباب و رفقاء کی جہد مسلسل آرزوؤں، اور قربانیوں کا یہ عظیم الشان مظہر ہے۔ اسے سرسید کی دیرینہ تمناؤں اور قیمتی خوابوں کی تعبیر بھی کہا جاتا ہے اور مسلمانانِ ہند کا دھڑکتا ہوا دل بھی کہا جاتا ہے۔ سرسید نے جس دانش کدہ کی تخم ریزی کی تھی، آج بلا شبہ وہ تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ایک غیر جانب دار مبصر بھی یہ کہنے سے گریزاں نہ ہوگا کہ سرسید کے اس چشمۂ علم وفن سے بلاتفریق مذہب وملت پورا ہندوستان سیراب ہو رہا ہے بلکہ دنیا کے گوشے گوشے سے تشنگان علم، تعلیم وتربیت کے اس بحر ز خار کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور سیراب ہو کر اپنے اپنے وطن میں جا کر اس درس گاہ کا فیض عام کر رہے ہیں۔ سرسید کی قائم کردہ اس دانش کدہ کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ آدمی کے اندر وہ اخلاق حسنہ پیدا کرنا چاہتا ہے جن سے ایک طرف وہ مذہب کا مخلص نمائندہ ثابت ہوتا ہو اور دوسری طرف خود اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے، سماج کے لیے اور ملک وقوم کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہوتا ہو۔ اس عظیم الشان درس گاہ کے بانی نے قافلۂ علم وادب کے لیے ایسے نقوش راہ دیئے تھے جن پر چل کر ایک طالب علم اپنے مذہب کا سچا پیرو بھی بن سکتا ہے اور اس طرح موت کے بعد کی ابدی زندگی کی لازوال مسرتوں کا استحقاق بھی پیدا کر لیتا ہے اور دوسری طرف اس دنیا کے بازار میں اپنے وجود کی قیمت منوا سکتا ہے اور خاکساری و تواضع اور ہمدردی کا پیام معاشرۂ انسانی میں عام کر کے دنیا کی اس زندگی کو بھی جنت نشاں بنا سکتا ہے۔ تعلیم وتربیت کے سلسلے میں اگر سرسید کے افکار وملاحظات دیکھے جائیں تو یہ تاثر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ سرسید نے تعلیم کے ساتھ تربیت کا رشتہ قائم کر کے نہ صرف یہ کہ ایک مقدس روایت کی داغ بیل ڈالی بلکہ اسے تعلیم کا جزو اور فریضۂ دینی کی حیثیت سے اپنانے کی تلقین کی ہے۔ لکھنؤ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا:

> ''مجھے اس سے زیادہ خوشی نہیں کہ کسی نے بی۔ اے، یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی بلکہ میری خوشی تو قوم کو قوم بنانے میں ہے۔''[۲]

سرسید نے گالیاں کھائیں۔ گونا گوں رنج ومصائب اُٹھائے۔ لوگوں نے اُن کے گلے میں جوتوں کے ہار ڈالے لیکن وہ کوہِ گراں کی طرح ثابت قدم رہے۔ اُن کے ساتھ ایک بڑی جماعت تھی، جس کا ہر فرد بجائے خود ایک سرسید تھا اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب وکامران رہے۔ یہ ساری کوششیں اُس زمانے میں کی گئیں جب مسلمان سائنس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے حالات میں انھیں یہ یقین دلانا کہ سائنس اور مذہب میں مخاصمت نہیں ہے، کس قدر صبر آزما، محنت طلب اور دشوار کام تھا، آج اکیسویں صدی میں کسی سوپر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ہوا انسان سوچ بھی نہیں سکتا! روشن راہوں کے مسافروں کو کیا خبر کہ اندھیری رات میں آندھیوں کی زد پر دیا جلانا اور جلائے رکھنا کتنا

www.urduchannel.in

مشکل ہوتا ہے۔سرسید نے چراغ جلایا اور جلائے رکھا۔ بلاشبہ سائنس کی یہ ایک بڑی خدمت تھی۔لہٰذا آج ہماری قوم کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی نسلوں کو جدید علوم وفنون سے بہرہ ور کریں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تربیت کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دیں جو سرسید جیسے عظیم دانشور ومفکر کا خواب تھا۔

جدید تعلیم سے آراستہ ہونے والوں کا قافلہ کس طرح سرگرم عمل رہا، بانیِ درس گاہ نے اس کے لیے واضح الفاظ میں نشان راہ متعین فرمادیا:

''ایک ہاتھ میں فلسفہ ہوگا، دوسرے ہاتھ میں نیچرل سائنس اور سر پر لا الٰہ الا اللہ کا تاج''[۳]

دراصل تعلیم کا مقصد اس ادارہ کے بانی کے نزدیک یہ تھا کہ طلبہ کے اندر وہ اوصاف حمیدہ پیدا ہوجائیں جن کی بنا پر وہ انسانیت کے اعلیٰ مدارج طے کرسکیں اور ملک وقوم کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی میں قابل قدر خدمات انجام دے سکیں۔ان کی عظمت اور خدمات کی تحسین کرتے ہوئے اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے نا تمام
تعلیم اگر ہے اپنے زمانے کی حسبِ حال
پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس کا اب خیال
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے ، رنج سہے گالیاں سہیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

بلاشبہ سرسید احمد خاں نے قوم کی تعمیر وترقی اور اصلاح کے لیے بہت محنت کی ،مختلف مراحل کا سامنا کیا جس میں مشکلیں اور پریشانیاں بھی آئیں اور مخالفت بھی ہوئی لیکن انھوں نے اپنے مقصد کو پورا کرنے میں استقامت کا ثبوت دیا۔سرسید کا سب سے اہم کام لندن کا سفر رہا جو بہت مفید ثابت ہوا۔اس سے سرسید کے افکار ونظریات کا دائرہ مزید وسیع ہوا اور حوصلوں میں پختگی پیدا ہوئی۔سرسید یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے لندن کے لیے اپنے بیٹوں سید حامد اور سید محمود کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔وہاں انھوں نے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔لندن میں تقریباً ڈیڑھ سال قیام کرکے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔لوگوں نے انھیں جب ٹائی اور پینٹ کوٹ میں دیکھا تو مولویوں نے انھیں

www.urduchannel.in

کرسٹان اور نیچری کے لقب سے ملقب کیا۔لندن کا یہ سفر دو اہم مقاصد کے تحت طے کیا گیا جس کا ایک مقصد مغربی طریقۂ تعلیم سے متعلق معلومات حاصل کرنا اور ان اسباب سے واقف ہونا تھا جس نے وہاں کے باشندوں کو ترقی کی راہوں سے ہمکنار کیا۔لہٰذا سرسید جب تک لندن میں قیام پذیر رہے قوم کا درد نہیں بھولے اور اپنی قوم کی فلاح کے لیے نئے نئے منصوبے بناتے رہے۔دورانِ قیام سرسید کی نظر دو انگریزی رسالوں ''اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر'' پر پڑی جو لندن کی نظام زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے نکالے گئے تھے اور بہت مقبول بھی ہوئے۔چناچہ سرسید کے دل میں بھی اس جیسا ہی ایک پرچہ اپنی قوم کے لیے نکالنے کا خیال پیدا ہوا جس کا اظہار لندن سے لکھے گئے محسن الملک کو ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

> ''ایک اخبار مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا میں نے تجویز کرلیا ہے اور ''تہذیب الاخلاق'' اس کا نام فارسی اور انگریزی میں ''محمڈن سوشل رفارمر'' رکھ لیا ہے اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے کاغذ بھی ایک برس کے لائق خرید لیا ہے''[۴]

سرسید جب اپنے ملک واپس پہنچے تو آتے ہی اپنے نئے اصلاحی کاموں کا آغاز کیا جس میں ایک نہایت اہم اور مفید کام ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا تھا۔اس کا پہلا شمارہ یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا۔ سرسید لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔تاکہ جس حقارت سے سولیزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں''[۵]

بلاشبہ ''تہذیب الاخلاق'' قوم کی اصلاح کے لیے نکالا گیا جو کہ قوم کے حق میں بے حد مفید تھا۔اس کے جاری کرنے کا مقصد دراصل اپنی قوم میں ذہنی انقلاب اور جدید تعلیمی تقاضوں کا شعور پیدا کرنا تھا۔اس کے علاوہ اخلاقی معاشرتی،قومی،مذہبی،تعلیمی،انفرادی،اجتماعی،غرض ہر لحاظ سے مسلم معاشرے کی اصلاح کرنا اور ترقی کی طرف مائل کرنا تھا۔اس کے علاوہ جدید علوم وفنون سے واقف کرانا تاکہ صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت میں ترقی کے وسائل پیدا ہوسکیں۔ساتھ ہی اس رسالے نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اس کی اہمیت وافادیت سے روشناس کیا۔جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ بغیر تعلیم وتربیت کے زندگی میں تہذیب وشائستگی پیدا نہیں ہوسکتی۔

www.urduchannel.in

لہٰذا لوگوں پر اس کا اثر ہوا ان کی سوچ وفکر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ایک انقلاب رونما ہوا۔

اس کے علاوہ ''تہذیب الاخلاق'' کے اثرات اردو ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے گئے جس سے اردو ادب میں مضمون نگاری کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین سے ادب کی بھی اصلاح ہوئی اس سے پہلے زبان و ادب پر مقفی و مسجع عبارت کا رنگ تھا جو بعد میں ''تہذیب الاخلاق'' کے اثر سے دور ہوگیا۔ اس نے اردو ادب کو ایک نیا رخ عطا کیا اس میں آسان طرز اظہار اختیار کیا گیا، ادب کو زندگی سے قریب کیا اور افادی ادب کی راہ دکھائی جس سے اس وقت کے اور بعد کے آنے والے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ غرض ''تہذیب الاخلاق'' نے ادب اور زندگی دونوں میں اپنا گہرا نقش قائم کیا اور سرسید کی اس عظیم کاوش سے اہلِ علم و ادب آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ اصلاً یہ ایک اصلاحی رسالہ تھا لیکن اس نے مسلمانوں کو علومِ جدیدہ سے قریب لانے اور سائنسی معلومات کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستانی معاشرے میں ایک زمانے میں سرسید احمد خاں کو سماجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہے جس سے میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ انھوں نے جا بہ جا اپنی تحریروں اور تقریروں میں اپنے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

> ''کیا تم سب ایک ہی ملک میں نہیں رہتے؟ ..... یاد رکھو لفظ ہندو اور مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں ورنہ ہمارے ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں''
>
> ''قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہلاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں''

ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات کو توانائی بخشنے کے لیے اردو میں دیے گئے سرسید احمد خاں کے اس بیان کا کیا کوئی مول نہیں ہے جس میں انھوں نے اہلِ وطن کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا:

> ''اے میرے دوستو میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو مسلمان ہیں۔

www.urduchannel.in

اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی
اور ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی ....اب تم کو
اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ یا کانڑا''[۲]

سرسید معاشرے میں تبدیلی کے شدید خواہش مند تھے۔ان کا خیال تھا کہ کسی بھی تہذیب کی ترقی کے لیے تبدیلی ایک مسلسل عمل ہے جو بے حد ضروری ہے۔ ہندوستان میں انیسویں اور بیسویں صدی کا نصف اوّل اصلاحی تحریکات کا زمانہ رہا ہے۔تمام مصلحین قوم نے اوران کے ساتھ بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی کے لیے 'تبدیلی' کو لازمی عنصر قرار دیا ہے،لیکن عوام کی زندگی میں سب سے سخت مرحلہ 'تبدیلی' کو انگیز کرنا اور قبول کرنا ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سرسید اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قوم کو اپنے طرزِ معاشرت اور تہذیبی امور پر از سر نو غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔کلچر اصلاً سماجی تعمیر (Social Construction) ہے جس کا آغاز ممکن ہے محض اتفاق ہو۔ بالخصوص قوم میں رائج رسم ورواج جو دراصل ہمارے کلچر کا حصہ ہیں، ان کی جانچ پرکھ ضروری ہے۔تہذیب اور کلچر کی جڑیں قوموں کے ماضی میں بہت دور تک پیوست ہوتی ہیں،لہٰذا سماج میں رائج رسم ورواج کو بھلائی اور برائی کی کسوٹی پر جانچا جائے۔بھلی عادتوں اور رسموں کو باقی رکھیں اور بُری کو خیر باد کہیں۔سرسید احمد خاں مذہب وملک اور رنگ ونسل کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ وہ ہندو، مسلمان دونوں کی بھلائی چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ تمام باشندگانِ ملک کو رنگ و نسل سے اُوپر اُٹھ کر ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انفرادی زندگی کی تعمیر اور اجتماعی زندگی کی تشکیل اور سماجی وثقافتی زندگی کا خواب بہتر تربیت کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان جغرافیائی اعتبار سے ایک وسیع ملک ہے۔اس کے مختلف علاقے آب و ہوا، موسم اور علاقائی انفرادیتوں کے سبب اپنا مختلف کلچر رکھتے ہیں بلکہ شکل وصورت، رنگ ونسل، مذہب اور زبان کے اعتبار سے بھی یہاں بے حد تنوع پایا جاتا ہے۔اسی طرح مالی اور معاشی اعتبار سے بھی سماج طبقوں میں تقسیم ہے۔کثیر آبادی کے سبب یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے،لیکن ایک بیدار قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک بہتر تہذیبی اور معاشرتی ماحول کے قیام کے لیے کوشاں ہو۔ یہ تاریخ کا بھی ناگزیر عمل ہے کہ کوشش مثبت راہ ضرور دکھاتی ہے۔ وقت بدلتا ہے، افراد اور اقوام کی اصلاح کوئی غیبی قوت کرتی جاتی ہے۔ یہ غیبی قوت دراصل وقت یا زمانہ ہے۔سرسید خود کہتے

www.urduchannel.in

ہیں"Time is a great Reformer " یعنی زمانہ ایک بڑا اصلاح کرنے والا ہے''۔لیکن زمانے کی باگ ڈور تو کسی نہ کسی کو سنبھالنی ہی پڑتی ہے۔ان کی خواہش تھی کہ قوم کے افراد کے ذہن سنجیدہ ہوں،ان میں صداقت ہو اور ان کا ذہن انصاف پسند ہو،ساتھ ہی ان میں ضبط وتحمل اور صبر کا مادہ بھی بھرپور ہو۔لیکن سرسید نے افراد اور قوموں کی جن کمزوریوں پر گرفت کی،ان کمزوریوں اور خامیوں نے آج بھی معاشرہ کو جکڑ رکھا ہے۔سرسید نے ایسے متعدد مضامین تخلیق کیے جن میں سماج یا افراد کی کمزوریوں کا تجزیہ بے حد ہمدردانہ انداز میں کیا گیا ہے۔اس قسم کے مضامین میں بحث وتکرار،تعصب،خوشامد وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔کچھ بُری عادتیں اور جبلّتیں ہمیشہ انسان کے ذہن پر قابض رہنا چاہتی ہیں،لیکن بہ حیثیت انسان ہماری یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ ہم ان پر قابو پائیں۔آج صورت حال شدید اس لیے بھی ہے کہ موجودہ وقت میں تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ لوگ اس کے شکار ہیں۔آج مذہبی تعصب،خوشامد، انا پرستی جیسی کئی دوسری خصلتیں ہمارے معاشرے کی بڑی کمزوری اور پہچان بن گئی ہیں جو حق پرستوں اور معصوم ذہنوں کے لیے سمِ قاتل بنتی جارہی ہیں۔فی زمانہ طالب علم بڑی بڑی ڈگریوں سے سرفراز ہوکر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی زندگی ناخوش گواریوں کا ایسا جال بن جاتی ہے جس میں وہ آسائش زندگی کی تمام سہولتوں کے باوجود سکون وراحت کے لمحوں کے لیے بے چین وبے قرار نظر آتے ہیں۔اس پُر آشوب دور میں سرسید کے معاشرتی مضامین کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے قوم کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ یہ خدمات اکیلے شخص سے کیسے ممکن ہوگئیں۔کام کی دھن میں کچھ فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئیں مگر انھیں صحیح راستے پر چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے کا نام دینا چاہیے۔ان کے خلوص کا عالم یہ تھا کہ جب ہندوستان میں ان کی انسانی خدمات کے صلے میں ضلع بجنور کا ایک ضبط شدہ علاقہ بطور عطیہ دینا تجویز ہوا تو انھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔سوسائٹی کے کام کو اپنا کام سمجھا،اپنا قیمتی وقت دیا،اپنی آمدنی کا بیش تر حصہ اس کے کاموں پر خرچ کیا،اپنا ذاتی پریس جو آٹھ دس ہزار کا تھا اس کو نذر کردیا، حتیٰ کہ بیگم بھوپال کی طرف سے ملی ہوئی انگوٹھی بھی دے دی۔مدرسے کے لیے گلے میں جھولی ڈال کر بھیک مانگی۔کسی زمانے میں دربارِ دہلی سے انھیں جوّادالدولہ آصف جنگ کا خطاب ملا تھا،انگریزوں نے انھیں Companian of the Star of India کا خطاب دے کر وائسرائے کی مجلسِ مشاورت کا رکن نامزد کیا تھا۔وہ چاہتے تو رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرسکتے تھے لیکن انھوں نے درویشانہ زندگی کو پسند کیا۔ان کی موت بھی کسی دوست کے گھر میں ہوئی۔ اور احباب نے مل کر کفن دفن کا انتظام کیا۔

ایک کامیاب مصلح کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی راہیں روشن کرجاتا ہے،کیا کیا امنگیں اور حوصلے جگا جاتا ہے۔

www.urduchannel.in

سرسید خود تو کسی ایک فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے لیکن یہ ان کی غیر معمولی شخصیت تھی جس کی وجہ سے کتنے ہی باصلاحیت اصحابِ قلم اپنی قیمتی تحریروں سے ملک وقوم کو فیض پہنچا گئے۔ ان سب میں حالؔی بہت نمایاں تھے جنھوں نے اپنے رفقا کی مدد سے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور اپنے طور پر ''مدوجزر اسلام'' جیسی معرکہ آرا مسدّس لکھی۔ سرسید کہا کرتے تھے کہ اگر قیامت میں خدا نے پوچھ لیا کہ تو اپنے ساتھ کیا لایا تو میں کہہ دوں گا کہ حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔ بے ساختہ زبان سے نکلنے والا یہ خراج جو بیک وقت تحسین وعقیدت کے جذبے سے بھرپور ہے اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کے کسی ادب میں کسی شخص یا اس کے کارنامے کے لیے ایسا Tribute نہیں ملا ہوگا۔ اسی طرح علی گڑھ تحریک جتنی تمدنی تھی اتنی ہی ادبی تھی۔ وہ جہاں تہذیب کو رفتار زمانہ کے مطابق بنانے میں مصروف تھی وہاں شعروادب کے دائرے میں آکر ادبی بھی بن گئی اور قومی ہم آہنگی کی عمارت کا اہم ستون ثابت ہوئی۔

سرسید کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک تھی جس نے ہماری قومی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر دوررَس اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کی بدولت مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی، قومیت کا تصور عام ہوا، سیاسی شعور کو جلا حاصل ہوئی، عقلیت کے رجحان کو فروغ ملا، حاکم وقت سے مصالحت اور مفاہمت کا ہنر پیدا ہوا، زمانے کے مطالبات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کا شعور عام ہوا، معاشرتی اصلاح پر توجہ صرف ہوئی، سائنسی رجحان کو فروغ ملا اور جدید طرز کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کی گئی، روشن خیالی پیدا ہوئی، مذہب کی نئی تفسیر وتعبیر پیش کی گئی اور اجتہادِ فکر سے کام لیا گیا۔ شعروادب میں افادیت اور مقصدیت کا تصور عام ہوا اور اس سے معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا گیا۔ گویا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ علی گڑھ تحریک کے اثرات سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ سرسید احمد خاں اس تحریک کے پیشوا تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی کوششوں میں صرف کردی۔

غرض کہ سرسید نے اپنا کل اثاثۂ داؤ پر لگا دیا اور ایک ایسا منارۂ نور (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تعمیر کر دیا، جو رہتی دنیا تک قوم کی رہنمائی کرے گا، اور اس کی روشنی ملکی حدود کو سر کر کے سارے جہاں کو منوّر کرتی رہے گی۔ یہ درس گاہ آج تک سرسبز وشاداب ہے۔ اس درس گاہ سے ایسے لعل وگہر پیدا ہوں گے کہ وہ ایک طرف تو یگانۂ روزگار سائنس داں، اعلیٰ درجے کے طبیب وجراح اور منفرد ادیب ومورخ ہوں گے تو دوسری طرف یہی فرزندان دانش کدہ قوم، ملک اور پوری برادری کے لیے نعمت غیر مترقبہ بن جائیں گے۔ یہ کام انھوں نے قوم کے لیے ایسے زمانے میں کیا تھا جب عام طور پر مایوسی اور خوف وہراس طاری تھا، لیکن انھوں نے لوگوں میں امید کی کرن پیدا کی۔ آج بھی ویسا ہی ماحول ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ امید کی کرن کو برقرار رکھنے کے لیے عملی طور پر کوشش کریں۔ یقین واعتماد کی فضا کو بحال کریں

www.urduchannel.in

اورمشن سرسید کوتہذیبی طور پر آگے بڑھانے کی سمت قدم اُٹھائیں ۔ملت کی بہبودی اورقومی وقار کی بلندی اسی میں پوشیدہ ہے۔عصر حاضر میں تعلیم وتربیت کے متعلق سرسید کے اصولوں کوکما حقہ اپنالیا جائے تو پھر وہ دن دورنہیں ہے جس میں ایک بہتر معاشرے اور کامیاب قوم کی تشکیل عمل میں آئے گی اور سرسید کا خواب مکمل طور سے شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔یہ بے مثال انسان، بے باک صحافی، ایماندار سیاست داں علی گڑھ میں آخری سانس لی اور ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ءاس دنیا سے کوچ کر گئے۔

حواشی:

(۱) سرسید،مکمل مجموعہ لکچر واسپیچیز ،۲۰ستمبر ۱۸۶۷، بنارس،ص:۴۵

(۲) محمد امام الدین گجراتی (مرتب): مجموعہ لکچرز واسپیچیز سرسید احمد خاں،ص:۲۱۱،لاہور

(۳) مقالات سرسید، بحوالہ عشرت علی قریشی،سرسید اپنے افکار واقوال کے آئینے میں،ص:۶۳،۱۹۸۴ء

(۴) سرسید،مکتوب سرسید، ۲۷مئی ۱۸۷۰، بنام نواب محسن الملک،ص:۱۱۴

(۵) سرسید،تہذیب الاخلاق،جلد اول،شمارہ:۱،ص:۱

(۶) مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچیز ،مرتبہ:مولانا محمد امام الدین گجراتی،مطبوعہ مصطفائی پریس لاہور ۱۹۰۰ء،ص:۱۷۵

www.urduchannel.in

خیرالدین اعظم*

سرسید احمد خاں اور خطبات احمدیہ

سرسید احمد خاں اس ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جس نے نہ صرف ہمیں سماجی، سیاسی، اور دیگر معاملات میں پیش آنے والے پیچیدہ مسائل کی نشاندہی کر اس کا حل بتایا بلکہ اُنہوں نے سماجی، سیاسی و دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ مذہبی امور کو بھی مدّنظر رکھا اور جب بھی کسی نے ہمارے مذہب کے خلاف خواہ وہ تحریری شکل میں ہو یا تقریری شکل میں آواز اُٹھائی یا اسے برا بھلا کہنے کی کوشش کی سرسید نے ہر ممکنہ طور پر اس کا مدلّل جواب دیا۔ انہی جوابوں میں سے ایک جواب جو تحریری شکل میں ہمارے پاس موجود ہے جسے ہم 'خطبات احمدیہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی تصنیف میں سرسید کی کوئی ذاتی یا سیاسی غرض وابستہ نہیں تھی بلکہ یہ صرف اور صرف محبت رسولؐ کا نتیجہ تھی۔

خطبات احمدیہ 'سر ولیم میور' کی کتاب "Life Of Mohammad" (جو چار جلدوں پر مشتمل ہے) میں آپؐ پر کیے گئے بے جا اعتراضات اور مذہب اسلام کو حقیر دکھلانے کی کوشش کا مدلدلّل جواب ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہو کر ہندوستان آئی اور سرسید کو اس کا علم ہوا تو وہ ایک دم سے تڑپ اُٹھے انہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اُن اعتراضات کے جواب دینے کا عزم لیا اور اس کے لیے کوشاں ہو گئے بقول حالؔی:

> ''وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو اس کی مطلق خبر نہیں۔''[۱]

اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے بہت سی اسلامی اور دیگر کتابوں کا مطالعہ درکار تھا جس کا ملنا ہندوستان میں قدرے مشکل تھا۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بہت سے کتب خانے برباد ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انگلستان جانے کا ارادہ کیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں انہیں اسلامی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کتابوں اور وہاں کے

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

کتب خانوں سے بھی استفادہ حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن اس کے لیے سرسید کو اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی جس کی فراہمی کے لیے انہیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اس سفر کے لیے اپنا کتب خانہ بھی فروخت کر دیا اور گھر بھی گروی رکھ دیا، اس کے باوجود ضرورت کے مطابق مطلوبہ رقم اکٹھا نہ ہوسکی۔ اسی وقت اتفاق سے سرسید کے فرزند سید محمود کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک وظیفہ مل گیا، جس سے ان کو کچھ عافیت ہوئی اور سفر انگلستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اپنے دونوں بیٹے سید محمود اور سید حامد اور ایک ملازم چھجو کے ساتھ ۱۰/اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے 'انڈیا آفس' کے کتب خانہ اور 'برٹش میوزم' کی لائبریری سے استفادہ حاصل کیا ساتھ ہی بہت سی اہم کتابیں بھی خریدیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ اپنی تمام کوششوں اور شب و روز کی مسلسل محنتوں کے بعد 'بارہ خطبوں' پر مشتمل ایک کتاب 'خطبات احمدیہ' کے نام سے ۱۸۷۰ء میں لندن میں شائع کی۔ (قابل غور بات یہ ہے کہ سرسید خود انگریزی زبان سے اتنی اچھی واقفیت نہیں رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے ایک لائق انگریز کی مدد سے اس کا ترجمہ انگریزی میں کروایا)۔ برطانیہ میں دھیرے دھیرے اس کتاب کا چرچا عام ہونے لگا تو کسی انگریز نے لندن کے ایک اخبار میں اس کتاب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

> ''عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہی کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔''[۲]

اب ہم 'خطبات احمدیہ' کا مختصر طور پر جائزہ لینے کی کوشش کریں گے تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ 'سر ولیم میور' نے مذہب اسلام پر کس قسم کے اعتراضات کیے اور 'سرسید' نے اس کا جواب دے کر کس طرح اسے غلط ثابت کیا ہے۔

خطبات احمدیہ میں سرسید نے آپؐ کی ابتدائی بارہ سال تک کی سوانح پیش کی ہے اور ساتھ ہی دوسرے مسائل پر بھی بحث کی ہے مثلاً عرب کے جغرافیائی حالات اور وہاں کی نسلی معلومات، انجیل میں آپؐ کی آمد کی بشارت کا ذکر اور انجیل سے قرآن کی صداقت کا ثبوت دینے کی کوشش وغیرہ۔

سر ولیم میور نے آپؐ کی کئی شادیاں، اسلام میں کئی نکاح کی اجازت اور طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا تھا سرسید نے ان تمام کا جواب توریت کے حوالہ سے دیا اور مثال میں انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے دو نکاح، حضرت یعقوبؑ کے چار نکاح اور حضرت داؤدؑ کی نوے سے زیادہ بیویوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی طلاق کے مسئلہ کو بھی توریت کے حوالہ سے

www.urduchannel.in

ہی حل کیا۔ ولیم میور نے اپنی کتاب (Life Of Mohammad) کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام میں مذہب کے معاملہ پر آزادئ رائے کی گنجائش نہیں ہے لہذا سرسید نے اس کے جواب میں اپنی مدلّل تحریر سے یہ ثابت کیا کہ جس طرح کی پابندی عیسائی مذہب میں ہے اس طرح کی پابندی دنیا کے کسی مذاہب میں نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے جہاد کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا اور اس سے متعلق مختلف قسم کی غلط رائے قائم کی تھی جس کے جواب میں سرسید نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ جتنی سختی اور شدّت کے ساتھ انبیاء اسرائیل کو جہاد کا حکم ہوا اتنی سختی کے ساتھ اسلام میں جہاد کا حکم نہیں ہے۔ اسی طرح سر ولیم میور کے تمام اعتراضات کا لفظ بہ لفظ مدلّل جواب دیا سرسید خود لکھتے ہیں:

> ''نہایت محققانہ جواب ہے اور یہ شرط کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا اور نہ، میرا نام نہیں۔ اب اس کتاب (خطبات احمدیہ) کے خطبات کا عملی جائزہ لینے کی سعی کرتے چلیں۔''[۳]

۱) پہلا خطبہ: اس میں اسلام کی آمد سے پہلے عرب قبیلوں کی مفصل تاریخ اور اس کے جغرافیائی حالات پر بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی توریت کے حوالہ سے آپ ؐ کا اسماعیلؑ کی اولاد سے ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔ (یہ خطبہ تمام خطبوں سے بڑا ہے)

۲) دوسرا خطبہ: اس میں اسلام سے پہلے عرب کے رسم ورواج، اخلاق، سماجی ناہمواریوں اور ان کے عقائد پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد ان تمام چیزوں میں کس قدر اصلاحی تبدیلیاں آئیں۔

۳) تیسرا خطبہ: اس میں اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے اہل عرب چار فرقوں میں منقسم تھے۔

(۱) بُت پرست (۲) لامذہب

(۳) خداپرست (۴) معتقدین مذہبِ الہامی

اور ان پر تفصیل سے بحث بھی کی ہے۔

۴) چوتھا خطبہ: اس میں مذہب اسلام کو ساری انسانیت کے لیے رحمت بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس مذہب سے دنیا کے دیگر مذاہب کو بھی بڑا فائدہ ہوا ہے۔ اس خطبے کو سرسید نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۵) پانچواں خطبہ: یہ خطبہ مسلمانوں کی مذہبی کتب یعنی قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اہم تصنیفوں کے تجزیے اور

www.urduchannel.in

اس کی اہمیت پر مشتمل ہے۔

۶) چھٹا خطبہ: یہ خطبہ مذہب اسلام کی روایتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔اس میں اسلامی روایتوں کی حقیقت اوران کے فروغ کے اسباب پر بھی بحث کی گئی ہے۔

۷) ساتواں خطبہ: یہ قرآن مجید کے نزول سے متعلق ہے۔اس میں قرآن کی سورتوں کی ترتیب اوراس کی قرأت وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

۸) آٹھواں خطبہ :اس میں اسلام سے پہلے کے کعبہ اوراس کی تاریخی وسماجی کیفیت ، مقام قربانی، سکونت اسماعیلؑ وغیرہ جیسے مسئلے پر مباحث موجود ہیں۔ یہ خطبہ بھی بہت طویل ہے اس میں قرآن وحدیث کے دلائل کے علاوہ توریت وزبوروغیرہ کے بیانات بھی شامل ہیں۔

۹) نواں خطبہ: یہ آپؐ کے نسب نامے سے متعلق ہے اوراس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپؐ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہیں۔

۱۰) دسواں خطبہ:اس میں توریت اورانجیل میں آپؐ کی آمد کے متعلق جو بشارتیں دی گئی ہیں ان کا ذکر ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بھی اس سے متعلق آیتیں موجود ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ توریت اورانجیل میں آپؐ کے آمد کی خبر دی گئی ہے۔

۱۱) گیارہواں خطبہ:اس میں معراج کی حقیقت اوراس کے متعلقات کا ذکر ہے، نیز اس ضمن میں سرسید نے اپنا عقلی اور مذہبی نظریہ بھی پیش کیا ہے۔

۱۲) بارہواں خطبہ:اس میں آپؐ کی ابتدائی زندگی کے بارہ سالہ عمر مبارک کے سوانحی حالات پیش کیے ہیں۔ نیز سرولیم میور نے آپؐ کے بچپن کی زندگی پر جو اعتراضات کیے تھے اس میں اس کا بھی جواب موجود ہے۔

اس طرح سرسید نے اپنے تمام خطبوں میں سرولیم میور کے تمام اعتراضات کا مکمل و مدلّل جوابات دے کر 'خطبات احمدیہ' کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔حالؔی لکھتے ہیں کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اورضروری سمجھتے تھے اور جب حسب دلخواہ کتاب تیار ہوگئی تو ان کو بے انتہا خوشی اورفخر اس کے لکھنے پر ہوا ایک جگہ سرسید خود لکھتے ہیں:

''اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا، خدا قبول کرے۔''[۴]

جب اس کتاب کا علم سرولیم میور کو ہوا تو اس نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے کیے ہوے اعتراضات کے

www.urduchannel.in

غلط اور باطل ہونے کو تسلیم کیا اور اسی بنا پر وہ سرسید سے متاثر بھی ہوا لہذا جب وہ لفٹیننٹ گورنر ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سرسید تحریک کی حمایت کی اور سرسید کے ذریعہ قائم کردہ 'مدرستہ العلوم' کا معائنہ بھی کیا اور مفید مشورے بھی دیئے۔

حواشی:

(۱) حیات جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۴۱۸-۴۱۷

(۲) ایضاً، ص: ۴۲۳

(۳) ایضاً، ص: ۴۲۱

(۴) ایضاً، ص: ۴۲۱

www.urduchannel.in

فوزیہ ارشاد*

اردو زبان کے فروغ میں سرسید کی حصہ داری

شام در شام جلیں گے تری یادوں کے چراغ
نسل در نسل ترا درد نمایاں ہوگا

سرسید احمد خاں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ انگریزوں کا پنجۂ استبداد روز بروز شدید تر ہوتا جارہا تھا۔ بالخصوص مسلمانوں پر جہالت، پستی، تنزلی اور گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے ایسے عالم میں علم کے ذریعے ترقی کی شمع روشن کی اور اس تاریکی اور بدحالی سے قوم کو نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سرسید کے دور کو ملک وملت اور زبان وادب دونوں اعتبار سے عبوری دور کہا جاسکتا۔ کیوں کہ اس وقت ہندوستان معاشی، سماجی اور سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد حالات اور بھی ابتر ہوگئے تھے اور اس کا اثر ادب پر بھی پڑا۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت کا ادب سماج سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ چوں کہ معاشرے میں تو روز بروز تبدیلیاں ہورہی تھیں لیکن ادب اپنے پرانے طرز پر ہی لکھا جارہا تھا۔ ایسے حالات میں سرسید نے قوم وزبان کی فلاح کے لیے اپنی ذات وقف کردی اور انہیں کامیابی وخوشحالی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہمیشہ تگ ودو کرتے رہے۔ ذاتی خدمات کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے جو خدمات تنہا سرسید نے انجام دیں گذشتہ دوصدی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

سرسید نے اردو کی جو عدیم النظیر خدمت کی ہے، اس کے احسان سے یہ زبان سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ ان کے زمانے تک اردو تصنیفی زبان نہ تھی، اس کو بول چال میں دخل تھا۔ کسی قدر مراسلت وعدالتی کاموں میں رواج ہو چلا تھا۔ لیکن مصنفوں اور معززین وشرفاء کی زبان اس وقت تک فارسی ہی تھی۔ اردو میں بلند پایہ تصنیفات بھی نہیں تھیں اور نہ اردو کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے محض اپنے قلم سے اردو کو اس قعر مذلت سے نکال

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

کر دنیا کی بلندرتبہ ومعزز زبانوں کے برابر لاکر کھڑا کر دیا۔ان کی کوششوں کے اثر سے اردو زبان میں وہ تمام صلاحیتیں پیدا ہوگئیں جو ایک زندہ زبان کے لیے ضروری تھیں۔

سرسید نے اصلاحِ زبان کے ساتھ ہی اصلاح شاعری پر بھی توجہ کی اور اپنے اثر وکوشش سے بے شمار قومی نظمیں لکھوائیں جو زبان، بندش اور قواعد وعروض کی عدم پابندی کی وجہ سے قدیم طرز شاعری سے بالکل مختلف ہیں۔اس مقصد میں ان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ بے شمار نظموں کے ساتھ ملک کو حالؔی اور شبلی جیسے دو ممتاز قومی شاعر نصیب ہوگئے۔جن کے بعد زمانے نے کئی قومی شاعر پیدا کیے۔

سرسید احمد خاں ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے،اس لیے انہوں نے اردو شاعری کو نیچرل شاعری اور پھر قومی شاعری کا رنگ دے دیا۔ان کے انتقال کے بعد قومی شاعری نیچرل شاعری میں بدل گئی اور جنگ آزادی میں اردو زبان وادب نے جو خدمات انجام دی تھیں اس کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔

سرسید نے ابتدا میں مشغلہ علمی اختیار کیا۔اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے۔آہؔی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی۔اس لیے وہ بہت جلد اس کوچے سے نکل آئے اور نثر کی طرف مائل ہوئے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید اردو نثر اور جدید اسلوب تحریر کے بانی تھے۔اردو ادب کی بنیاد انہی کی ڈالی ہوئی ہے۔انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سر جیمس لایل نے لکھا ہے:

> ''سرسید کی اردو جدید خیالات کی اشاعت کا آلہ ہے۔اس سے انہوں نے اس وقت کام لیا جب کہ نثر اردو کا وجود نہ تھا اور اس کو اس طرح بنایا اور برتا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔''[۱]

سرسید نے زبان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''میں اپنی زبان سے وہ مراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح پر مستعمل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو اور وہ اس میں بات چیت کرتا ہو،خواہ وہ اس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو۔''[۲]

اس تعریف کے بعد یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کی اس سے بہتر،مختصر اور جامع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ ہم سب کو اقرار کرنا چاہیے کہ یہی صحیح تعریف ہے۔اس سے ان کی رائے بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کو اس سانچے میں ڈھالنے کی جو کوشش وہ کر رہے تھے اس کی بنیاد لسانی تھی،اس کا تعلق فن سے تھا۔

www.urduchannel.in

اچھی نثر لکھنا اچھی شعر گوئی سے کم مشکل نہیں ہے اور صاحب طرز ہونا اور بھی مشکل ہے۔ طرز یا اسلوب فنکار کی شخصیت اور رچاؤ کا نام ہے۔ انگریزی کا بہت مشہور محاورہ ہے کہ..... ''آدمی اپنے انداز سے پہچانا جاتا ہے'' ''Style is the man'' (یعنی اسلوب ہی آدمی ہے) اس سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اسلوب فنکار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسلوب اور طرز تحریر کے سلسلے میں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ سرسید نے جہاں بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے قطعیت کو راہ دینے کے ساتھ ساتھ ابلاغ و ترسیل کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ خواہ وہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین ہوں یا ''آثار الصنادید'' کی عبارت۔

سرسید نے ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک پرچہ نکالا اس پرچے کی زبان نہایت سادہ تھی۔ حالاں کہ اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں مانی جاتی تھی۔ اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسے فارسی نما طرز میں لکھتا تھا اس لیے سرسید نے بھی ''آثار الصنادید'' میں جہاں انشا پردازی سے کام لیا اس طرز کو برتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے موجد اور امام سرسید احمد خاں تھے، اس زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو اخبار جاری ہوگئے اور اردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات میں ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ سرسید نے اردو زبان میں جو باتیں کیں اس کو وہ مختصراً ''تہذیب الاخلاق'' میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ان کی خاص عبارت یہ ہے:

> ''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی کہ مضمون ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت جو تشبیہات استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہیں اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہی ہے اور دل پر اس کا اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''[۳]

سرسید ایک اچھے انشا پرداز بھی تھے۔ اردو زبان چوں کہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی تھی۔ اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لیے اگر کسی علمی مسئلہ سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔ پروفیسر رینان جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا ہے اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

www.urduchannel.in

''عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے''

رینان جن مسائل کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان کو نا قابل سمجھنے کی بھول کر بیٹھا تھا سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیے۔

سرسید احمد خاں انگریزی زبان وادب سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس راز سے بھی آگاہ تھے کہ نثر کی زبان میں قطعیت ہونی چاہیے۔ جب تک نثر میں قطعیت نہ ہوگی نثر سائنٹفک نہیں کہی جاسکتی۔ نثر میں تخیل پر تعقل کا پہرہ نہ ہو، جذبات کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو نثر بھی بے لگام ہو جاتی ہے۔ ایسی نثر کو نثر کی حدود میں رہنے دیا اور ایسی نثر پر زور دیا جو تعمیری اور سائنٹفک ہو۔ بات وہی پیش کی جائے جو دل سے نکلے اور دل میں بیٹھ جائے۔ سرسید اردو کو ایک ہمہ گیر اور ہندوستان گیر اہمیت کی حامل زبان سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس کا سرمایہ وسیع ہو اور یہ صرف قصے کہانی کی زبان بن کر نہ رہ جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے خود بھی کوشش ومحنت کی ساتھ ہی اپنے رفقا کو بھی اس کی تلقین کی کہ وہ سلاست، سادگی، صفائی اور روز مرہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اور ہر قسم کے خیال سہل سے سہل انداز میں پیش کریں اس لیے بعض حضرات نے سرسید کی نثر کو سپاٹ اور پھیکا کہا ہے۔

یہ کسی حد تک سچ بھی ہے کہ سرسید کی نثر سادہ اور کسی قدر بے کیف بھی ہے۔ سادگی اور سہل پسندی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ لیکن اگر تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سادگی اور صفائی سرسید کے یہاں ردعمل کے طور پر ابھری ہے۔ اس ردعمل کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی کارفرما ہے کہ سرسید سے پہلے اردو نثر رنگین اور رعنائی، مرصع کاری، پیچیدگی، اور تصنع وتکلف کے سبب ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے سے قاصر تھی، اس میں ابدیت اور استحکام نہ تھا۔ سرسید نے محسوس کیا کہ اس طرز سے کنارہ کشی کر کے سائنسی طرز اختیار کیا جائے ان سے پہلے اردو نثر ایسی تھی جس میں تصنع اور آوردگی کی حکمرانی تھی۔

سلیس اور رواں نثر نگاری کی بنیاد میر امنؔ دہلوی نے رکھی، میر امنؔ کے بعد سب سے پہلے سرسید نے سادہ اور عام فہم نثر کو گلے لگایا۔ اس کے پیچھے ایک مقصد پوشیدہ تھا کیوں کہ سرسید نے اپنی آواز قوم تک پہچانے کے لیے یہ راہ اختیار کی۔ لیکن اس راہ پر آنے کے بعد وہ ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہے۔ سادگی کی بدولت ایک بلند مرتبہ ادیب وفنکار بن کر اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام چھوڑ گئے۔

سرسید نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی میں موجود ادبی اور علمی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی جائیں تا کہ مغربی ادب اور مغربی علوم وفنون کی طرف اہل وطن مائل ہوں، سوسائٹی کے زیر اہتمام جو ترجمے ہوئے وہ عام فہم ہیں اور اسی لیے بعض حلقوں میں انہیں مقبولیت بھی

www.urduchannel.in

حاصل ہوئی۔ان ترجموں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مغربی افکار وخیالات اردو کے پیمانے میں ڈھل رہے تھے۔دوسری طرف طبع زاد تحریریں بھی ان ترجموں کی زبان کا اثر قبول کررہی تھیں۔اردو نثر کا ایک مزاج اور اسلوب متعین ہورہا تھا اس سوسائٹی کے زیر اہتمام کتابیں کم ترجمہ ہوئیں۔لیکن ان کتابوں نے ملک کو قرون وسطیٰ کے اندھیرے سے نکالنے کے لیے جو فضا تیار کی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جدید اردو نثر کا سب سے بڑا کارواں سالار حالؔی، غزل کا امام حسرتؔ، آلام حیات کا مفسر فانیؔ اور نئے شعری رجحانات کے سارے ترجمان علی گڑھ ہی کے دامن سے اٹھے تھے۔علی گڑھ نے گزشتہ نصف صدی میں اردو شاعری کو اس کے نشو ونما کی ہر منزل پر متاثر کیا ہے۔علی گڑھ نے سارے محدود مکاتب فکر اور ادبی روایات کو اپنے اندر سمیٹ کر ایک نیا رنگ وروپ بخشا اور وہ تابناک مقصدیت عطا کی کہ اردو ادب عہد وسطیٰ کی فرسودہ قدروں کو چھوڑ کر عہد نو کے تقاضوں کا جواب دینے کے قابل ہوگیا۔

غرض یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کی تھی اور اسی پر تاحیات قائم ودائم رہے۔اردو ادب بھی ان کا مرہون منت ہے۔ہماری زبان کا جو وقار اور رنگ وروپ آج نظر آتا ہے انہی کا عطا کردہ ہے۔وقت اور زمانے نے بھی ان کے احسان کا اعتراف کیا ہے، مسلم یونیورسٹی ان کی ایسی یادگار ہے جو رفتار کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر ہمیشہ آگے بڑھتی رہے گی۔افسوس ہے تو یہ کہ اردو زبان والوں نے اپنی رفتار کو نہایت سست کررکھا ہے، اس کی ذمہ داری ہم نوجوانوں پر ہے، ہم زندگی کی تازہ بہاروں سے لطف اندوز ہورہے ہیں، دل امیدوں کے مسکن ہیں اور دماغ آرزو کدہ، کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شباب کی دنیا کا ایک گوشہ اردو کی بے لوث اور خالص خدمت کے لیے بھی نکل آئے۔

چشم سید نگراں ہے کہ پھر اٹھے شاید
کوئی دیوانہ محبت کے بیابانوں سے

○

حواشی:

(۱) حیات سرسید، نورالرحمٰن، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ص:۱۳۴-۱۳۵

(۲) ایضاً، ص:۱۳۴-۱۳۵

(۳) ایضاً، ص:۱۳۵

(۴) جہان کتب (سرسید نمبر) مضمون: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مولانا شبلی، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۱۶ء، ص:۳۵۹

www.urduchannel.in

محمد کامران علی خان*

سرسید کا سفرنامہ ''مسافران لندن''

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن مین دیدہ وَر پیدا
(اقبالؔ)

سرسید احمد خاں کا نام آتے ہی ایک ایسے شخص کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو بیک وقت خطیب، مورخ، محقق، مفسر، صحافی، مقالہ نگار اور قوم پرست ان تمام تر خوبیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ شاید اسی لیے یہ شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ سرسید احمد خاں ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ یہ قوم کے رہنما تھے، ان کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے بہت محبت تھی اسی لیے ان کو ہمیشہ قوم کی ترقی، خوشحالی اور کامرانی کی فکر بے چین رکھتی تھی۔ کیوں کہ ملک کی ترقی قوم کی ترقی سے جڑی ہوتی ہے۔ سرسید اپنی قوم کو آگے بڑھتے، ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو قوم کی تباہی اور بربادی کو دیکھ کر بڑا رنج اور افسوس ہوتا تھا، کہ یہ وہی قوم ہے جو علم وفضل، حکمرانی وغیرہ میں اعلیٰ مقام رکھتی تھی جو آج اس قدر پست ہوچکی ہے۔ ان تمام مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لیے سرسید نے بہت سارے اقدام اٹھائے جن میں سے ان کا ایک اہم قدم ''سفرلندن'' بھی تھا جو بعد میں ''مسافرانِ لندن'' کے نام سے منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی کوشش ناکام ہوچکی تھی اور مغلوں نے اپنی حکومت، تخت وتاج برسوں کی شان وشوکت سب کچھ کھو دی تھی۔ مشرقی تہذیب وثقافت پر مغربی تہذیب وثقافت غالب ہونے لگی۔ مشرق کے قدیم علوم وفنون کی جگہ مغرب کے جدید علوم وفنون لینے لگے۔ ہندوستانیوں میں خاص کر مسلمان زوال آمادہ ہوتے جارہے تھے کیوں کہ انگریز مسلمانوں سے اور مسلمان انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

جس کی وجہ سے سرسید نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر ہندوستانیوں نے خاص کر مسلمانوں نے مغربی وجدید علوم وفنون کو حاصل نہ کیا تو وہ دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے اوران کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اسی لیے قوم کو جدید تعلیم کی نعمت سے فیضیاب ہونا ہی پڑے گا، اگر وہ اس نعمت سے محروم رہی تو وہ کبھی ترقی یافتہ نہیں ہوسکتی اور دوسری قوموں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔ ان تمام فکروں نے سرسید کو بہت ہی بے چین اور فکرمند کر دیا، آخر کار انہوں نے اپنی قوم کے مسائل کا حل ڈھونڈنے اوران کو ایک نئی راہ دکھانے کے لیے لندن کا سفر اختیار کیا۔

سرسید احمد خاں کی تمام تحریروں میں ''مسافران لندن'' کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ یہ صرف ایک سفرنامہ نہیں ہے بلکہ ایک قومی رہنما کی تعلیمی اور تحقیقی جستجو ہے جس میں وہ جدید مغربی علوم وفنون کی نئی راہیں تلاش کرنے نکلا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی سرسید کے سفرلندن کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو آئندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا ان کے لیے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا، ان کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی، جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں اُنس اور میل جول پیدا نہ ہوگا، اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے، گو وہ اب تک ان تدبیروں میں برابر سرگرم عمل رہے مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے ان کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔''[۱]

سرسید نے اپنے سفرلندن کا آغاز ایک اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے کیا اس سفر میں ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود، مرزا خداداد بیگ اوران کا خدمت گار چھجو (عظیم اللہ) تھا۔ ان سب کے ساتھ سرسید لندن پہنچے اور ایک سال پانچ مہینے قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان آ گئے۔ بنارس سے لے کر انگلستان کے سفر میں سرسید جن جن مقامات سے گزرے اور اس دوران جو کچھ انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا سمجھا اور محسوس کیا ان سب کو بڑے ہی دلچسپ تنقیدی اور مکالماتی انداز میں بیان کیا۔ سرسید نے اپنے سفرنامے کو اسی وقت سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار میں قسط وار چھپوانا شروع کر دیا تھا مگر کچھ مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے اس کو بند کروا دیا۔ بعد میں محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں اس سفرنامے کو مکمل کر کے ''مسافرانِ لندن'' کے نام سے شائع کروایا۔ اس میں انہوں نے سرسید کے وہ مضامین اور خطوط جو قیامِ لندن کے دوران لکھے تھے ان کو بھی شامل کیا۔

www.urduchannel.in

''مسافرانِ لندن'' کا خلاصہ اگر چند لفظوں میں بیان کیا جائے تو سرسید بنارس سے بمبئی پہنچتے ہیں راستے میں جب وہ بیلگام اسٹیشن سے ہوتے ہوئے گزرتے ہیں تو ان کو وہاں کا نظام بہت اچھا لگتا ہے۔ اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ نظام شمالی ہند کے ریلوے اسٹیشنوں پر بھی ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ بمبئی پہنچتے ہیں وہاں ان کی ملاقات پارسیوں اور میمن سوداگروں سے ہوتی ہے ان سے وہ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ پارسیوں سے خاص کر کیوں کہ ان کی قوم میں شائستگی اور تربیت پر بہت زیادہ دھیان دیا جاتا ہے خاص کر لڑکیوں کی تربیت پر دھیان دیتے ہیں۔ بمبئی سے سرسید جہاز کے ذریعہ ۱۰/اپریل ۱۸۶۹ء کو لندن کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ ان کا جہاز پانی کے راستے عدن ہوتا ہوا مصر پہنچتا ہے۔ مصر میں سرسید کو عورتوں کے تعلیمی نظام، نہروں کا بنانا اور خوبصورت سوئز بازار یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ جہاز جب مصر سے اٹلی پہنچتا ہے تو راستے میں بونی فیشیو میں جزیرہ کیپریا اور کارسکا جو کہ مشہور وطن پرست گیری بالڈی اور نپولین بونا پارٹ کی جائے پیدائش ہے اس کو سرسید دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ کیوں کہ سرسید ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ شہر مارسیلز اور پھر دومئی کو وہ دنیا کے اعلیٰ نشان شہر پیرس پہنچتے ہیں وہاں وہ نہروں، فواروں اور عمارتوں کو دیکھ کر اپنے ہندوستان کی ان تمام چیزوں کو یاد کرتے ہیں اور اپنے وطن کی چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں مگر وہاں ان کو وارسائی (Versailles) کے نگار خانے بہت متاثر کرتے ہیں۔ ۴/مئی کو سرسید لندن پہنچتے ہیں اور میکلن برگ اسکوائر میں قیام کرتے ہیں۔ لندن میں قیام کے دوران سرسید نے اپنے سفر کے تمام مقاصد کو بخوبی انجام دیا۔ ان کو وہاں بہت عزت اور محبت ملی اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے بعد سرسید ۴/ستمبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان نئے جذبے اور نئی امنگوں کے ساتھ آجاتے ہیں اسی کے ساتھ ان کا سفر انگلستان مکمل ہو جاتا ہے۔

سرسید کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' سفرنامہ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ایک مکمل اور کامیاب سفرنامے میں ہونی چاہئے۔ اس سفرنامے کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو سارا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے کیوں کہ اس میں سرسید نے ایک مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ مانو دو لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ڈرامائی منظر پیدا ہو رہا ہو۔ قیام پیرس کے دوران کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''غرض کہ ہم اس حد کے باہر ہوئے اور چند میل چلے گئے کہ دفعتاً ہمارے سامنے ایک بہشت کا ٹکڑا آیا یعنی پارک! ایک نہایت وسیع میدان کوسوں کا محدود کیا ہے، اس میں نہایت نفیس و خوبصورت سڑکیں بنائی ہیں وہ تمام میدان بالکل سبزو گلزار ہے سایہ دار درخت نہایت خوب صورتی سے لگائے ہیں۔ ان کو عجیب عجیب قدرتی خوبصورتیوں سے کترا ہے، جا بجا کرسیاں اور

www.urduchannel.in

بنچیں نہایت خوبصورت وخوش نما آہنی اور چینی کاری کی بچھی ہوئی ہیں۔''[۲]

سرسید کو انگلستان کی ہر ایک چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آ رہی تھی، وہ ہر اس چیز کا مشاہدہ بہت غور سے کر رہے تھے جس سے ان کے ملک اور قوم کو نئی راہیں فراہم ہوسکیں۔ وہ اپنے سفرنامے میں اسی لیے ایک ایک جگہ کا ذکر بہت ہی تفصیل سے کرتے ہیں قیام انگلستان کے دوران کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''برسٹل ایک مشہور شہر انگلستان کا ہے، دریائے ایوان کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کے نیچے اس قدر عمیق پانی ہے کہ اسٹیمر شہر کے کنارے تک چلے آتے ہیں۔ جس سے سوداگری کو بہت فائدہ ہے۔ ایک لاکھ چوّن ہزار آدمیوں کی آبادی ہے، تینتیس ہزار پانچ سو گھر آباد ہیں اور مع کلفٹن کے تیئس اسکول ہیں اور نو خیرات خانے اور دس بینک اور قریب چالیس کے قریب عام لوگوں کے لیے مکانات ہیں۔''[۳]

ان تمام بہترین انتظامات کو دیکھ کر سرسید بہت خوش ہوتے تھے اور یہ سوچتے تھے کہ کاش اسی طرح ہمارا ملک بھی ترقی یافتہ ہوجائے جس طرح انگلستان کے تمام شہر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو وہاں کا تعلیمی نظام، اور عوام کا تعلیم کو لے کر کافی سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا ان سب نے بہت متاثر کیا۔ اقتباس دیکھیں:

''کیب مین اور کوچوان اپنی گدّی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں، جہاں سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری ہو وہ کھڑی کی اور انھوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ آپ خیال کرلیں کہ یہاں کیب مین کی ایسی حیثیت ہے جیسی کہ بنارس میں وہاں کے یکہ کرایہ پر چلانے والوں کی حیثیت۔ پس جب تک اس قدر ترقی عام تعلیم کی نہ ہو شائستگی اور تربیت کسی قوم میں آنی اور اس قوم کی عزت ہونی ناممکن ہے۔''[۴]

ملک اور قوم کے ساتھ ساتھ سرسید کو اپنے مذہب سے بھی بہت عقیدت تھی جس کا ثبوت انہوں نے قیام انگلستان کے دوران بھی دیا سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب خطبات احمدیہ'' کے نام کی کتاب لکھ کر دیا۔ ولیم میور نے محمدؐ کی شان میں گستاخی کی تھی جو کہ سرسید سے برداشت نہیں ہوئی۔ اور انہوں نے اس کا جواب دیا جس کی وجہ سے ان کا سارا قیمتی سامان یہاں تک کہ گھر بھی گروی ہوگیا مگر اپنے نبی کی شان میں کمی نہیں آنے دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے ایک اور اہم کام انجام دیا اور وہ تھا انگلستان کے دو مشہور معاشرتی اور اصلاحی پرچوں اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر

www.urduchannel.in

(Spectator & Tetlor) کی ہی طرز پر ایک رسالہ علی گڑھ سے شائع کر کے اپنی قوم میں بیداری پیدا کرنا اور اس کی اصلاح کرنے کا احد کرنا جس کا نام انہوں نے تہذیب الاخلاق (MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMERR) رکھا جو انہوں نے انگلستان سے واپسی پر ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو علی گڑھ سے جاری کیا۔

سرسید کے سفرنامہ ''مسافران لندن'' کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بخوبی انداہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے انگلستان کی زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا اور محسوس کیا، وہاں کے جدید تعلیمی نظام کا مشاہدہ کیا لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کو جانا، وہاں کی تہذیبی قدروں کو وہاں کے عجائبات کو، صنعت وحرفت وغیرہ ان تمام چیزوں کو بہت ہی اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اور ان تمام خوبیوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی کا ایک خاکہ تیار کیا۔ اسی وجہ سے سرسید کا سفرنامہ ہمیں نہ صرف انگلستان کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ ہندوستان کو، یہاں کی قوم کو کیسے شائستگی کے ساتھ کامیابی اور کامرانی کو حاصل کرنا ہے، کس طرح جدید علوم وفنون سے فیضیاب ہونا ہے یہ تمام باتیں بھی سکھاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ سرسید کا ولایت کا سفر کرنا، وہاں قیام کرنا اور واپس آنا یہ سب اپنے ملک وقوم کے لیے تھا تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی قوم کی فلاح وبہبود میں صرف کردی۔ یہ سفر نامہ ایک کامیاب اور مکمل سفرنامہ ہے جس کی وجہ سے سرسید کو اردو سفرنامہ نگاری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حواشی:

(۱) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص: ۱۱۷-۱۱۶

(۲) سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن، مرتب: اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۹ء، ص: ۱۲۷

(۳) ایضاً، ص: ۱۴۰

(۴) مسافران لندن: سرسید احمد خاں، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص: ۱۹۷

کتابیات:

(۱) سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن مرتب اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

(۲) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ: خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

(۳) اردو سفرنامے: انیسویں صدی میں، ڈاکٹر قُدسیہ قریشی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

(۴) مسافرانِ لندن: سرسید احمد خاں، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ، لاہور

(۵) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

www.urduchannel.in

کھکشاں ظھور*

سرسید-سدابہار شخصیت

سرسید احمد خاں کی شخصیت مختلف الجہات تھی، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں مانتے تھے۔ان کے افکار ونظریات کی وسعتوں میں قوم وملک، مذہب، سماج، اقتصادی شعور کے ساتھ انفرادی اجتماعی زندگی کا ہر پہلو اور شعبۂ حیات شامل ہے۔

سرسید ایک ایسی ہمہ گیر اور معتبر شخصیت ہیں جنھوں نے قوم کی رہنمائی اور رہبری کی اور اس کی اصلاح وترقی کا سامان کیا اور اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قوم میں حوصلہ مندی اور ترقی کی راہیں ہموار کیں۔سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی زندگی میں تعلیم کے ذریعے ایک انقلاب برپا کردیا۔مسلمانوں کو فرسودہ خیالات سے نکال کر ان کے خیالات کو جدید ترقی کی طرف موڑ دیا اور اس پر قائم رہنے کی پرزور وکالت کرتے رہے۔کیوں کہ سرسید اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے تمام مجموعی مسائل کا حل تعلیم بلکہ جدید تعلیم حاصل کرنے میں ہے۔سرسید کا کہنا تھا کہ تعلیم ہر مرض کی دوا ہے اگر یہ حاصل ہوجائے تو مسلمان قوم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور حقوق پھر سے حاصل کرسکتی ہے جن سے وہ محروم کردی گئی ہے۔اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ دل وجان سے کوشاں رہے پمفلیٹ لکھے،تقریریں کیں،کمیٹیاں بنائیں،مضامین لکھے،سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور ''تہذیب الاخلاق'' نام کا ایک مشہور رسالہ نکالا سرسید کا تہذیبی شعور بھی سیاسی شعور کی طرح پختہ تھا۔سرسید نے مذہبی مباحث پر بھی بحث کی اور قرآن کی تفسیر سائنٹفک انداز میں کی۔تفسیر قرآن کے سلسلے میں علماء اور دوسرے لوگوں نے سرسید پر اعتراضات کیے اور انھیں لعنت وملامت کا نشانہ بھی بننا پڑا اور ان پر مختلف قسم کے الزامات لگائے گئے اور طرح طرح کی گالیاں جیسے مسلمانوں کا دشمن،خوشامدی،ٹوڈی،انگریزوں کا پٹھو وغیرہ برے القاب سے پکارا گیا مگر انھوں نے ہمیشہ صبر سے کام لیا اور ان اعتراضات پر خاموشی اختیار کی چنانچہ ان کے احباب وہم عصروں نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی

* ریسرچ اسکالر،شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

www.urduchannel.in

سرسید سے اجازت طلب کی لیکن سرسید نے انھیں صبر کی تلقین کی اور خاموش رہنے کو کہا۔ کیوں کہ سرسید جانتے تھے کہ اس وقت مسلمان قوم کو اس کی فرسودہ حالت سے نکالنا اشد ضروری ہے اور مذہبی مباحث میں پڑنے کے بجائے جدید تعلیم پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کا یہ رویہ انتہائی مناسب اور صحیح عمل ثابت ہوا کیوں کہ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ وہ مذہبی مباحث میں الجھیں اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا مشن کمزور اور ناکام ہوسکتا تھا۔

مسلمان قوم کے سلسلے میں سرسید کی فکر کا آغاز ۱۸۵۷ء کے خونی واقعہ، غدر کے بعد سے ہوتا ہے۔ جو تاریخ میں سماجی، سیاسی اقتصادی اور اصلاحی اعتبار سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز منظر کو سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جسے پہلی جنگ آزادی اور غدر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اس میں ہندوستانیوں نے انگریزی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس میں وہ ناکام ہوگئے۔ اس بغاوت کے ناکام ہوتے ہی ہندوستانی مسلمانوں کی بربادی کا آغاز ہوا اور اس کی ناکامی کا الزام مسلمانوں پر رکھا گیا۔ اور انگریزوں نے اس شورش کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا۔ اور اس طرح مسلمان ان کی مخالفت و بربریت کا نشانہ بنے انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے اور گھروں کو تباہ و برباد کردیا۔ مسلمانوں کی لاشوں کو شاہراہوں پر لٹکا دیا گیا۔

اس قیامت خیز منظر اور مسلمانوں کی ابتر حالت کو دیکھ کر سرسید کی طبیعت بے چین ہوا ٹھی اور سرسید کو گہرا صدمہ پہنچا۔ سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں کی دوری ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور دونوں قوموں (انگریزوں اور مسلمانوں) کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ''اسباب بغاوت ہند'' قلم بند کیا جس میں انھوں نے بغاوت کا ذمہ دار برطانوی سامراج کو بتایا اس کے علاوہ ایک رسالہ ''خیر خواہان مسلمان'' لکھا، اس رسالے کا اصل مقصد یہی تھا کہ مسلمان اور انگریز ایک دوسرے کے قریب آئیں اس میں انھوں نے انگریزوں کے ساتھ ہاتھ ملانا، کھانا پینا، تعلق رکھنا درست قرار دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے ذریعے انھوں نے مسلمان معاشرے میں پیدا ہوچکی خرابیوں، ناہمواریوں اور رسم و رواج کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ان کی اس کوشش کو علی گڑھ تحریک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

سرسید کو یقین تھا کہ جب تک مسلمان انگریزی زبان نہیں سیکھیں گے انگریزوں کی پالیسیوں سے باخبر نہیں ہوسکتے چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے پر زور دیا۔ سرسید کے اس فیصلے سے مسلم معاشرہ بھڑک اٹھا اور انھوں نے سرسید کے اصل مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ مسلم قوم کا ماننا تھا کہ سرسید انھیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں اور دین سے بھٹکانا چاہتے ہیں چنانچہ اس وقت کے علما نے سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کردیا ان سب حالات میں

www.urduchannel.in

بھی سرسید نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ان کے قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگائے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے اس کام میں سرسید کو بہت سی تکالیف، پریشانیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے اس مقصد پر اٹل رہے۔ چنانچہ ہر مخالفت اور رکاوٹ نے اس مردِ مجاہد کے عزم کو پختہ، عمل کو تیز اور حوصلے کو مہمیز کر دیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرسید نے اپنی تمام زندگی تعلیم کے فروغ میں صرف کر دی پوری قوم کے غم کو اپنا غم بنا لیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کام کے ساتھ اردو ادب کی ایک ناقابل فراموش خدمت انجام دی اس لیے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کی تعلیمی سرگرمیوں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور تا قیامت سرسید کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔

○

www.urduchannel.in

مسرت حمزہ لون*

علی گڑھ تحریک اور سرسید کی گوناگوں خدمات

اہلِ دانش سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ گزشتہ دوصدیوں میں ہندوستان کے مسلم معاشرے پر کس قدآور رہبر قوم کی حکمرانی رہی؟ اور دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ مسلم نشاۃ الثانیہ کا علم بردار کون ہے؟ تیسرا سوال یہ کیا جائے کہ قوم مسلم فی الہند کا عظیم ترین مصلح اور محسن کبیر کون ہے؟ اور پھر یہ سوال کیا جائے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے زوال کے بعد اُنھیں قعرِ مذلّت سے کس نے نکالا اور کس نے اپنا کل اثاثۂ داؤ پر لگا کر قوم کی ڈگمگاتی، ڈوبتی کشتی کو غرقاب ہونے سے بچا کر کنارے پر لگا دیا اور ایک ایسا منارۂ نور تعمیر کر دیا، جو رہتی دنیا تک قوم کی رہنمائی کرے گا، اور اس کی روشنی ملکی حدود کو سر کر کے سارے جہان کو منور کرتی رہے گی۔ تو ان متعدد سوالات کا جواب ایک ہی ہے: سید بالا جہت، سید ذی شان، سید عظمت مآب سرسید احمد خاں۔

سرسید احمد خاں ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر متقی بڑے نیک تھے اور والدہ بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۲۲ سال کی عمر میں وہ دہلی کی عدالت میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد میں سب ججی پر مامور ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے ولایت کا سفر کیا۔ ۱۸۷۰ء میں وطن واپس آئے۔ ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔

سرسید احمد خاں اپنے عہد کے ایک صاحب بصیرت مصلح تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر بہت ظلم و زیادتی کی۔ چنانچہ مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے بچانے اور ان کے ذہن کو صاف کرنے کے لیے ''سرکشیٔ بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتابیں تصنیف کر کے یہ ثابت کیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ذمے دار صرف مسلمان اور ہندوستانی نہیں بلکہ یہ بغاوت انگریزوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے مقالات اور مضامین کے ذریعے یہ ثابت کر دیا

* شعبۂ اُردو، دیوی اہلیہ وشودھیالیہ، اندور (ایم. پی)

www.urduchannel.in

کہ مسلمان انگریزوں کے بدخواہ نہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمان انگریزوں کے غیض وغضب کا نشانہ بنے تو سرسید کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر میدان میں آنا پڑا اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جو علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ علی گڑھ تحریک اس عام دور بیداری کا ایک حصہ ہے جو انیسویں صدی میں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ اس کا مرکز اور محور سرسید احمد خاں کی شخصیت ہے جنھوں نے علی گڑھ کو اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز بنایا۔ سرسید تحریک کو علی گڑھ تحریک بھی کہتے ہیں کیوں کہ سرسید اس تحریک کے بانی اور سب سے بڑے علم بردار تھے اور علی گڑھ اس تحریک کا مرکز تھا، اس لیے یہ تحریک دونوں ناموں سے جانی جاتی ہے۔

> ''وہ قوم جس کے جاں بر ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے، سرسید کی کوشش سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔ سرسید کی یہ کوشش سرسید تحریک کہلائی اور چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کی گئی۔''[۱]

یہ تحریک دراصل ایک اصلاحی تحریک تھی، جس کا مقصد اُن خرابیوں کو دور کرنا تھا، جو مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی قوم کو فرسودہ روایات اور توہم پرستی کے رجحان سے کنارہ کش ہونے، زندگی کے مادی مسائل سے دلچسپی لینے اور تجدد وتحرک کے میدان کو اپنانے کا درس دیا۔ سرسید کا دور مسلمانوں کی پستی اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس دور کے مسلمانوں میں بہت ساری برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک طرف جہالت، بے علمی اور بے حسی تھی تو دوسری طرف سستی، کاہلی، چاپلوسی، خوشامد، تعصب اور ریاکاری جیسے عیوب بھی موجود تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے کے آداب اور شرفا کی طرز گفتگو سے بھی بے بہرہ تھے۔ اس تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمان انگریزوں کے ظلم و بربریت کے شکار ہوگئے۔ اَن گنت مسلمان گھرانے برباد ہوگئے، بے شمار بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیے گئے، ہزاروں کی جاگیریں ضبط کی گئیں اور ہزاروں مسلمان ملازمتوں سے برطرف کر دیے گئے۔ اس سے ہر طرف مایوسی اور نا اُمیدی پیدا ہوگئی، جس سے قوم کو باہر نکالنے کے لیے سرسید میدان میں آ گئے۔ غدر کے بعد قوم کی بدحالی کی کیفیت سرسید احمد خاں کی زبان سے سُنیے:

> ''غدر کے بعد مجھ کو نہ گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال واسباب تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا''[۲]

www.urduchannel.in

سرسید کا خیال تھا کہ انگریز جیسی طاقت ورقوم سے براہِ راست ٹکر لینا ہوا میں ہاتھ مارنے کے مترادف ہوگا۔ انہیں انہی کے ہتھیاروں سے شکست دی جاسکتی ہے جس سے لیس ہوکر وہ ہندوستان آئے تھے۔اس کے لیے سرسید نے قوم کوخصوصاً مسلمانوں کوخوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے رسالے نکالے، کتابیں شائع کیں اور مضامین لکھے۔اس کے علاوہ تعلیم وترقی کے لیے متعدد ادارے قائم کیے،لیکن قوم کی طرف سے سرسید کواُن کی خیرخواہی کا انعام دشنام والزام کی صورت میں ملا۔انہیں قوم کا بدخواہ، انگریزوں کا حامی اور اسلامی دشمن کہا گیا۔حدتو یہ ہے کہ اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا اوران پر قاتلانہ حملے ہوئے۔رسم ورواج سے نقصان کا اندازہ ہوا تو اس کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے جب مسلمانوں نے ہر مفید مشورے کے خلاف مذہب کو آڑ بنانا شروع کر دیا تو ناچار سرسید کو یہ کہنا ہی پڑا کہ ''جسے تم مذہب سمجھ رہے ہو اصل مذہب وہ نہیں ہے''۔غرض یہ کہ سیاست، معاشرت اور مذہب کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کیا وہ وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کیا لیکن جو کام انھوں نے اندرونی تحریک کے زیر اثر کیا وہ تصنیف وتالیف کا کام تھا وہ خود کیا کرتے تھے۔''تصنیف وتالیف میں جیسا میرا جی لگتا ہے ویسا کسی اور کام میں نہیں لگتا'' یہی وہ مشغلہ تھا جس سے ان کے ذہن کو حقیقی مناسبت تھی چنانچہ بے حد کثیر المشاغل انسان ہونے کے باوجود انھوں نے اتنے مضامین لکھے اور اتنی کتابیں تصنیف کیں جتنا شاید انیسویں صدی کا کوئی مصنف نہ لکھ سکا۔تصنیف وتالیف کا شوق اس درجہ تھا کہ گرمی کی تپتی دوپہر میں، جب دنیا محوِ آرام ہوتی تو سرسید کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتے۔رات کو دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا اور کبھی نیند نہ آتی تو لکھتے لکھتے صبح کر دیتے۔لکھنے میں محویت کا یہ عالم تھا کہ چٹائی پر کتابیں بکھری ہوئی ہیں اور یہ ہمہ تن مصروف ہیں،آنے والوں کا تانتا لگا ہوا ہے اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہے مگر یہ یکسوئی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں جب کسی انتہائی اہم یا نزاعی مسئلہ پر کچھ لکھ رہے ہوتے تو اس وقت بھی گوشۂ تنہائی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔تصنیف وتالیف کا جو سلیقہ سرسید کو آتا تھا کم لوگوں کو آتا ہوگا۔وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا سلیقہ وصلاحیت رکھتے تھے۔پھر بھی انہیں وقت کی تنگی کا گلہ رہتا تھا ان کا بس چلتا تو ہاتھ بڑھا کر چلتے سورج کو روک دیتے اور اس طرح دن کو طول دے کر اپنے کام مکمل کر دیتے یا کسی طرح رات کی طوالت میں اضافہ کر دیتے اور دن کے باقی کاموں کو رات میں پورا کر لیتے۔علی گڑھ تحریک کی راہنمائی کرنے والے سرسید کے قلم سے رسالہ اسباب بغاوت ہند،تبیین الکلام،تہذیب الاخلاق، خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن ومجموعہ لکچرز جیسی تحریریں سامنے آئیں۔

علی گڑھ تحریک اور سرسید کی کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہیں تھیں بلکہ مختلف مسائل حیات پر محیط تھیں۔ علی گڑھ تحریک کے پانچ پہلو تھے تعلیم، سیاست، مذہب، ادب اور معاشرت۔

www.urduchannel.in

۱۔تعلیم: سرسید کی نظر مسلمانوں میں پائی جانے والی کمزوریوں اور برائیوں پر بھی تھی۔ وہ اپنی قوم کو جہالت کی پستی اور تنگ نظری کے اندھیرے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کے اجالے میں لانا چاہتے تھے، ان میں بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ سرسید کے خیال میں قوم کی بدحالی کے بنیادی اسباب میں سب سے بڑا سبب تعلیم سے محرومی تھا۔ وہ جدید مغربی تعلیم کو ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا علاج سمجھتے تھے۔ سرسید کا خیال تھا:

> ''علم سے مراد صرف علوم دینیہ نہیں۔ جس طرح علوم دینیہ کا پڑھنا فی نفسہ عبادت نہیں اسی طرح علوم دنیوی کا پڑھنا عبادت نہیں، لیکن اگر علوم دنیوی اس لیے پڑھے جائیں کہ اس سے مذہبی علوم کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مسلمانوں کو یہ فکر ہے کہ انگریزی پڑھنا تو روز بروز ضروری ہوتا جا رہا ہے مذہب کو کیسے بچائیں؟ ہم اس خیال پر ہنستے اگر اسلام ایسا بودا مذہب ہے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہمیں جدید علوم سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔''

علم سے سرسید احمد خاں کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ بقول سرسید علم مسلمانوں کی میراث ہے۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے فوائد کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ امرت سر کے ٹاؤن ہال میں ''اتحاد باہمی'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''اگر گورنمنٹ نے ہمارے حقوق اب تک ہمیں نہیں دیے ہیں تو ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ نہ خواہ طوعاً کرہاً ہم کو دلا دے گی''[۳]

اپنے تصور تعلیم کو عملی شکل دینے کے لیے سرسید نے مغربی نظام تعلیم کا مطالعہ کرنے کے لیے انگلستان کا سفر کیا اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی، جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل اختیار کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مدرستہ العلوم، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سائنٹفک سوسائٹی جیسے اداروں کا قیام بھی کیا۔

۲۔ سیاست: سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان سیاست کے خارزار سے دور رہیں اور پہلے اپنی تمام تر قوتیں تعلیم حاصل کرنے پر صرف کریں۔ اس سے اُن پر انگریز حامی کا الزام لگا لیکن وہ خود آزادی کے زبردست حامی تھے۔

۳۔ مذہب: سرسید نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اسلام کی کوئی بات سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

www.urduchannel.in

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ
میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔''

حالاں کہ ایسا کرتے ہوئے اُن کو علمائے اسلام کی نکتہ چینیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ایک مخالف مولوی علی بخش خاں سرسید کے لیے کفر کا فتویٰ لانے عرب گئے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تھے اور
ہماری کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا ان کے لائے ہوئے فتوؤں کو
دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ یہ ہمارا کفر بھی کیا کفر
ہے کسی کو پاجی اور کسی کو حاجی اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔''

۴۔ ادب: سرسید نے اردو شعر و ادب کی اصلاح کرنے کا بیڑا اُٹھایا، جو اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے چنانچہ اُن کی کوششوں سے اُردو ادب کی دنیا بدل گئی۔ اُردو نثر کو سادگی و سلاست کی جس ڈگر پر فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں نے ڈالا تھا، اس روایت کو سرسید نے مثبت انداز میں آگے بڑھایا۔ اگرچہ سرسید کی ابتدائی تحریریں قدیم انداز کی ہیں اور ان میں مفرس و معرب عبارتوں کا زور ہے لیکن جب انہوں نے مصلح قوم کی حیثیت سے اصلاح و تلقین کا سلسلہ شروع کیا تو سادگی و بے تکلفی کا انداز اپنایا۔ سرسید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو موضوعات و اسالیب دونوں سطح پر وسعت و ہمہ گیری عطا کی، جو ان سے قبل کے نثر نگاروں کے یہاں مفقود تھی۔ آل احمد سرور نے سرسید کے بارے میں لکھا ہے کہ سرسید مجدد فِن تھے اور ان کی تجدیدِ فن سے نظم و نثر دونوں میں بلندی آئی۔ سرسید کی تحریریں سادگی و سلاست کے زیور سے آراستہ ہیں۔ ان میں نہایت سلیس، رواں اور برجستہ جملے اور فقرے ملتے ہیں۔ سادگی کے ساتھ ساتھ ان کے زورِ بیان کی شادابی و شگفتگی قاری کو مسحور کر لیتی ہے۔ سرسید کی تحریروں کا نمایاں وصف درد و اثر ہے۔ لہجے کے خلوص اور دردمندی نے ان کی عبارتوں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ محاکاتی وصف، ڈرامائی شان، تشبیہات و استعارات کا حسن، روزمرہ اور محاوروں کا برجستہ استعمال، خطیبانہ انداز، حسبِ موقع شوخی اور طنز و ظرافت، سائنٹفک و تجزیاتی اسلوب، استدلال کا زور اور طرز ادا کی روانی سرسید کے اسلوبِ نگارش کی دیگر نمایاں خصوصیات ہیں۔ سرسید کے مضامین میں تصورات، معقولات اور گہری مقصدیت کا غلبہ ہے۔ انہوں نے پہلی بار شعوری طور پر ایسے (Essay) کی صنف کو اختیار کیا اور چند بہترین مضامین پیش کر کے آنے والے مضمون نگاروں کے لیے راہ ہموار کی۔ مولانا شبلی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے

www.urduchannel.in

سے نکل کر ملکی سیاسی اخلاقی وتاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور واثر، سادگی
اور صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک
یہ بات نصیب نہیں۔''

۵۔معاشرت: اصلاحِ معاشرت کو سرسید کے اصلاحی پروگرام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور قوم کو تہذیب و شائستگی کا راستہ دکھایا۔ سرسید تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہوکر جینے کا سلیقہ سکھایا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی علمی و تعلیمی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

سرسید کی تحریروں میں یہ دلکشی اسی وجہ سے ہے کہ ان کی شخصیت بے پناہ دلکشی رکھتی ہے۔ وہ انگریز شاعر چاسر کی طرح تہذیب کی دو سلطنتوں کے بادشاہ ہیں۔ کتابوں کی دنیا اور انسانوں کی دنیا دونوں پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ سرسید کو اعلیٰ درجہ کا تحقیقی اور علمی ذوق حاصل ہوا تھا۔ ان کے مضامین میں عالمانہ تحقیق کا رنگ موجود ہے۔ مثلاً آزادی رائے رسپیکٹ، (Self-Respect) رسم ورواج، خوشامد، وغیرہ پر جو خیالات انھوں نے ظاہر کیے ہیں ان میں بڑی گہرائی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مذہبی، تاریخی، سیاسی امور پر کتابیں بھی لکھی ہیں مثلاً رسالہ ''اسباب بغاوت ہند''، ''خطبات احمدیہ'' ''رسالہ ابطال غلامی''، ''تحقیقی لفظ نصاریٰ'' اور ''قرآن مجید کی تفسیر'' جیسی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۸۳۵ء میں جب اخبارات کو آزادی ملی۔ اس آزادی کے فوراً بعد سرسید کے بڑے بھائی سید محمود خاں نے دہلی سے ''سید الاخبار'' نکالا، سید الاخبار کو سرسید کی اخبار نویسی کا پہلا مکتب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ سید محمد خاں کا انتقال عین عالم شباب میں ہوگیا اور سرسید نے سید الاخبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب سرسید احمد خاں انگلستان گئے اس سفر کا مقصد وہاں کے حالات کا جائزہ لینا تھا اور ہندوستانیوں کے لیے اصلاحی تدابیر کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ سرسید نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کی اصلاح اور تہذیب وتربیت کے واسطے دو اخبار اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر چھوٹے چھوٹے مضامین آداب ومعاشرت اور قوم کی فلاح و بہبود کے واسطے شائع ہوتے تھے۔ سرسید نے بھی اسی کام کو قوم کی ترقی اور ان کی اصلاح کا وسیلہ سمجھ کر طے کیا کہ وہ بھی ہندوستان پہنچ کر ایک ایسے اخبار کا اجرا کریں گے جو قوم کی اصلاح و نمائندگی کرے گا۔ انگلستان سے واپس لوٹنے کے ایک ہی مہینے کے اندر ''تہذیب الاخلاق'' نام کا اخبار نکالنا شروع کیا اور اسی کے ذریعہ اپنی اصلاحی تحریکات کا آغاز کیا۔ اس رسالہ کے متعلق انہوں نے محسن الملک کو ۱۸۷۰ء میں یہ لکھا تھا:

''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا

www.urduchannel.in

ہےاورتہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں محمڈن سوشل
رفارمر رکھ لیا ہے۔اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے۔
کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں پر خرید لیا ہے''[۴]

یہ ایک اصلاحی رسالہ تھا جس نے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔عیدالفطر مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کیا۔اس کا پہلا شمارہ اور دوسرا بھی سرسید کی لیاقت کا عمدہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ان دونوں شماروں کے مضامین خود سرسید کے لکھے ہوئے تھے۔''تہذیب الاخلاق'' تین بار بند ہوا اور اس طرح سے کل ملا کر گیارہ بارہ سال جاری رہا اس میں زیادہ تر مضامین خود سرسید کے تھے۔

اس رسالے کے اجرا سے پہلے سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کا میگزین جاری کیا تھا جس کا نام بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا۔اس گزٹ نے مقالہ نگاری اور صحافت کے فن کو بڑی ترقی دی مگر جو کام ''تہذیب الاخلاق'' نے انجام دیا اس کی نظیر اس دور کے ہندوستان میں نہیں ملتی۔سرسید اس سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو انگلستان میں اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر نے انجام دیا۔اس کے مقالہ نگاروں میں سرسید کے تقریباً سب رفقا شامل تھے۔انھوں نے خود بہت کچھ لکھا اور لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر دی۔شبلی نعمانی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مہدی علی خاں، نواب محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولانا ذکاء اللہ وغیرہ ہیں، جو ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔سرسید کے رفقائے کار مسلسل کام کرتے رہے۔چنانچہ حالی نے ۱۸۹۳ء میں ''مقدمۂ شعر و شاعری'' لکھ کر باقاعدہ تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالی۔شبلی اور حالی نے سوانح عمریاں لکھ کر اُردو کو نئی روش سے آشنا کیا۔شبلی نے تاریخ نویسی میں تاریخی کام کیا۔نذیر احمد نے ناول نویسی کا آغاز کیا۔محمد حسین آزاد نے جدید نظم کو متعارف کرایا۔اردو نثر کو اس سے خاص طور پر فائدہ پہنچا، اس نے قلم برداشتہ اور سلیس و رواں اردو کو ملک میں رواج دیا اور اردو نثر ان کے احسان سے گراں بار ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل درست لکھا ہے:

''سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اردو کو جو علمی اعتبار سے اس
وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی، تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر
ریزوں سے مالا مال کر دیا۔''[۵]

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو بہت متاثر کیا۔زبان و بیان کی صناعی اور آرائش کے مقابلے میں خیال اور مواد کی اہمیت پر زور دیا۔مغربی ادب سے استفادہ کرنے اور ان کی خوبیوں کو اپنانے اور ہمارے ادب کی خامیوں کو دور کرنے کی تلقین کی۔ہماری نثر اور شاعری پر سرسید احمد کا احسان ہے کہ ان کی توجہ اور کوشش سے دونوں نے نئی

www.urduchannel.in

زندگی پائی اورنئ منزلوں کی طرف قدم اٹھایا۔ وہ شاعر نہیں تھے اس لیے خود شاعری کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ ان کی یہ خواہش رہی کہ کوئی شاعر شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لے۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھ کر یہ خدمت انجام دی۔ آگے چل کر اقبال نے اپنی شاعری سے یہ کام کیا۔ نثر نگار سرسید خود تھے اس لیے نثر کی دنیا میں انھوں نے خود اپنی تحریروں سے انقلاب برپا کر دیا۔ اردو نثر کو تصنع، قصوں، عبارت آرائی، لفاظی اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی۔

> ''تہذیب الاخلاق'' کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت، معاشرت کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی ''تہذیب الاخلاق'' اس کا نام رکھا۔''[۶]

''تہذیب الاخلاق'' کے پہلے شمارے کے سرورق پر جو اطلاع درج ہے اور جو کہ بعد کے شماروں میں بھی شائع ہوتی رہی اس کے مطابق اس پرچے میں بجز مضامین اخلاق وحسن و معاشرت کے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اور کچھ مندرج ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اجرا کا مقصد خود سرسید کے الفاظ میں یہ تھا:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلائیں''

اس اجمال کی تفصیل بھی سرسید نے اس مضمون میں بیان کی تھی جو یہ ہے:

> ''سولائزیشن ایک انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاقی اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور اس کی نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا ہے۔''

اس اخبار کے خلاف بہت سے اخبار نکالے گئے لیکن ''تہذیب الاخلاق'' کے مخالفین کی طرف سے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جاتا رہا۔ سرسید نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے اور مخالف پھر اس جواب کا جواب دیتے۔ اسی طرح قلم برداشتہ نثر لکھنے کا رواج ہوا۔ اردو میں توانائی پیدا ہوتی چلی گئی، استدلالی نثر کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ سرسید نے اردو نثر کے اہلِ قلم میں انشا پردازی کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اپنے طرزِ تحریر کا خود ہی تعارف کراتے ہیں:

www.urduchannel.in

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں
اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ کوشش کی۔''

مختصر یہ کہ بحیثیت صحافی بھی سرسید احمد خاں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اردو صحافت کو بہت کچھ دیا اور صحافت کو اس منزل پر لاکر کھڑا کر دیا کہ اب ہم دوسری زبانوں کی صحافت سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اردو صحافت کو بے جا مبالغہ آرائی کے میدان سے نکال کر حق پسندی اور حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔ صحافت کے لیے زبان وہ استعمال کی جو تکلف اور تصنع سے پاک ہو۔

سرسید کے انگلستان جانے کا ایک مقصد کالج قائم کرنا بھی تھا چنانچہ واپس آنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ میں ایک کالج ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کے نام سے قائم کیا اس وقت سرسید بنارس میں تعینات تھے۔ ان کے مخلص دوستوں نے اس کالج کے قیام میں مدد دی اور یہ ترقی کر کے اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ انھوں نے ایک اور اہم تعلیمی ادارہ قائم کیا جس کا نام آخر کار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قرار پایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک میں جا بجا تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔

سرسید احمد خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی تفریق نہیں کی تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے اس طرح کہا تھا :

''میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دونوں آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔
لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں
جس میں، میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔''[۷]

غرض یہ کہ علی گڑھ تحریک نے اپنی اہم خدمات کے سبب مسلم قوم میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کیا اور ہمت و استقلال کو بیدار کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ ہر چیلنج کا بحسن وخوبی مقابلہ کر سکے۔ علی گڑھ تحریک کی خدمات تاریخی، سماجی اور ادبی ارتقا کی راہ میں سنگ میل کی اہمیت رکھتی۔ سرسید اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے تادم آخر کوشاں رہے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اردو نثر میں نئی جان ڈالنے والا یہ محسن (سرسید احمد خاں) ۱۸۹۸ء میں ابدی نیند سو گیا۔

www.urduchannel.in

حواشی:

(۱) بحوالہ:''ادیب''زبان وادب کی تاریخ نمبر،ص:۲۲۲

(۲) حیات جاوید،الطاف حسین حالی،۱۹۷۹ء،ص:۸۰

(۳) سرسیداورعلی گڑھ تحریک۔نظامی خلیق احمد،ص:۱۰۹

(۴) سرسیداحمدخاں،مسافران لندن،ص:۲۶۳

(۵) سرسیداوران کے نامور رفقا،ص:۵۸

(۶) رسالہ تہذیب اخلاق،جلد۔۱۱،شمارہ۔۱،۱۸۷۰ء،ص:۸

(۷) مقالات سرسید۱۲،تقریری مقالات لاہورمجلس ترقی ادب،۱۹۶۳ء،ص:۱۸۵-۱۸۴

www.urduchannel.in

محمد ناظم*

سرسید کی ضرورت عہد حاضر میں

شام در شام جلیں گے تیری یادوں کے چراغ
نسل در نسل تیرا درد نمایاں ہوگا

سرسید احمد خاں تنہا ایسی ذات ہے جس نے علمی، سیاسی، سماجی، تہذیبی ہر سطح پر اپنے نقوش ثبت کیے اور وطن عزیز کی خدمت کی، ملک اور اہل ملک کو اپنا پیغام پہنچایا۔ سرسید کی عظمت کی کہانی ہی یہی ہے کہ ہر دور میں ان کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی اور یہ عہد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس عہد میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ سرسید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ ماحول میں مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے ہر دھڑکتا ہوا دل ان کی تباہ حالی کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے ہر آنکھ آنسو بہانے لگتی ہے گویا کہ مسلم قوم پستی میں غرق ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے ترقی کے ہر شعبہ میں ان کی تنزلی کی گونج سارے عالم میں سنائی دے رہی ہے خصوصاً جدید تعلیمی میدان میں دور دور تک کوئی عظیم نام دیکھنے کو نہیں ملتا اور اب وہ اس سوچ میں غرق ہیں کہ ان کی زندگی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل پر کون لگائے گا لیکن اس خودغرضی کے عہد میں کوئی ان کا مداوا کرنے والا نہیں ہے شاید انہیں اب پھر کسی مسیحا کی ضرورت ہے۔

۱۸۵۷ء کا سانحہ وقوع پزیر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہوگئی تھی تمام آبادیاں ویران ہوگئی تھیں خود سرسید کا خاندان بھی اس تباہی کی زد میں آ گیا تھا ہندوستان کی عوام خاص کر مسلمان زبوں حالی کے شکار تھے۔ اس آنکھوں دیکھے سانحہ نے سرسید کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر اس قوم کی تباہی کی اصل وجہ کیا ہے؟

کئی راتیں جاگتے ہوئے گزاریں سوچتے سوچتے دماغ شل ہوگیا کیوں کہ ایسا بھی نہ تھا کہ مسلم طبقہ پوری طرح تعلیم سے بے بہرہ ہو۔ مسلمانوں میں اس وقت ایک سے ایک قابل اشخاص موجود تھے جنہیں عربی وفارسی ودیگر زبانوں

* ایم.اے. اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

پر بھی عبور حاصل تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ مٹھی بھر باہری لوگ ہم پر قابض تھے۔آخر کار سرسید نے ایک حاذق طبیب کی حیثیت سے قوم کا جائزہ لیا اور پھر خود فیصلہ کیا کہ پستی کے تمام اسباب جدید تعلیم سے بے راہ روی میں مضمر ہیں اس خیال سے آپ نے غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور قوم میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک اخبار ''انسٹی ٹیوٹ آف گزٹ'' کے نام سے نکالا مزید تعلیمی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۸۷۵ء میں ''مدرسۃ العلوم'' کی بنیاد ڈالی جس نے مستقبل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی جو نہ صرف دینی علوم وفنون بلکہ مغربی اور سائنسی علوم وفنون میں بھی عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کر چکی ہے جس میں ملت کے ایسے بہت سے پودوں کی شب و روز آبیاری کی جاتی ہے جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ سارے عالم کے لیے نشان راہ ثابت ہوتے ہیں اور اپنے علوم وفنون کی شعاؤں سے کائنات کو منور کرتے ہیں۔

سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے اس میدان میں بھی ذلت مسلمانوں کی دامن گیر ہے دن بدن مخالف پارٹیاں اپنے ظلم وتشدد کا غصہ قوم مسلم پر اتارتی رہتی ہیں جمہوری نظام کے ہوتے ہوئے بھی ان کے کھانے پینے پر پابندی لگا دی جاتی ہے اور یہ قوم مسکراتے ہوئے ان کے ظلم وستم کو سہتی رہتی ہے کیوں کہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں ہے سیاسی میدان میں تو ان کی قدر ووقعت کا نام ونشان یہاں تک مٹ چکا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود لوک سبھا میں یوپی کی جانب سے کوئی مسلم چہرہ نظر نہیں آتا جو ان کے مسائل کو وزیر اعظم کے پیش نظر رکھ سکے لیکن عہد سرسید میں ایسا نو آبادیاتی نظام قائم ہو چکا تھا جس کے ظلم و جبر سے شاخوں پر پتوں کی جگہ لاشیں لٹک رہی تھیں مزدور وکسان بھوک سے تڑپ تڑپ کر زمین کے سینے پر دم توڑ رہے تھے پھر بھی سرسید نے اپنی حکمت عملی سے مسلمانوں کو اس ظلم وتشدد سے آزاد کرانے کی بھر پور کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے انگریزوں سے مراسم بنائے رکھے انگریز جو مسلمانوں کو کھلا دشمن سمجھتے تھے ان کے درمیان رنجش کو مٹانے کے لیے ہی سرسید نے توریت اور انجیل کی تفسیر ،تبین الکلام لکھی اور یہ وضاحت کی کہ اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے مسلمان جتنے انگریزوں کے دوست ہو سکتے ہیں دوسرے نہیں ہو سکتے۔حالاں کہ سرسید کی اس کوشش کو ان کے عہد میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن سرسید پر اس دور کے فتووں کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مخالفین کی پرواہ کیے بغیر اپنے کاموں میں سرگرداں رہے اور دامے درمے قدمے سخنے قوم کی خدمت کرتے رہے۔

ظالم ! جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ، ولے
پچھتاوے پھر تو آپ ہی، ایسا نہ کر کہیں

سرسید نے مخالفت کی پرواہ کیے بغیر اس حکومت سے مسلمانوں کو علمی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر اتنا فائدہ پہنچایا

www.urduchannel.in

جس کی اب یا اس دور میں توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔اس کی زندہ وتابندہ مثال خودعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے ابتدا میں ایم اے او کالج کی شکل میں اس کا سنگ بنیاد کسی ہندوستانی نے نہیں بلکہ ایک انگریز افسر لارڈلٹن نے رکھا تھا جس نے خوش ہوکر اس کا بھرپور تعاون بھی کیا تھا۔

سماجی اعتبار سے بھی مسلمانوں میں روز بروز نت نئے فتنے جنم لیتے رہتے ہیں قوم مسلم کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ واریت کا ہے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں میں مسالک کا جھگڑا طول پکڑتا ہوا نظر آرہا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں نئے نئے طبقے بنتے جارہے ہیں ایک خدا کے ماننے والوں نے اپنی الگ الگ مساجد ودرسگاہیں تعمیر کرلی ہیں سرسید احمد خاں کی ذات ایسی تھی جو پوری طرح مسالک کے جھگڑوں سے پاک تھی دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایم اے او کالج میں دینی تعلیم کی کمیٹی کی رکنیت کے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ صرف سنیوں ہی کی تعلیم ہوگی جس پر سرسید نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوے واضح کردیا کہ ان کے تعلیمی ادارے کو کسی بھی طرح سے طبقات اور مسالک کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہونے دیا جائے گا۔سرسید کی ذات کو اس شعر سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ! ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں

حاصل کلام یہ ہے کہ عہد حاضر میں قوم مسلم علمی، سیاسی، سماجی، تہذیبی گویا زندگی کے ہر شعبہ میں پستی کا شکار ہے اس کی زبوں حالی کے افسانے سارے عالم پر روشن ہیں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی آج غریبی اور ایسے ماحول میں رہنے پر مجبور ہے جہاں گندگی کا بسیرا ہے اور بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی لوگ ترستے ہیں ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والے بچوں کو مدارس یا کالجوں کے بجائے ہوٹلوں کی راہ دیکھنی پڑتی ہے اور اہل سماج انہیں ان کے اصل نام کے بجائے فرضی نام سے جانتے ہیں آج اس قوم کو ہر موڑ پر سرسید کی یاد ستارہی ہے اگر وہ ذات ہوتی تو شاید پھر سے اس قوم کو تنزلی سے ترقی کی جانب گامزن کرتی۔

اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

○

www.urduchannel.in

ادیبہ صدیقی*

ایک لازوال شخصیت: سرسید احمد خاں

آج ہم جس گہوارۂ علم یعنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں تو کیا ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ہمیں اس طرح کی تعلیم دینے میں کس کا کردار رہا ہے..... تو آیئے! ہم یہاں اس چمن کے مالی اور بانی درسگاہ سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ء-۱۸۱۷ء) کی ان قربانیوں کا جائزہ لیں جو انھوں نے اس چمن کی آبیاری کے لیے دیں۔

سرسید احمد خاں کے کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ سرسید کا عہد یعنی ۱۹ویں صدی ہمارے ملک ہندوستان کی تاریخ میں انتشار اور بدامنی کا زمانہ رہا ہے اور یہ انتشار و بدامنی پھیلانے والی وہ بیرونی قوم ہے جس نے ایک طرف ہمارے ملک میں بغرض تجارت قدم رکھ کر دھیرے دھیرے ملک پر قابض ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئی۔ وہیں دوسری طرف اس نے ہمارے ملک میں جدید تعلیم کی راہیں کھولیں۔ اس راہ پر ہندوستانی قوم کو لانے والا کوئی اور نہیں بلکہ دہلی میں پیدا ہونے والی وہ لازوال شخصیت ہے جس نے اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے پوری زندگی ہی وقف کر دی۔

تاریخ گواہ ہے کہ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے ہی ہمارا ملک زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا تھا اور پھر ۱۸۵۷ء کے غدر نے تو پورے ملک کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس صدی میں ایسی اتھل پتھل ہوئی کہ اس کا دوبارہ اپنی اصلی حالت میں واپس آنا نہایت مشکل تھا کیوں کہ سیاسی بدحالی کی وجہ سے ملک علمی و تہذیبی، معاشی و معاشرتی غرض ہر اعتبار سے مٹ چکا تھا۔ سیاست ہاتھ سے جانے پر عوام میں بدامنی پھیلی اور اس پر انتشار ماحول میں تعلیم کا حصول بھی ختم ہوتا گیا اور اس سے لوگوں میں طرح طرح کی برائیاں پھیلیں۔ سرسید جو انتہائی حساس اور دردمند دل کے مالک تھے وہ ان حالات سے نہایت متاثر ہوئے اور چوں کہ باشعور بھی تھے لہٰذا انھوں نے اپنی قوم کی زوال پذیری کے اسباب پر غور کیا کہ آخر ایسی کون سی وجہ ہے جس سے ان کی قوم اس قدر زوال پذیر ہو چکی ہے لہٰذا تب انہیں معلوم ہوا کہ

* ایم.اے. اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

ان کی قوم کے اندر وہ تعلیم نہیں جو مخالف قوم کے اندر ہے اور اسی جدید تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز ہندوستانی قوم کو اپنے قابو میں کیے ہوئے ہیں اور یہی چیز ہندوستانی قوم کو بیدار نہیں ہونے دیتی۔ تب انھوں نے جدید تعلیم کی وکالت کی لیکن کوئی بھی جدید تعلیم اور انگریزی تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اس توہم میں مبتلا تھے کہ اس سے انہیں عیسائی بنایا جارہا ہے لیکن سرسید نے ہار نہیں مانی بلکہ وہ کیمبرج اور آکسفورڈ جیسے مشہور علمی اداروں کا معائنہ کرنے لندن گئے اور پھر اسی طرز پر ہندوستان میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (۱۸۷۷ء) قائم کیا تاکہ ہندوستانی قوم یہاں جدید تعلیم حاصل کرے اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرکے ان کا منھ توڑ جواب دے سکے۔

پھر ۱۸۶۲ء میں بمقام غازی پور سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تاکہ اردو مزاج سے ہندوستانی قوم دوسرے مختلف علوم سے واقف ہوسکے۔ اتنا ہی نہیں ہندوستانی قوم میں مزید بیداری پیدا کرنے کے لیے لگاتار رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں مضامین لکھ کر اس قوم کو جدید تعلیم کے پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تو یہ تھا سرسید احمد خاں کا علمی کارنامہ۔

سرسید پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف جدید تعلیم کو فروغ دیا اور دینی تعلیم پر کوئی زور نہیں دیا۔ ایسا نہیں ہے سرسید نے دونوں علوم کی وکالت کی لیکن موقع ومحل کے لحاظ سے جدید تعلیم کے حصول پر زیادہ زور دیتے تھے۔

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرسید ۱۹ویں صدی کی وہ عظیم ہستی ہیں جس نے اپنے افکار ونظریات اور اپنے علمی کارناموں سے پوری ۱۹ویں صدی کو بدل کر رکھ دیا اور پھر ایک ایسی فضا اور ماحول تیار ہوا لوگ جدید تعلیم حاصل کرنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ ۱۹۲۰ء میں ایم. اے. او. کو جامعہ کا درجہ حاصل ہوا وہیں ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی قوم انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئی۔

آج ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اپنے علمی ادارے اور اپنے ملک کے لیے مزید ترقی کریں تاکہ سرسید کی روح کو سکون ملے۔

○

www.urduchannel.in

راشد انور راشد
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

سرسید

تھی منجدھار میں قوم کی کشتی تو نے پار لگائی
دور ہوئی تاریکی، دل میں ایک کرن لہرائی
میدان، پربت، جنگل، صحرا سے آواز یہ آئی
فکر و عمل کے نور سے اب تک ہم تابندہ ہیں
سرسید سب خواب ترے، آنکھوں میں زندہ ہیں

تو نے اک تحریک چلائی اور بدل دی قسمت
علم، سیاست اور مذہب کو ملی نئی اک قوت
حصے میں تہذیب بھی آئی اور ادب کی دولت
فکر و عمل کے نور سے اب تک ہم تابندہ ہیں
سرسید سب خواب ترے، آنکھوں میں زندہ ہیں

وقت کے الجھے تیور کو بس تو نے ہی سلجھایا
خواب غفلت میں تھا زمانہ آخر ہوش میں آیا
جو کچھ نا ممکن تھا وہ بھی تو نے کر دکھلایا
فکر و عمل کے نور سے اب تک ہم تابندہ ہیں
سرسید سب خواب ترے، آنکھوں میں زندہ ہیں

اپنی دھن کا تو پکا تھا ہر ذرے نے خبر دی
تو نے غیروں کے دل میں انمول محبت بھر دی
خود کو مٹا کر ایک نئی تاریخ رقم ہی کر دی
فکر و عمل کے نور سے اب تک ہم تابندہ ہیں
سرسید سب خواب ترے، آنکھوں میں زندہ ہیں

تیرے خوابوں کی تکمیل ہے اپنی ذمے داری
منزل سے ہم گلے ملیں گے چاہے ہو دشواری
تو نے کر شمے خوب دکھائے، اب ہے ہماری باری
فکر و عمل کے نور سے اب تک ہم تابندہ ہیں
سرسید سب خواب ترے، آنکھوں میں زندہ ہیں

www.urduchannel.in

سرور ساجد
ایسوسی ایٹ پروفیسر، ویمنس کالج
اے.ایم. یو علی گڑھ

غزل

دل کا بس ایک تقاضا ہے کہ ایسا کر لوں
جاگتی آنکھوں سے میں نیند کا سودا کر لوں

جی میں آتا ہے اب آپ کو پتھر کہہ کر
چند لمحوں کے لیے بوجھ کو ہلکا کر لوں

تجھ سے ملنا تجھے پانے کی تمنا کرنا
کیا کروں دونوں گناہوں سے میں توبہ کر لوں

کون سی جست اسے آنکھ سے اوجھل کر دے
اور کچھ دور تری یاد کا پیچھا کر لوں

ہر قدم آپ زمیں پھونک کے رکھتے رہیے
میں نے سوچا ہے جدا آپ سے رستہ کر لوں

ریت ہوں آندھی سے کہہ دو کہ ملے، میں ساجدؔ
آشنا لوگوں میں ایک اور اضافہ کر لوں

❁

اعجاز عبید
مدیر ماہنامہ 'سمت'، حیدرآباد

غزل

ہمارے سر پہ تو قیمت الگ لگی ہوئی ہے
تو مدحِ شاہ کی تنخواہ بھی بندھی ہوئی ہے

چلوں تو پاؤں میں زنجیر سی بندھی ہوئی ہے
کھڑا ہوں، جان کی قیمت ادھر لگی ہوئی ہے

وہ کچھ کہے نہ کہے، ہم سمجھ ہی جائیں گے
زباں سکوت کی ہم نے بہت سنی ہوئی ہے

ہے منتظر یہ کسی کوچ کے نقارے کی
یہ فوج سرحدِ مژگاں پہ کیوں رکی ہوئی ہے

تو کیا یہ لوحِ فلک پر کبھی لکھا ہی نہ تھا؟
یہ کم نصیبی ہماری یہیں بنی ہوئی ہے ؟

یہ اور بات کہ قرطاس پر اب اتری ہے
غزل تو سینکڑوں برسوں کی یہ کہی ہوئی ہے

❁

www.urduchannel.in

نیاز جیراج پوری
اعظم گڑھ

مَیں اُردو ہُوں

کِسی گُل رنگ چہرے پر نُمایاں تازگی مَیں ہُوں
کِسی کی چشمِ حسرت میں تمنّا دِید کی مَیں ہُوں
عُروسِ نَو کے ہونٹوں پر مچلتی خامشی مَیں ہُوں
کہیں پر خیمۂ گُل میں تھرکتی چاندنی مَیں ہُوں
مَیں اُردو ہُوں وہی اُردو کے جِس کے بارے میں سچ ہی
کہا تھا داغؔ نے سارے جہاں میں دُھوم ہے میری
کہیں پر میری خُوشبو ہے کہیں مہکار ہے مُجھ سے
کہیں رعنائی ہے مُجھ سے کہیں سِنگار ہے مُجھ سے
اخوت دوستی یکجہتی کا اِظہار ہے مُجھ سے
وطن سے پیار ہے مُجھ کو، وطن کو پیار ہے مُجھ سے
تعلُّق میرا ہر مذہب سے ہر فِرقے سے قائم ہے
وطن سے میرا رِشتہ بھی اِسی رِشتے سے قائم ہے
مِرے شیدائیوں نے بارہا یہ بات دُہرا دی
مَیں اِس دھرتی کی بیٹی ہُوں اِسی دھرتی کی شہزادی
وطن کی سمت اُٹّھا جب بھی کوئی ہاتھ جلاّ دی
بنی مَیں قُوّتِ بازو بوقتِ جنگ آزادی
چلی آندھی جو خاک و خُون کی تو پُھول برسایا
وطن میں پرچمِ امن و اماں مَیں نے ہی لہرایا
تعصُّب کے پرستارو ! حقیقت کو نہ جُھٹلاؤ
سُنو اے تنگ ذہنو ! میری عظمت کو نہ جُھٹلاؤ
مِرے اخلاص کو میری محبّت کو نہ جُھٹلاؤ
وطن کی سَر زمیں سے میری نِسبت کو نہ جُھٹلاؤ
زباں کوئی بھی ہو ہوتی ہے پیاری اے مِرے بھائی
اگر دیکھو تو ہے ہِندی سے بھی میری شناسائی
اگر تُم چاہتے ہو سچ کو جُھٹلانا تو جُھٹلاؤ
جھٹک کر بُغض کی عینک ذرا نزدیک تو آؤ
حقیقت کیا ہے میری صفحۂ تاریخ دہراؤ
بہت مُمکِن ہے نفرت پھر کبھی مُجھ سے نہ کر پاؤ
مگر تُم ہو کہ سب کُچھ جان کر انجان بَیٹھے ہو
بھرے بازار میں تُم بیچ کر ایمان بَیٹھے ہو
کِسی شاداب گُلشن کو جلانا چاہتے ہو تُم
کِسی شمعِ فروزاں کو بُجھانا چاہتے ہو تُم
تمدُّن مسخ کرنے کا بہانا چاہتے ہو تُم
مَیں اِک تہذیب ہُوں مُجھ کو مِٹانا چاہتے ہو تُم
مَیں اُردو ہُوں تُمہاری سازشوں سے ڈر نہیں سکتی
تُمہیں معلوم ہونا چاہیئے مَیں مَر نہیں سکتی

www.urduchannel.in

اسلم ایڈووکیٹ
(صدر قلم کارویلفیئر سوسائٹی) مغل پورہ، مئوناتھ بھنجن

میں

راز ہوں اک سربسر امتزاج خیر و شر میں اجالوں کا نقیب تیرگی میرا نصیب
میں کہ انوار سحر کاوش فکر و نظر میں کہ نقش جاوداں میں بساط کارواں
میں کہ تنویر گہر نازش علم و ہنر میں کہ نخچیر سراب مثل حرف نقش آب
میں کہ پابند وفا محرم ناز و ادا میں شفق کا انعکاس رنگ وبو سے روشناس
میں تب وتاب نہاں صورت خواب گراں میں سلگتا سا حواس میں لرزتا التماس
میں کہ گل بانگ سخن نخل تہذیب کہن میں کہ اشکوں کا خراج میں سخن ور کا مزاج
میں کہ پندار چمن غیرت غنچہ دہن میں کہ رمز فکر وفن میں کہ شمع انجمن
میں کہ تصویر الم میں کہ روداد ستم میں جراحت کا غبار میں خزاں دیدہ بہار
میں جنوں کا پیچ وخم شوکت لوح و قلم میں کہ افسانہ کوئی غم کا پیمانہ کوئی
میں کہ صید رنگ و بو میں اسیر کاخ و کو سر بسر تعزیر میں یاس کی جاگیر میں
میں قتیل جستجو میں شکست آرزو درد کی تفسیر میں تیشۂ تدبیر میں
میں کہ مضراب یقیں میں کہ آہنگ حزیں شاعر دلگیر میں نالۂ شب گیر میں
میں کہ اسرار جنوں نغمۂ ساز فسوں آہ بے تاثیر میں خواب بے تعبیر میں
میں کہ ایک رقص شرر میں کہ بے سایہ شجر شوخیٔ تحریر میں شومیٔ تقدیر میں
میں کہ محروم فراغ تھرتھراتا سا چراغ زندگی شبنم کا روپ زندگی خوابوں کی دھوپ
میں کہ ایک روشن لکیر میں ستاروں کا سفیر

www.urduchannel.in

شارق عدیل

مارہرہ،ایٹہ،یوپی

سوچ کا عذاب

خالق کائنات نے ہم کو
باندھ کر رسیوں سے سانسوں کی
خواہشوں کے حسیں جزیرے میں
چھوڑ رکھا ہے کس لیے تنہا
بس اسی سوچ کے اندھیرے کو
جب بھی پُرنور کرنا چاہتے ہیں
سانس کی رسیوں کی اینٹھن سے
ذہن مفلوج ہونے لگتا ہے
اور جزیرے کا حسن بے پایاں
چھین لیتا ہے تاب نظارہ

❁

تضمین بر شعر 'شہریار'

میرے افکار و خیالات کو یارب تونے
وسعت اس درجہ عطا کس لیے فرمادی ہے
گھر کی تعمیر کا جب جب بھی خیال آتا ہے
بس یہی سوچ کے دل میرا بجھا جاتا ہے

''گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہوسکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے''

❁

خواب بے کراں

رات میری آنکھوں میں
ظلمتوں کے ہاتھوں نے
تھپکیوں کی تالوں سے
نیند کو بلاکر کیوں
خواب کو سجایا تھا
کیوں شگفتہ ماضی کے
نرم گیت کا مکھڑا
سرخ چہرہ آندھی کے
سخت کوش ہونٹوں نے
زار زار بادل کے
ساز پر سنایا تھا
اور پھر نہ جانے کیوں
یک بیک خلاؤں نے
پیرہن سیاہی کا
نقرئی ستاروں کی
چھاؤں سے سجایا تھا
خواب بیکراں پر جب
صبح راز کھولے گی
نیند ٹوٹ جائے گی
آنکھ روٹھ جائے گی

❁

معید رشیدی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غزل

اب اعتبار نہیں، میری جاں کسی کا نہیں
چراغ سب کے لیے ہے دھواں کسی کا نہیں

لکیریں کھینچتے رہتے ہیں ہم زمینوں پر
یہ جانتے ہوئے کہ آسماں کسی کا نہیں

اب اختیار زمانے پہ ہے نہ اس دل پر
کمال یہ ہے کہ کوئی یہاں کسی کا نہیں

وہ جس کے نام سے ہے بس اسی کے نام سے ہے
یہاں کسی کا نہیں ہے وہاں کسی کا نہیں

بس ایک سلسلۂ نور ہے ، خموشی ہے
حدود وقت سے آگے نشاں کسی کا نہیں

❁

زبیر شاداب
ایسوسی ایٹ پروفیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۱)

ٹو-لیٹ (To let)

مری آنکھوں کی بس اتنی حقیقت ہے
کہ ان میں خواب آتے ہیں
مسافر کی طرح دو چار دن رکتے ہیں
اور پھر دوسری جانب
کسی اچھے کرایہ دار کی مانند
خود ہی لوٹ جاتے ہیں
میں پھر تختی لگاتا ہوں
کرائے کے لیے پھر دو مکاں
خالی پڑے ہیں!!

❁

www.urduchannel.in

(۲)

جستجو

آنکھ اور خواب کے درمیاں
کوئی روپ دھندلا سا
روز دیکھتا ہوں میں
آنکھ اور آب کے درمیاں
کوئی دریا صحرا سا
روز پیاسا لگتا ہے
آنکھ اور رات کے درمیاں
کوئی سایہ چہرا سا
کچھ شناسا لگتا ہے
آنکھ اور ذات کے درمیاں
سلسلے عجب سے ہیں
مرتبط بھی رہتے ہیں
منقطع بھی ہوتے ہیں
آنکھ اور ذات کے درمیاں
فاصلے عجب سے ہیں
دور دور چلتے ہیں
طے بھی ہوتے رہتے ہیں
آنکھ اور ذات کے درمیاں
واسطے عجب سے ہیں
توڑتے بھی رہتے ہیں
ٹوٹتے بھی رہتے ہیں
آنکھ اور ذات کے درمیاں
مرحلے عجب سے ہیں
طے نہیں بھی ہوتے ہیں
طے بھی ہوتے رہتے ہیں

.....

جستجو کچھ ایسی ہے
کوئی روپ دھندلا سا
آرزو کچھ ایسی ہے
کوئی دریا صحرا سا
چاہتا کچھ ایسا ہوں
کوئی سایہ چہرا سا
سوچتا کچھ ایسا ہوں
اک جگہ ملیں اک دن
اور پھر کچھ ایسا ہو
یا تو سب قیامت تک
ہجر کے مزے لے لیں
یا تو پھر قیامت ہو
سب وصال کر جائیں

.....

ڈاکٹر انور وارثی
شعبۂ اردو، بریلی کالج، بریلی

عام کر دو پیامِ سرسید

جس نے دیکھا ہے بامِ سرسیّد
اُس سے پوچھو مقامِ سرسیّد
آؤ علم و ادب کی بات کریں
ہم سجائے ہیں شامِ سرسیّد
وہ زمانے میں کامیاب ہوا
جس پہ چھلکا ہے جامِ سرسیّد
روشنی علم کی ہو گھر گھر میں
عام کر دو پیامِ سرسیّد
جس کی ہیں ضو فشانیاں ہر سو
ایسا چمکا ہے نامِ سرسیّد
دنگ ہے آج عقل دنیا کی
دیکھ کر یہ نظامِ سرسیّد
معتقد ہوگئے قلم والے
دور بیں تھا مشامِ سرسیّد
دیکھ کر سرخرو ہیں علم و فن
یہ گلِ لالہ فامِ سرسیّد
ایک میں کیا ہر اک زباں پر ہے
لَمْ یَزَلْ ہے مقامِ سرسیّد
اہلِ اردو پسند کرتے ہیں
تیرا انورؔ کلامِ سرسیّد

www.urduchannel.in

ظہیرحسن ظہیرؔ
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غزل

ہوش و خرد والوں کوخدشہ رہتا ہے پسپائی کا
اہلِ جنوں کوخوف نہیں ہے خفت کا رسوائی کا
کانپ گئی وہ سر سے پا تک آنکھیں بھی نمناک ہوئیں
اس سے کسی نے ذکر کیا جب بے موسم شہنائی کا
عقل تھی میری حیراں حیراں اور قلم تھا سکتے میں
کاغذ پر جب نقشہ کھینچا میں نے تری انگڑائی کا
دلہن جیسی عزت ہے اس دور میں جھوٹے لوگوں کی
بیوہ جیسا حال ہوا ہے یار یہاں سچائی کا
اپنا سارا زورلگادے دیکھ بدی مٹ جائے گی
اس دنیا میں نام رہے گا خوبی کا اچھائی کا
بھولی، بسری، ساری باتیں اور فسانے یاد آئے
آج اثر ہے ذہن و دل پر یادوں کی پروائی کا
اچھے دن کے خوابوں کی یہ سب مبہم تعبیریں ہیں
چاروں جانب شور مچا ہے غربت کا مہنگائی کا

❁

عامر ربانی (بریلی)

غزل

کہاں کسی کا کوئی غم گسار لگتا ہے
جسے بھی دیکھو وہ مطلب کا یار لگتا ہے
پھر اک چراغ نے لو کو بنا لیا خنجر
پھر ایک شب کا بدن تار تار لگتا ہے
جو ان کی یاد میں ان کے خیال میں گزرے
وہ لمحہ دل کو بہت خوشگوار لگتا ہے
خزاں کل اس کا لبادہ اتار پھینکے گی
شجر جو آج بڑا سایہ دار لگتا ہے
گلاب، مشک، حنا، گل بکاؤلی، عنبر
ترے بدن کی مہک کا اتار لگتا ہے
بڑی صفائی سے یہ جھوٹ بولتا ہے میاں
مجھے یہ شخص بہت ہوشیار لگتا ہے
وہ اپنے غم سے پریشاں نہیں ہے اے عامرؔ
مرا سکون اسے نا گوار لگتا ہے

❁

www.urduchannel.in

محمد سالم
مئوآئمہ،الہ آباد

غزل

محبت اور وفا کا رنگ میں بھرکر بناتا ہوں
بہت رنگین دنیا کا ہر اک منظر بناتا ہوں
خلوص و مہر کا کتنا حسیں پیکر بناتا ہوں
میں اپنے دل کو مثل آئینہ اکثر بناتا ہوں
ہنر ایسا تخیل نے دیا ہے ظرف کو میرے
کہ ہر ذرے کو شایانِ مہ و اختر بناتا ہوں
بچھا کر میں سرمنزل نئے خوش رنگ پھولوں کو
فضائے زندگی کو اور افزوں تر بناتا ہوں
رہے جو عمر بھر بن کر مثال پر تو خورشید
انھیں کو منزل عرفان کا رہبر بناتا ہوں
ذرا دیکھوں کہاں تک ٹوٹتی ہیں بجلیاں اس پر
چمن میں آج جو اک پھوس کا چھپر بناتا ہوں
تمہیں لگتی ہے سالمؔ ٹھیس میری سخت گیری سے
سو اب اپنا مزاج فکر نازک تر بناتا ہوں

الیاسؔ چشتی
جوشی ٹولہ کھیری ٹاؤن ضلع کھیری

غزل

نہ دولت چاہئے مجھ کو نہ شہرت چاہتا ہوں میں
میں پیاسا ہوں محبت کا محبت چاہتا ہوں میں
خداوہ سب تجھے دے دے جو تیرے دل کی حسرت ہے
مگر دل پر ترے اپنی حکومت چاہتا ہوں میں
اٹھا کر آنکھ جس کو دیکھ لوں ہو جائے وہ میرا
مرے مالک نگاہوں میں کرامت چاہتا ہوں میں
وہ میرے رو بہ رو بیٹھے ہیں تنہائی میں سج دھج کر
زباں تک مدعا لانے کی ہمت چاہتا ہوں میں
غم و آلام سے کہہ دو ذرا سا دور ہٹ جائیں
خدا سے حوصلہ لینے کی مہلت چاہتا ہوں میں
سلیقہ مقتدی کا بھی نہیں کردار میں میرے
مگر ہمت ذرا دیکھو امامت چاہتا ہوں میں
ملی تھی جیسے مجنوں رومیو فرہاد کو الیاسؔ
تری الفت میں کچھ ایسی ہی شہرت چاہتا ہوں میں

www.urduchannel.in

احمد رشید(علیگ)*

''بن باس کے بعد''

صوتی گونج.....جو اپنے وجود کے لیے پریشان تھی، یکا یک ماحول صداؤں سے مرتعش ہو گیا....کہ ضرور بناؤں گا۔زمین پر اپنا ایک نائب،جمیل پری زاد اپنی برتری کے لیے بے چین ہوئے.....کیا آپ پیدا کریں گے زمین پر ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خوں ریزیاں کریں گے جب کہ ہمارے وجود کے سب موسم حمد وثنا کے سرتال ہیں۔اسم اعظم کی صدا گونجی کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے اور علم دے دیا اسم اعظم نے اپنے حکم سے اپنی تخلیق کو کل اسماء کا۔اس طرح خاک وجود کے افق پر چھا گئی،لیکن خاک! خاک جو اس کی ماں تھی،خون آلود ہو رہی تھی۔وسیع وعریض نیلے آسمان کو گدھوں نے اپنے مکروہ سیاہی مائل پروں سے ڈھک لیا تھا گو کہ زمین پر اندھیرا پھیل گیا تھا۔اس کے باوجود اگی ہوئی سرخ فصلیں پھر بھی نظر آ رہی تھیں۔خشک،زرد،ٹنڈ،منڈ شاخوں پر الو دیکھے گئے۔جو اپنی خوفناک آوازوں سے ٹرٹرا رہے تھے۔سرخ برہنہ شاخوں میں ہوا کے خنجر پیوست ہو گئے تھے۔سائے سایوں سے ڈر کر پناہ گاہیں تلاش کر رہے تھے۔جب اندھیرا مختصر ہوا اور گدھوں کی تعداد میں تقلیل ہوئی تو سورج کی کرنیں زمین پر کانپتی ہوئی دیکھی گئیں اور آسمانوں پر روشنی کے آثار نمایاں ہوئے اس وقت لوگ پناہ گاہوں سے نکل کر اپنی اپنی رہائش گاہوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ان کے چہروں پر ہراس کی سطریں پڑھی جا سکتی تھیں،جن کی روشنائی گہری تھی اور آنکھوں میں بیچارگی کی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔قینچی کی مانند تیز قدم سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی کالی سڑک پر چل رہے تھے....نہیں.....نہیں دوڑ رہے تھے۔ان قدموں کے درمیان دو قدم اس کے بھی تھے جس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں پھر بھی بیچارگی کی نمائندہ تھیں۔چہرہ جو سیاہ ہو چکا تھا،مریم کی سی پاکیزگی پسینہ کی صورت ٹپک رہی تھی۔وہ تیزی سے اس مختصر سفر کو طے کر رہی تھی۔جس کا اختتام ہو نہیں پا رہا تھا بلکہ لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔بڑی کوشش کے بعد ہانپتی کانپتی وہ اپنوں میں پہنچی۔

* گلی رہنٹ والا کنواں،سرائے رحمٰن،علی گڑھ

www.urduchannel.in

پنچ جو پرمیشور ہیں۔ایک دوفٹ اونچے مٹی کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔اسی لیے انہیں نیچے کی ہر شے چیونٹی نظر آرہی تھی۔چبوترے پر ایک پرانا برگد کا پیڑ لگا تھا۔جس کے اوپر سورج ٹنگ رہا تھا۔اس میں سے چھن چھن کر روشنی چبوترے پر گر رہی تھی۔چبوترے کے چاروں طرف بیٹھے اور کھڑے آدمیوں کے سر پر کڑی دھوپ تھی۔جسے ناتواں لوگ اپنے سر کنڈوں جیسی ٹانگوں پر سنبھالے ہواؤں کی زد پر کھڑے تھے کہ ذرا بھی ہواؤں میں تیزی آئی تو وہ گر جائیں گے..... یا ٹوٹ جائیں گے ان کو گرنے کا اتنا غم نہیں تھا چوں کہ گرنا تو ان کا مقدر تھا خطرہ تو ٹوٹنے کا تھا.....پھر پنچ تو بھگوان کے سمان ہوتے ہیں اور بھگوان تو ایک ہوتا ہے اور یہ پانچ یعنی بھگوان سے زیادہ شکتی شالی .....درگائیں ایک بیل گاڑی کی آڑ میں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں .....اپنے چہروں پر گھونگھٹ کاڑھے مگر اپنے سینے پر رکھے ہوئے کالے کالے نقطوں سے بے خبر، اور نوجوانوں کی آنکھوں کے خنجروں کی نوک پر غیر محفوظ....نہیں .....نہیں.....نہیں محفوظ غیروں کی ناپاک نظروں کے سائے سے بھی۔جانکی اپنے گھونگھٹ کی آڑ سے پرمیشوروں کو جھانک رہی تھی یا جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

''چودہ دن کسی غیر مرد کے یہاں گزارنے سے بہتر تھا کہ وش پی لیا ہوتا'' درمیان میں بیٹھا پنچ اپنی بلی جیسی مونچھوں پر لیموں رکھ رہا تھا۔

جانکی کے ہونٹ پھیل گئے۔وہ بڑبڑائی ''ہوں غیر''....وہ غیر اور اپنوں کا فرق سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی.....میں .....میں پاروتی ہوں ....شکتی ہوں شنکر کی .....خود شنکر نہیں ہوں ....اور شنکر تو یہ لوگ بھی نہیں ہیں پھر کیوں یہ میرے سر وناش پر تلے ہیں؟ وہ اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔

''بھئی مرنا تو سب کو ہے۔'' دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے پنچ نے تیر پھینکا۔

جانکی نے تیر کی کاٹ کو برداشت کیا۔''ہاں'' میرا قصور یہ ہے کہ میں موت سے ڈر گئی.....کیوں ڈر گئی....؟ کیوں نانیل کنٹھ کی طرح زہر اپنے گلے میں انڈیل لیا....لیکن اگر موت شکتی پر قابض ہو جاتی تو.....؟ کیا کوئی موت سے نہیں ڈرتا؟ جب جھیر سا گر منتھن ہوا تو دیوتاؤں نے وش پینے سے کیوں انکار کر دیا؟''

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ جانکی پوتر ہے؟'' تیسرے نمبر کے پنچ نے کہا۔

''پر اس کا کیا ثبوت ہے کہ میں اَپوتر ہوں'' جانکی نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے منہ میں کونین کی گولی آ گئی ہو، اس نے زمین پر حقارت سے تھوک دیا۔

پنچ پرمیشور کے فیصلے کے مطابق ''جانکی کو پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے اگنی پریکشا دینی ہوگی۔''

جانکی کو محسوس ہوا کہ دریودھن نے بھری سبھا میں دروپدی کو ننگا کر دیا ہو۔وہ سوچتی ہے مردوں نے عورت کو جنم ہی

www.urduchannel.in

سے دھورو کیڑا میں ہارے ہوئے دھن کی طرح استعمال کیا ہے۔لیکن میرا مرد، میرا دیوتا، میرا راگھویندر گوتم رشی کیوں نہ ہوا جس کے شاپ سے اہلّیا کی طرح میں یہاں آنے سے پہلے پتھر کی طرح ہو جاتی، پھر میں بھگوان کی طرح، نہ بولتی، نہ سنتی، نہ محسوس کرتی اور نہ روتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مردوں کے درمیان راگھویندر کھڑا سوچ رہا تھا اگر جانکی اگنی پریکشا میں اسپھل ہوگئی تو کیا ہوگا؟ وہ تو آگ میں جل کر جیون مکت ہو جائے گی.....لیکن میں زندگی بھر اپنی ہی آگ میں جلوں گا۔کیا میں جانکی کے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟ .....وہ آگ جو جانکی کو جلا کر پاپن ثابت کرے گی، پاپن تو مر جائے گی کیوں کہ بھگوان کی طرح وہ پتھر نہیں ہے۔ لیکن کیا پاپ اس کائنات سے مٹ جائے گا؟.....نہیں.....نہیں.....قتل کی روایت کا وہ سلسلہ راون پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ آج تک جاری ہے....راون ابھی مرا نہیں ہے؟ پھر اس فیصلہ اور سزا کا مطلب؟.....پنچ پرمیشور اور یہ سنسار تسلیم کر لے کہ جانکی کی جان سلامت تو سب کچھ سلامت ہے، عزت و ذلت، احساس شرم و ندامت سب بے معنی ہو جائیں گے۔ وہ سوچتا ہے میں یدھشٹر کیوں نہ ہوا؟.....مگر ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انسان سوچے کہ انار کے پیڑ میں آم نکلیں، آدمی کے سر پر ایک پتھر کی سل رکھی ہے بس وہ اسی کے نیچے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔نکل جانے کی ناکام کوشش ہی کہانی کو جنم دیتی ہے۔

فیصلے کے بعد لوگ اٹھنے لگے اور اپنے اپنے گھر آہستہ آہستہ واپس جانے لگے۔دن سمٹ رہا تھا۔سورج کی روشنی ہلکی ہو رہی تھی، دور مغرب میں شفق پھیل رہی تھی۔آسمان پر پرندے قطار میں اڑ رہے تھے اور ایک پرندہ ڈار سے بچھڑ گیا تھا۔جو پرندوں کے جھنڈ کو پکڑنے کی کوشش میں تیز رفتاری سے اڑنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔راگھویندر تنہا اس برگد کے درخت کے تنے سے لگا کھڑا تھا۔سوچتا ہے اس اگنی پریکشا اور جانکی کی پاکیزگی کا کیا تعلق ہے؟ اور پھر کیا پاکیزگی اور ناپاکی میں صرف چودہ دن کا فرق ہے۔ چودہ دن گھر سے غائب رہی تو جانکی ناپاک ہوگئی.....بہتر تھا مر گئی ہوتی.....رہا میرے غم کرنے کا تو فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ دنیا کے کاروبار میں کمی تھوڑی آتی۔معمول کے مطابق سورج طلوع ہوتا۔کاروبار زندگی بدستور چلتا۔سورج غروب ہوتا لوگ سوتے، لوگ جاگتے.....پنچ پرمیشور کے فیصلے سب میری طرح قبول کرتے؟ انسان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ارجن کی طرح کرشن کے کہے ہوئے پر عمل کر لے اور اپنوں ہی کے خلاف برسر پیکار ہو جائے اور میں نے بھی فیصلہ قبول کر لیا اپنی شرافت کی دلیل کے طور پر.... کل جانکی وہی عروسی جوڑا پہنے گی جو میرے گھر پہن کر آئی تھی اور اگنی کو ساکھی مان کر قسم کھائی تھی کہ اس دہلیز سے سفید جوڑا پہن کر ہی نکلوں گی۔لیکن یہ کیسی بغاوت ہے۔کیا ریت، روایت، پریت سب ہی کچھ بھول گئی؟ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اسے سب ہی کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا۔اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں،

www.urduchannel.in

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ برگد کی شاخ پکڑے کھڑا تھا اس نے اپنے آپ سے کہا ''رفاقت اور فرقت میں صرف ایک رات کا تفاوت ہے۔ اس رات کے بعد، میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا..... جانکی ان کالے کالے بادلوں میں ڈوب جائے گی پھر اندھیرا اور سیاہ راتیں میرے حواس پر سوار رہیں گی۔ راتیں سانپ بن کر ڈسیں گی۔ میری رگوں میں زہر گھولیں گی۔ وہی لوگ رہیں گے، پنچ پرمیشور رہیں گے، قریب بہنے والی ندی اسی طرح بہے گی۔ آموں کے پیڑوں پر بور آئے گا، فصلیں اگیں گی، سب کچھ یوں ہی باقی رہے گا۔'' اس نے ایک نگاہ آسمان پر دوڑائی۔ رات بالکل ویسے ہی ہے جیسی چودہ دن پہلے تھی۔ جانکی بالکل ویسی ہے جیسی چودہ دن پہلے تھی۔ پھر تبدیلی کس بات میں آئی؟ ہاں جانکی کا قصور یہ ہے کہ اس نے جان بچائی۔ لیکن کیا جان بچانے کا مطلب اگنی پریکشا ہے؟ اس نے جھٹکے سے اس شاخ کو توڑ لیا جسے پکڑے کھڑا تھا اور پنچ پرمیشور کی جاہِ نشست پر پڑے پتھر پر اس زور سے ٹھوکر لگائی کہ وہ دو گز دور جا پڑا۔ پنجہ میں چوٹ لگنے سے وہ کراہ اٹھا اسے لگا جیسے پتھر نے پنچ پرمیشوروں کی کمروں کو توڑ دیا ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے دروپدی کے اپمان پر بھیم نے دریودھن کی جانگھ توڑ دی تھی۔ اس کو سکون ہوا..... رات کے اندھیرے میں ہر چیز صفر نظر آ رہی تھی اس نے سوچا زندگی میں بھی تو ہر چیز تقسیم ہو گئی ہے اور باقی صرف صفر ہی رہ گیا ہے حالانکہ گوتم بدھا کو گرہست سنسار تیاگ کرنے پر روشنی پراپت ہوئی تھی، مگر مجھے جیون تیاگ کرنے پر اندھیرا؟ چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا، ایک خوفناک پراسرار اندھیرا۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے گھر پہنچا۔ گھر میں چودہ دنوں سے چراغ نہیں جلا تھا۔ آج پندرہواں دن تھا۔ جبکہ چودہ دن بن باس کے بعد گھر میں چراغاں ہونا چاہئے تھا، مہالکشمی کی پوجا ہونی چاہئے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے۔ جانکی کے غائب ہونے سے پہلے اس رات آسمان پر پورا چاند تھا اور چکور اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا؟ کل سے چاند گھٹنے لگے گا اور رفتہ رفتہ گھٹتے گھٹتے بالکل غائب ہو جائیگا۔ نہیں ....نہیں چاند پھر ابھرے گا۔ ہر شے ابھرنے کے لیے ڈوبتی ہے اور پنر جنم کا یہ سلسلہ دائروں کی طرح کائنات کے اس سمندر میں پھیلتا رہتا ہے..... میرا چاند بھی ابھرے گا۔ مگر اس کی پہچان کیا ہوگی؟ چاند جب ڈوب کر ابھرتا ہے تو کتنا باریک ہوتا ہے! کتنا فرق ہوتا ہے ڈوبنے کے بعد ابھرنے میں! اس نے دائیں ہاتھ بچھی چارپائی پر نظر اٹھائی جو خالی تھی۔ جس رات جانکی غائب ہوئی تھی، اس رات گھر شمشان ہو گیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی کے درمیان صرف میں تھا اکیلا، تنہا، ایک بھوت کی طرح۔ ہر شے مجھ ہی سے شروع ہو کر مجھ ہی پر ختم ہو رہی تھی اور اب چودہ دن بعد خط مستقیم کا وہ دوسرا نقطہ ملا بھی تو اس کی سمت خط منحنی کی طرح مڑ گئی۔ نہیں..... نہیں..... موڑ دی گئی۔ میں نے کب انصاف مانگا تھا؟ پھر کیوں انصاف دیا جا رہا ہے؟ جانکی بری ہے بھلی ہے میرے لیے ہے پھر دنیا میں کون اچھا ہے؟ اور کون برا ہے؟ گناہوں کی صلیب آدم سے

www.urduchannel.in

لے کر جانکی تک ہر ایک اپنے کاندھے پر لیے گھوم رہا ہے۔ پھر ہابیل اور قابیل جو ایک ہی پیٹ کے تھے عورت کی خاطر ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اس کا علم انہوں نے دو کوؤں کی جنگ سے لیا۔ ایک کوا لہولہان ہو کر مر گیا تو دوسرے نے پنجوں سے زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ کوے نے بھی اتنا ہی کیا جتنا اس کو علم دیا گیا تھا۔ پھر قصور کس کا ہے سامنے بائیں جانب ایک کونے میں ایک کنکر کے نیچے کوکروچ پھڑ پھڑا رہا ہے۔ پھر جس گناہ کی پاداش میں وہ آگ میں جلے گی تو کیا جلنے سے اس کی عزت واپس آجائیگی؟....نہیں.....نہیں.....کتنے پاگل ہیں یہ لوگ، جان ہے تو عزت و ذلت ہے، ایمان ہے جہان ہے۔ اور گر جان نہیں تو ایمان کا کیا مطلب؟ پھر اس میں جان کا کیا قصور؟ قصور ان کا ہے جنہوں نے جانکی کا ایمان غصب کیا؟.....نہیں.....نہیں اندر آج بھی اِندر ہے، دیوتاؤں کا راجا۔ قصور تو اہلیّا ہی کا ہے.....؟

''بے شک.....بے شک'' پنجرے میں قید طوطے نے کہا۔

راگھویندر کی نظر پنجرے پر گئی جو جھونپڑی میں لگے ڈنڈے پر لٹک رہا تھا اور طوطا ادھر سے ادھر ٹیں ٹیں مٹھو بیٹا ....مٹھو بیٹا کر رہا تھا۔

''ہاں تو ہی میرا ہمدرد ہے'' اس نے کہا.....وہ یہ بھول گیا تھا، طوطا مٹھو بیٹا کے علاوہ کہہ کیا سکتا ہے؟ طوطا اتنا ہی جانتا ہے جتنا اس کو علم ہے، اتنے ہی اسماء جانتا ہے جتنے اس کو بتائے گئے ہیں، وہ مفاہیم اور معنی سے بے خبر ہے.....راگھویندر کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں...سوچتا ہے کتنی عجیب سی بات ہے انسان جان بچا کر بھاگنا بھی چاہتا ہے، پھر بھی عزت و ایمان کو جان سے بڑا گردانتا ہے۔''

''بے شک....بے شک'' طوطے نے سر ہلایا۔

''ہاں..... ہاں'' راگھویندر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بے شک.....بے شک.....مٹھو بیٹا'' طوطے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

کل سورج نکلے گا اس کی پہلی کرن جانکی کی موت کا پیغام ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں اور رات کی سیاہی آہستہ آہستہ گھل کر ہلکی ہو رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں نیلے آسمان کا مشرقی ٹکڑا سرخ آلود ہو گیا۔ لوہے کے ایک تار پر جانکی نٹ کا تماشہ کرے گی۔ جائے مقتل پر تماش بین جمع ہو رہے تھے پنچ پر میشور برگد کے نیچے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہونٹوں پر بے رحم ہنسی کے نقوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ دور کھڑی جانکی اس آگ کے منظر کو دیکھ رہی تھی جس کا وہ خود ایندھن بنے گی۔ چند لوگ اگنی کے چاروں طرف روایت کے مطابق لہک لہک کر ناچ رہے تھے اور اپنی مخصوص آوازوں میں مذہبی گیت گا رہے تھے جن کے الفاظ جاہ و جلال اور عبرت ناک معنی دے رہے تھے۔

www.urduchannel.in

آگ کے بلند شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ آگ جلتی رہی....رقص ہوتا رہا....ڈھولک پر پڑنے والی ضرب تیز ہوتی رہی....اگنی پریکشا ہوتی رہی......ناچ ....تھاپ....اگنی پریکشا......سپھلتا....کامیابی ......کامرانی دیکھنے والوں نے تالیاں بجادیں تماش بین خوش ہو گئے.....پنچ پرمیشوروں کے چہرے اتر گئے جیسے مہابھارت میں کوروؤں کے جب بڑے بڑے ویر مارے گئے....اور یدھشٹر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی ٹھیک اسی وقت بھیشم پتامانے کہا یدھشٹر تمہاری وجے اس لیے ہوئی کہ ''تیودھرم تنوجے'' (جہاں دھرم ہوتا ہے وہیں وجے ہوتی ہے) راگھویندر چونک گیا اس کی آنکھوں میں سپھلتا کے آنسو آ گئے....اس نے تیزی سے بڑھ کر جانکی کو باہوں میں بھرلیا، جانکی اس کی باہوں میں اس طرح گرگئی جیسے بھیشم پتاما شرشیا پر پڑے ہوں۔ راگھویندر جانکی کو لے کر گھر چلا گیا۔ برگد کا پیڑ سنسان ہو گیا، چبوترے کے سامنے نمرود کی لگائی ہوئی آگ ٹھنڈی ہوگئی، آسمان پر بادل شیر کی طرح دہاڑنے لگے، بجلی کڑکی، خوب بارش ہوئی، لوگ مست ہو گئے اہلیّا دوبارہ پتھر سے انسانی گوشت و پوست میں تبدیل ہوگئی۔ چاروں طرف خوشیوں کے سنکھ بجنے لگے۔

☆☆☆

جانکی کا دوبارہ جنم ہوا جیسے انسان پرانے کپڑے تیاگ کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ہر روز نیا دن آتا ہے، آنے لگا۔ زندگی پھر لوٹ آئی تھی جیسے یم راج نے ساوتری کی تپسیا سے خوش ہو کر ستیہ وان کو لوٹا دیا تھا۔ حالاں کہ تماشہ ختم ہو گیا مگر زندگی کا تماشہ جاری تھا۔ کائنات کی اسٹیج پر........ہر دن اس ڈرامہ کا نیا سین ہوتا ہے، ڈراپ ہوتا ہے اور اس طرح قبائے حیات شب و روز کی چھڑی پر لپٹ رہی تھی اچانک اس لباس پر سکڑن آ گئی جب بھری چوپال میں کلوا نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تھا ''بتا سالی ایک رات تو کہاں غائب رہی؟ یہ نہ سمجھنا کہ سب لوگ راگھویندر کی طرح عورت کے بھگت ہو گئے ہیں۔''

راگھویندر کے پیروں تلے زمین نکل گئی، اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں، پیشانی پر بل پڑ گئے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ کر کیا سکتا تھا۔ بے بسی کے عالم میں جب اس رات وہ گھر لوٹا......جانکی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جانکی کو اس قدر مارے کہ چودہ دن کا بدلہ لے لے جو آسیب کی طرح اس کی زندگی سے چپک گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ چودہ دن زندگی سے خارج کر دیئے جائیں؟........لیکن ایسا ہو نہیں سکتا......اس کا جی چاہا کہ جانکی کو اپنی زندگی سے نفی کر دے تو سب جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ پھر نہ کوئی زندگی کا حساب لے گا اور نہ ہی چودہ دن کی ضرب و تقسیم کرے گا۔ وہ آہستہ آہستہ جانکی کی طرف بڑھا........

''ٹیں....ٹیں.....مٹھو بیٹے''

www.urduchannel.in

وہ چونک گیا۔ جانکی کی آنکھیں کھل گئیں اس نے راگھویندر کو اپنے قریب کھڑا دیکھا۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' جانکی بستر پر لیٹی تھی۔

راگھویندر اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا اور کچھ نہیں کہا۔ اس کا جی چاہا کہ کلوا کا سر توڑ دے.....مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔

''دل چاہتا ہے کہ آگ لگا دوں اس انصاف کو، اخلاق کی دھجیاں اڑا دوں، سماجی قدروں کو توڑ دوں'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا.....اس کی آواز جھونپڑی میں پھیل گئی۔

جانکی فوراً ہی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا.....میں نے کیا کیا؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں.....کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے'' جانکی نے کہا۔

''بے شک.....بے شک'' طوطے نے کہا۔

''پچ پچ مٹھو بیٹے تم ابھی تک سوئے نہیں'' جانکی نے کہا۔

''بے شک.....بے شک.....مٹھو بیٹے ٹیں ٹیں.....مٹھو بیٹے'' طوطے نے کہا۔

راگھویندر کی نظر پنجرے کی سخ چوں پر گئی جو سنہری رنگ میں رنگے تھے۔ جس میں طوطا ادھر ادھر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اچانک بجلی کی سرعت کے ساتھ وہ چارپائی سے اٹھا اور پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا.....جانکی پنجرے کی طرف دوڑی ''ارے.....رے.....رے.....'' طوطا آزاد ہو چکا تھا اور دور آسمان کی وسعت میں ڈوب گیا۔ جانکی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیا کیا آپ نے؟''

میں نے طوطے کو آزاد کر دیا۔ اب یہ رٹے ہوئے الفاظ نہیں بولے گا۔۔۔۔۔ اب یہ اپنے فطری انداز میں زندہ رہے گا، جہاں چاہے گا بیٹھے گا.....جہاں چاہے گا اڑے گا۔'' جانکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

راگھویندر نے جانکی کے آنسو پونچھے، اسے قریب کیا۔ ''اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا تم کو مجھ سے چھین لے، میں تم کو تم سے چھین لینا چاہتا ہوں۔''

رنگ بدلتے آسمان تلے اندھیرے کا کالا رنگ پھیکا ہو رہا تھا اور نئی روشنی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

○

www.urduchannel.in

وسیم حیدر ہاشمی

کاشی واس

کہتے ہیں کہ جس شخص نے آخری سانسیں کاشی (بنارس) میں لیں، وہ چوراسی لاکھ جنموں سے مُکتی حاصل کر لیتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے بھی 'چراغِ دَیر' میں اس کا ذکر کیا ہے جبکہ ہندی کے سرفہرست کَوِی 'کبیر داس' کو اس پر یقین نہیں تھا۔ ان کی نگاہ میں خدمت خلق سرفہرت تھی۔ اُنھیں ڈھونگ سے سخت نفرت تھی۔ نانوؔدا کی عمر ستّر کی ہو چکی ہے۔ آج سے تقریباً دس بارہ برس قبل وہ بھی بنگال کے کلکتہ سے کاشی واس کی غرض سے بنارس آ بسا تھا۔ اس کا اصلی نام کسی کو نہیں معلوم۔ بنگالیوں میں 'دادا' شاید بڑے بھائی کو کہتے ہیں اس لیے اس کے سنگی ساتھی اور محلے والے اسے شروع شروع میں ''دادا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد اس کے جاننے والے اسے 'نانودا' کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ اب اس شخص کو کوئی صرف دادا نہیں کہتا بلکہ ہر کس و ناکس اسے ''نانودا'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس کنیت سے خوش بھی ہوتا ہے۔ نانو دا پیشے سے بڑھئی اور ایک عام سا آدمی ہے مگر اس کی شرافت، نیکی اور ہر کسی سے مسکرا کر ملنے کی ادا نے اسے ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ وہ 'کاشی واس' کی غرض سے بنارس پہنچ تو گیا تھا مگر اس نے اپنا کاشی شروع نہیں کیا تھا چنانچہ فی الحال اپنے پرانے کاروبار سے لگ گیا تھا۔ چوں کہ وہ لکڑی کے فرنیچر وغیرہ بنانے میں حد درجہ مہارت رکھتا تھا اس لیے بہت جلد بنارس کے کئی بڑے کاری گر اس کی ٹیم میں شامل ہو گئے تھے۔ گزشتہ ایک ماہ سے وہ شہر کے ایک بڑے تاجر 'چھنّو لال' کے نئے تعمیر شدہ بنگلے کا فرنیچر بنا رہا تھا۔

آج کام ختم کرنے کے بعد نانو دا جب اپنی ٹیم کے ساتھ چھنّو لال کے بنگلے سے باہر نکلا تو سیٹھ چھنّو لال کے اشارے پر اس کا ایک نوکر نانو دا کے تعقب کی غرض سے اس کے پیچھے لگ گیا، کچھ اس طرح کہ نانو دا کو پیچھا کیے جانے کا احساس نہ ہو سکے۔ یہ چھنو لال کی ہدایت تھی۔ مختلف پر پیچ گلیوں سے گزرتا ہوا جب نانو دا کھلی سڑک پر آ کر ایک رکشہ والے سے کچھ باتیں کرنے کے بعد اس پر بیٹھ گیا تو یہی سب کچھ چھنو لال کے نوکر نے بھی دہرایا اور نانو دا کے رکشہ کے پیچھے لگ لیا۔ تقریباً نصف گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد نانو دا کا رکشہ شہر کی ایک پوش کالونی کی طرف

www.urduchannel.in

مڑا اور ایک لین میں داخل ہو کر خوبصورت بنگلے کے صدر دروازے پر رک گیا۔ رکشہ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد نانو دا تو بنگلے کے اندر چلا گیا جبکہ چھنّو لال کا کارندہ بنگلے سے کچھ دور کھڑا غور سے بنگلے اور اس کے صدر دروازے کو گھورتا ہوا یہی بڑبڑا رہا تھا کہ ''اس بنگلے سے ایک مزدور پیشہ شخص کا بھلا کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ اس بنگلے کا مالک تو ہو نہیں سکتا.....ہو سکتا ہے کہ اس بنگلے میں بھی نوکر کے فرائض انجام دیتا ہو!.....مگر ایک بڑھئی بھلا یہاں کس قسم کی خدمت انجام دیتا ہوگا؟'' ابھی وہ اِسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ کسی کے مخاطب کرنے پر چونک اٹھا۔

''شری مان جی، آپ کو نانو دا نے اندر بلایا ہے۔'' یہ ایک دبلا پتلا سولہ سترہ برس کا لڑکا تھا۔

''ہاں.....آں۔ چلو، وہ اندر ہیں نا؟'' اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ بے چوں چرا اس نوعمر کے ساتھ بنگلے میں داخل ہو گیا جس میں ابھی چند لمحے قبل نانو دا گیا تھا۔ بنگلے کے خوبصورت پائیں باغ میں قدم رکھنے کے ساتھ وہ یک لخت یہ فراموش کر گیا کہ یہاں اس کے آنے کا مقصد کیا تھا۔ آگے بڑھ کر خادم نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر جب اسے خوش آمدید کہا تب اسے اپنے وجود کا احساس ہوا۔ عالی شان صوفے، دبیز پردوں اور قیمتی ایرانی قالین سے مسجع ڈرائنگ روم میں نانو دا ایک آرام کرسی پر بیٹھا دن بھر کی تکان دور کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نانو دا نے خود بڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ غیر ارادی طور پر ایک صوفے میں دھنس گیا۔

''کہیے لال چند جی، کیسے زحمت فرمائی.....میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' نانو دا نے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔

''نانو دا.....بات دراصل یہ ہے کہ.....!'' گھبراہٹ میں لال چند کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

''.....میں بتاتا ہوں۔ دراصل آپ کے مالک، جناب چھنّو لال جی کو اس بات کی تشویش ہوگی کہ میں اپنے تمام کاری گروں اور مزدوروں کی مزدوری کا ایک ایک پیسہ ان سے روز وصول کر کے اُن میں تقسیم کر دیتا ہوں اور اپنے کام کی اجرت ان سے کبھی نہیں طلب کرتا.....کیوں، کیا میرا خیال درست ہے۔''؟ اتنا کہہ کر نانو دا، لال چند کو جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا تو لال چند نے ہکلا کر بمشکل صرف اتنا کہا۔

''جج.....جی، جناب نانو دا۔'' اے.سی. چلنے کے سبب کمرہ خاصا خنک تھا پھر بھی لال چند کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نظر آ رہی تھیں۔

''تو سنیے.....ہم سات بھائی بہن تھے۔ والد کی قلیل آمدنی کے سبب میرا بچپن بڑی عسرت اور کسمپرسی کے عالم میں گزر رہا تھا۔ میں نے کولکاتا کے ایک کارخانے میں لکڑی کے فرنیچر بنانے کا کام سیکھا اور پھر اسی کو اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیا۔ جب کچھ کمانے لگا تو میرے والد نے میری شادی کر دی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم انگریزی

www.urduchannel.in

حکومت کے غلام تھے۔ ہر طرف انگریزوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان کے ظلم اور بربریت نے پورے دیس میں آتنک پھیلا رکھا تھا۔ ہم لوگ خوف و ہراس کے سائے میں اپنی زندگیوں کے دن کاٹ رہے تھے۔ پھر ہندوستانیوں کا خون ناحق ایک روز رنگ لایا اور چاروں طرف یہ خبر روئی کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ہمارا ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نام کا ایک نیا ملک بھی وجود میں آ گیا ہے۔ پوربی پاکستان اور پچھمی پاکستان۔ جاتے جاتے انگریزوں نے ہمیں ایک زبردست فرقہ وارانا فساد میں پھنسا دیا۔ ہر طرف قتل و غارت کے ساتھ بھگدڑ کا عالم تھا۔ اُدھر والے پاکستان سے بھاگ کر بھارت آ رہے تھے اور اِدھر کے بھی بہت سے لوگ بھاگ بھاگ کر پاکستان جا رہے تھے۔ ہمارے بہت سے رشتہ دار ڈھاکہ یعنی پوربی پاکستان میں رہتے تھے۔ ہمارے والد اور والدہ بھی پورے کنبہ کے ساتھ ڈھاکہ چلے گئے۔ ہر چند کہ میرا کولکاتا چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا تھا مگر میں نے والد کی تقلید کی۔ وہاں پر ہمارے اعزہ جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں چوں کہ ہم لوگوں کی کثرت تھی اس لیے وہاں امن تھا، پھر بھی میرا دل وہاں نہیں لگ رہا تھا۔ والد کے منع کرنے کے باوجود، چند ماہ بعد ہی میں اپنی اہلیہ کے ساتھ واپس اپنے وطن آ گیا۔ غربت ہو یا بھُکھ مری، حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں، اپنا وطن اور اپنا گھر، بہر حال اپنا ہوتا ہے۔ مجھے یہاں واپس آ کر بڑا سکون ملا۔ چند ماہ بعد ہمارے والد بھی مع اہل وعیال واپس آ گئے اور ہم لوگ اپنے پرانے کاروبار سے لگ گئے.....''۔ نانو دا نے ایک گلاس پانی پیا اور پھر اپنی آپ بیتی سنانے لگے۔ ''بھگوان نے مجھے دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ میں خود پڑھا لکھا نہیں تھا، جس کا مجھے از حد افسوس تھا۔ پڑھائی کا اپنا شوق میں اپنے بچوں کو پڑھا کر پورا کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ہمیشہ اپنے بچوں کی بہتر تعلیم کا خیال رکھا جس کے نتیجہ میں آج میرا بڑا بیٹا کولکاتا ہائی کورٹ میں جسٹس اور چھوٹا بیٹا اِس وقت بھونیشور میں ڈی.آئی.جی. ہے۔ میں نے بیٹی کو بھی اس کی خواہش کے مطابق پی.ایچ.ڈی. کروائی، جو آج کل دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہے۔'' اتنا کہہ کر نانو دا جیسے ہی سانس لینے کے لیے چپ ہوا، لال چند نے اپنی طرف سے ایک سوال داغ دیا۔

''بیٹی دہلی میں، بیٹے کلکتہ اور بھونیشور میں، پھر آپ بنارس میں تنہا کیا کر رہے ہیں۔ اور یہ عالیشان بنگلہ.....؟''

''ہاں، بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ ذرا دَم تو لے لوں.....جب میں اپنے تمام گھریلو فرائض سے سبک دوش ہو گیا تو میرا دل از خود، دھرم کرم اور مذہب کی طرف مائل ہو گیا۔ میری ہرا ولاد یہی چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ رہوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں جب میں نے اپنے بچوں سے 'کاشی واس' کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے مجھے کچھ بتائے بغیر میرے لیے یہ گھر خرید دیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود، میری اولادیں میرے اخراجات کے

www.urduchannel.in

لیے اپنی اپنی باری میرے بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم منتقل کروادیا کرتی ہیں۔ اسی رقم سے گھر کے تین عدد ملازموں کی تنخواہ اور دیگر اخراجات پورے ہوتے ہیں.....!'' لال چند نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

''ایسی عالیشان زندگی کے باوجود آپ روز چار چھ عدد کاری گروں اور مزدوروں کے ساتھ اس طرح محنت مزدوری کیوں کرتے ہیں۔ پھر وہی دنیاوی زندگی؟ اس طرح تو آپ کے کاشی واس کا مقصد کبھی پورا نہیں ہوگا۔ میرے ذہن میں آپ کی حالیہ زندگی کا مقصد واضح نہیں ہوسکا۔ اس طرح تو کوئی بھی کاشی واس کا پُن نہیں کما سکتا۔.....وہی دنیاداری کی زندگی؟'' لال چند کا سوال جائز تھا۔

''دیکھئے بھائی لال چند جی، آپ کی اور دنیاوالوں کی نگاہوں میں کاشی واس کا جو بھی مطلب ہو.....مجھے اس سے کوئی نا اتفاقی نہیں ہے کیوں کہ اس کا مفہوم بہرحال پُن کمانا ہی ہوگا۔ کاشی واس کا پُن کمانے کے لیے میں ان مزدوروں اور کاری گروں کو بے آسرا نہیں چھوڑ سکتا جن کے خاندان کی روزی روٹی کی آس اب میں بن چکا ہوں۔ میرے اس کاروبار سے کم از کم دس خاندانوں سے وابستہ پچاس انسانی زندگیاں پل رہی ہیں، جسے میں ایک پُن تصور کرتا ہوں۔ اپنی تگ ودو سے کام تلاش کر کے انھیں اپنے ساتھ لگائے رکھنا ہی اب میرے کاشی واس کا اصل مقصد بن چکا ہے۔ بھگوان میری اس خدمت کو قبول کرلے تو میں اسے ہی اپنا کاشی واس مان لوں گا۔.....اور ہاں.....میں نے آج تک اپنی یہ اصلیت اور اپنی زندگی کا اصل مقصد کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ اگر آپ میرے سلسلہ کی یہ باتیں کسی سے نہ کہیں تو مہربانی ہوگی۔ میری زندگی کا مقصد صرف انسانوں کی خدمت ہے۔ میں کسی کی بھی نگاہ میں مہان نہیں بننا چاہتا۔ بس، ایشور ہمارے اس عمل کو قبول کرلے۔'' اتنا کہہ کر نانو دا خاموش ہوگیا۔ اب لال چند اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے نانو دا اس مادہ پرست دنیا کی مخلوق نہ ہو۔

○

www.urduchannel.in

ڈاکٹر محمد مستمر

پہلے ٹائٹس

گرمی اپنے پورے شباب پر تھی.....جون کا مہینہ.....وہ بھی ۲۲ر جون آنے کو.....سب سے بڑا دن سال کا.....سورج گویا پہلے بُرج پر آ کر براجمان ہو گیا ہو.....یہ تو دوآبہ کا علاقہ ہے جو شام ڈھلے کچھ راحت کا احساس ہو جاتا ہے.....یوپی میں بجلی کا معاملہ تو نہایت گندہ ہے ہی.....اس لیے اِنوَرٹر بھی کہاں تک کام کرے۔ یہ بھی تو بجلی کا ہی محتاج ہے.....دوپہر کے قریب ایک بجے کا وقت ہے.....رات سے بجلی گُل ہے.....باہر نہایت تیز لُو چل رہی ہے.....دُور تک دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں.....اس لئے باہر کسی پیڑ کے نیچے بیٹھنا بھی محال ہے بلکہ بیماری کو اور مزید دعوت دینا ہے۔

چوہان صاحب جن کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں.....گرمی کی وجہ سے کبھی بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی بیڈ سے اُٹھ کر کچھ لمحے کے لیے ٹہلنے لگتے ہیں.....گھبراہٹ سے بار بار سینہ پر ہاتھ پھیر رہے ہیں.....ہونٹوں پر خشکی آ رہی ہے اس لیے جیبھ پھیر کر گیلے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں.....بے چینی واضطرابی کی کیفیت میں اپنی پتنی ساکشی کو آواز لگاتے ہیں.....آواز سُن کر پتنی برابر والے کمرے سے آتی ہے.....بڑبڑاتی ہوئی، چوہان صاحب کو لٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ چوہان صاحب کا کئی دن سے بخار اُترنے کا نام نہیں لے رہا ہے.....ساکشی ماتھے پر ہاتھ لگاتی ہے تو کہتی ہے۔

''رام رے.....!!! کس قدر تیز بخار ہے۔ ماتھا توے کی طرح تپا ہوا ہے۔ کئی دن ہو گئے، بخار اُترنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔ بھگوان خیر کرے۔ سب شُبھ شُبھ ہو.....ایک لمحہ رُک کر.....بھگوان خیر کہاں کرے گا (وہ ذرا تنُک کر اور غصہ ہو کر یہ جملہ ادا کرتی ہے)۔ اپنی کرنی کا پھل تو بھوگنا ہی پڑے گا۔ اپنی حرکتوں اور لتوں سے تو باز آنے والے

www.urduchannel.in

نہیں.....کیسے بیماری پیچھا چھوڑے۔اتنا سب کچھ ہونے پر بھی،شراب چھوڑنے کا نام نہیں.....بھگوان نے اگر دولت دی ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ اسے بُرے کاموں پر خرچ کرو.....اور کیا.....دولت بھی اُڑاؤ اور تندرستی بھی خراب کرو..... ہر چیز کی ایک لمٹ ہوتی ہے۔ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ اگر شراب اور اس طرح کی بری لتیں نہ چھوڑیں تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے.....ابھی صرف شادی کو چودہ سال ہی تو ہوئے ہیں.....چالیس کے ہوتے ہوئے ایسے لگتے ہیں جیسے پچاس برس کے..... بیماری تو وقت سے پہلے ہی انسان کو بوڑھا بنا دیتی ہے۔چھترانی ہوں۔سنسکار ہی ایسے ملے ہیں کہ چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہوں.....بھگوان کا دیا سب کچھ تو ہے مگر دولت سے زندگی کا چین وسکون نہیں خریدا جا سکتا ہے.....بچوں پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔ہمانشو جو بارہ سال کا ہونے کو ہے،اب کافی باتیں سمجھنے لگا ہے.....''سمجھے جی.....!'' (وہ جملہ ذرا کھینچ کر تشویش کے ساتھ اپنے پتی کو مخاطب کرتی ہے).....چٹکی ابھی صرف چار برس کی ہے لیکن کچھ دن بعد وہ بھی بڑی ہو جائے گی۔کیا تاثر لے گی وہ.....''

اور ساکشی انہی الفاظ کے ساتھ اپنی بات کو ادھورا چھوڑتی ہے۔تبھی برابر کے کمرے سے ساس کی آواز آتی ہے.....

''بہو.....بہو.....!!!دیکھو.....!چٹکی اُٹھ گئی ہے۔'' ساکشی تیزی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔

☆☆☆

چوہان صاحب ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔لمبی چوڑی جائداد کے اکیلے وارث۔جب گریجویشن کا پہلا سال تھا تو باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔کالج کے وقت سے ہی لیڈری شروع کر دی تھی.....بمشکل چھے سال میں گریجوایشن کیا تھا۔چھے سال ایسے ہی لیڈری پنے میں نکال دئے تھے۔جیب خرچ کی کمی نہ تھی۔دوستوں پر خوب پیسا خرچ ہوتا تھا۔آہستہ آہستہ دوستوں کی ایسی کمپنی ملنی شروع ہو گئی کہ جو صرف شراب نوشی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف قسم کے نشوں کے بھی رسیا تھے اور ساتھ ہی صنفِ نازک کی گرمی کے بھی عادی ہو چکے تھے.....کالج چھوڑنے پر بھی چوہان صاحب ان تمام لتوں کو نہیں ترک کر پائے۔کونسا شوق تھا جو انھوں نے نہیں کیا تھا۔دوستوں کی کمپنی ایسی ملی تھی کہ تمام طرح کی احتیاط سے وہ لاپرواہ ہو گئے تھے۔انھوں نے اپنے قوی ہیکل جسم پر مختلف قسم کے ٹیٹو گدوا رکھے تھے۔دوستوں کی آپسی بے تکلفی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک دوسرے کا ٹوتھ برش کرنے،تولیا استعمال کرنے،صابن برتنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔کبھی کبھی دوستوں کے درمیان اس قدر بے تکلف ہو جاتے تھے کہ ایک ہی بلیڈ سے شیو بنا لیا کرتے تھے۔شراب نوشی اور دوسری لتوں نے انھیں اس قدر غلیظ بنا دیا تھا کہ جنگل سے فارغ ہونے کے بعد وہ صابن یا مٹی سے ہاتھ تک بھی نہیں دھوتے تھے۔پورے دن میں نہ جانے کتنی سگریٹ پھونک دیا کرتے تھے۔اب جبکہ وہ پچھلے بارہ سالوں سے گرہست زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کے رویے اور عادتوں میں کوئی

www.urduchannel.in

بدلاؤ نہیں آیا ہے۔

پچھلے ایک ہفتہ سے ان کی طبیعت ناساز چل رہی ہے۔ بار بار اُلٹیاں آ رہی ہیں۔ بخار اُترنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ بھوک برائے نام رہ گئی ہے۔ ساکشی اور چوہان صاحب کی ماں بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ساکشی سے پتی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تو ماں سے بیٹے کا درد برداشت نہیں ہوتا ہے.....دو دن سے طبیعت اور خراب ہوگئی ہے .....بخار کے ساتھ پیلیا بھی ہوگیا ہے۔ پیشاب بالکل زرد رنگ کا آنے لگا ہے۔ پیٹ کے اوپری حصے اور کبھی نیچے بھی درد پیدا ہوجاتا ہے۔ لوکل ڈاکٹر بالکل جواب دے چکے ہیں۔ اس لیے چوہان صاحب کو شہر ریفر کر دیا جاتا ہے۔

چوہان صاحب کو فوراً ایمرجینسی کے تحت آئی سی یو میں بھرتی کر دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی انھیں آئی سی یو میں بھرتی کیا جاتا ہے، رشتہ داروں کا تانتا شروع ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم فوراً ایکشن لیتی ہے۔ چوہان صاحب کی حالت بہت زیادہ سیریس ہوجاتی ہے.....ٹوٹل ٹیسٹ، بلڈ ٹیسٹ، شوگر ٹیسٹ، یورِن ٹیسٹ وغیرہ ٹیسٹ اور سٹی اسکین، الٹرا ساؤنڈ کئے جاتے ہیں۔ چوہان صاحب کا جسم جو کافی قوی ہیکل اور لمبا چوڑا تھا بہت نحیف ونزار اور کمزور ہوجاتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی جاتی ہیں۔ سانس لینے میں بھی دقّت ہونے لگتی ہے۔ سب گھر والوں کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں.....''ہے بھگوان تو ہی مالک ہے.....'' ساکشی اور چوہان صاحب کی ماں دونوں ایک ساتھ یہ جملہ ادا کرتی ہیں۔ اور پھر دونوں ایک ساتھ سسکیاں بھرنے لگتی ہیں.....ساکشی کا بڑا بھائی ڈاکٹر سے پوچھتا ہے۔ ''سر اب کیسی حالت ہے چوہان صاحب کی.....!!؟'' ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے۔'' ڈاکٹر جواب دیتا ہے۔ پھر ڈاکٹر ساکشی کے بھائی کو الگ لے جا کر کہتا ہے۔ ''دیکھئے.....! معاملہ بہت سیریس ہے.....ہم کوشش کر رہے ہیں.....باقی سب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے.....''

چوہان صاحب کو کئی دن آئی سی یو میں بیت جاتے ہیں.....ساکشی کو تو دن بھی یاد نہیں رہتے۔ وہ حساب لگاتی ہے تو چار دن ہو چکے تھے، ہسپتال میں بھرتی ہوئے.....ساکشی اس مادیت پرستی کے دور میں بھی اپنے پتی کی صحت کی آرادھنا کرتی رہتی ہے۔ وہ من ہی من میں کہتی ہے'' ہے بھگوان.....! پرارتھنا کے علاوہ میرے پاس ہے ہی کیا .....بس تو میرے پتی کو بچالے.....''

ڈاکٹر مریض کو ہر طرح سے راحت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چوہان صاحب کی طبیعت مزید بگڑتی ہی جاتی ہے.....ڈاکٹر مریض کے ایک ایک پہلو کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں اور جائزہ لیتے ہیں.....وہ مرض پر قابو پانے کے لیے بخار اور اُلٹیوں کی الگ دوائی دیتے ہیں.....کیوں کہ اس طرح کی بیماری میں نسخہ بندی ہی سب سے کارگر ثابت ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب ایک ساتھ کئی بیماریوں کے امتزاج سے مریض چپیٹ میں آجاتا ہے..... ڈاکٹر دوائیوں کے ساتھ چوہان صاحب کو ویکسِن بھی لگاتے ہیں.....مرض سے متعلق دواؤں کے علاوہ اینٹی وائرل

www.urduchannel.in

یعنی اِنٹرفرانس ادویہ بھی چوہان صاحب کو استعمال کرائی جاتی ہیں۔آہستہ آہستہ حالت میں سُدھار ہوتا ہے اور چوہان صاحب کی حالت نارمل ہونے لگتی ہے.....دس دن بعد ڈاکٹر انھیں گھر جانے کے لیے ڈسچارج کر دیتے ہیں۔

اب چوہان صاحب کی حالت کافی بہتر ہوگئی تھی اور ان کے چہرے پر تازگی و شگفتگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے.....ساکشی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ تمام بری لتیں تیاگ دیں گے۔ساکشی سے لیے وعدے کے مطابق وہ کجر ہی کو تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن شراب نوشی کے عمل سے وہ باز نہیں آتے ہیں.....نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر سے بیمار پڑ جاتے ہیں۔اب کی مرتبہ حالت پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوجاتی.....بدن تپ کر بالکل تندور بن جاتا ہے.....آنکھیں لال ہوجاتی ہیں.....پیٹ میں درد کی شدت اس قدر ہوجاتی ہے کہ چوہان صاحب کے منہ سے نکلنے والی چیخیں آدمی سُن کر برداشت نہیں کرسکتا تھا.....

☆☆☆

سب رشتہ دار، ماں اور ساکشی ہسپتال میں خانہ بدوشوں کی طرح حال سے بے حال پڑے ہوئے ہیں.....چوہان صاحب کو آئی سی یو میں بھرتی ہوئے پندرہ روز کے قریب ہوجاتے ہیں.....ساکشی اور ماں کا تو رو رو کر بُرا حال ہوجاتا ہے۔انھیں اپنی سُدھ بُدھ بھی باقی نہیں رہتی.....بچوں کو نانی کے گھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ساکشی کی بھی بری حالت ہوجاتی ہے۔سب لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر وہ کچھ نارمل ہوتی ہے.....ڈاکٹروں کی تمام تدابیر فیل ہوجاتی ہیں۔ڈاکٹر ساکشی کے بھائی روی کانت کو بُلاتے ہیں، روی کانت ڈاکٹر سے پوچھتا ہے۔''ڈاکٹر صاحب.....! آخر چوہان صاحب کو کیا بیماری ہے.....؟ وہ کیوں اچھے نہیں ہورہے ہیں.....؟

ڈاکٹر ایک لمحے کو خاموش ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر کے ماتھے پر گھبراہٹ سے پسینے کی بوندیں اُبھر آتی ہیں۔

''آپ بولتے کیوں نہیں.....؟ ڈاکٹر صاحب.....!! آخر بات کیا ہے.....؟''روی کانت سیریس ہوکر کہتا ہے۔

''ایکچوالی بات یہ ہے کہ انہیں ''پیے ٹائٹس'' ہوگیا ہے.....''ڈاکٹر جواب دیتا ہے۔

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر صاحب.....!! آپ ہمیں سیدھی بھاشا میں بتایئے.....''

ڈاکٹر ایک لحظہ کے لیے پھر سکوت اختیار کرلیتا ہے.....کچھ لمحہ رُک کر وہ گویا ہوتا ہے۔

''ان کا جگر پھیل ہوگیا ہے۔مسلسل شراب نوشی کے عمل نے انھیں اس اسٹیج پر پہنچا دیا ہے.....پچھلی مرتبہ جب یہ بیمار ہوئے تھے تو ہم نے اپنی تمام تر کوششوں سے بیماری پر قابو پالیا تھا.....مگر اب معاملہ بہت گمبھیر ہوگیا ہے.....ایسی گمبھیر حالت میں ''لیوَر ٹرانسپلانٹ'' ہی اس کا ایک واحد علاج ہے۔''

''لیوَر ٹرانسپلانٹ'' کا مطلب.....؟ روی کانت استعجابی کیفیت میں استفسار کرتا ہے۔

www.urduchannel.in

''لیور ٹرانسپلانٹ کا مطلب ہے جگر بدلنا.....'' ڈاکٹر جواب دیتا ہے۔

روی کانت چاہتا ہے کہ اس بات کا ساکشی کو پتا نہ چلے۔ مگر وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی سب کچھ سُن لیتی ہے۔

چوہان صاحب کو نئی زندگی مل جاتی ہے.....ساکشی کے سامنے وہ اپنے آپ کو ایک مجرم سمجھتے ہیں..... یکا یک انھیں ضمیر کی آواز چونکاتی ہے۔

''اس میں کیا شک ہے کہ تم ساکشی کے مجرم ہو.....کیا نہیں کیا تم نے اس بے چاری کے ساتھ.....! کتنے ظلم برداشت کیے اس نے تمھارے.....کب اس کو تم نے پتنی سمجھا.....کیا حق دیا تم نے اسے..... ہمیشہ تم نے اس کا سوشن ہی کیا ہے.....ایک سوشن نہیں ہزاروں سوشن کیے ہیں تم نے اس کے ساتھ.....بیوی تو تم نے سمجھا ہی نہیں اس کو.....ایک داسی کی طرح زندگی گزاری ہے اس نے..... چودہ سال کا بن باس کاٹا ہے اس نے.....وہ چاہتی تو تمھاری طرح، وہ بھی دوسروں کی بانہوں میں جا سکتی تھی.....جنسی آسودگی حاصل کر سکتی تھی لیکن تمھیں اس نے پتی پرمیشور سمجھا.....اور آج.....آج تو اس کا قد ہزاروں گُنا اونچا اُٹھ گیا ہے، بھلے ہی وہ تمھاری پتنی ہو اور تم اس کے شوہر.....دن اور رات ایک کر دیا اس نے تمھاری خدمت میں..... پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے اسے جاگتے ہوئے.....تمھیں تو معلوم بھی نہیں کتنی تیمارداری کی ہے اس نے تمھاری..... جب تک تمھارا ''لیور ٹرانسپلانٹ'' کامیاب نہیں ہوا، اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں رُکے.....ایشور سے آرادھنا کرتی رہی وہ رو رو کر.....اگر تمھاری بیماری کسی سے نہیں دیکھی گئی تو اس کا رونا بھی کسی سے نہیں دیکھا گیا.....پورے ایک مہینے اس نے کمر ٹیک کر نہیں دیکھی.....آنکھ سوج کر موٹی موٹی ہو گئیں ہیں.....کتنا گھگھلا ہٹ پن آ گیا ہے، اس کی آنکھوں میں.....اور ایک تم ہو کہ کبھی تم نے اسے سمجھا ہی نہیں.....''

تبھی ان کے ضمیر کی باہمی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔ اور وہ سسکیاں بھر بھر کر زور زور سے رونے لگتے ہیں..... چوہان صاحب کی آواز سُن کر، ساکشی کمرے کے اندر داخل ہوتی ہے۔

''میں تمھارا گناہ گار ہوں.....میں بہت گھٹیا آدمی ہوں، ساکشی.....!! کمینہ..... پاجی.....خود غرض.....'' وہ پھر زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔

''ساکشی مجھے معاف کر دو.....کبھی سمجھا ہی نہیں میں نے، تمھیں.....!! تم واقعی اکیسویں صدی کی دیوی ہو.....''

''نہیں.....نہیں.....ایسا مت کہئے.....تم تو میرے دیوتا ہو.....''

دونوں بغل گیر ہو کر ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگتے ہیں.....اور دونوں محبت بھرے مقروض جذبے میں تحلیل ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

○

www.urduchannel.in

عبدالرحمن*

''دہشت گرد کون''

گھنٹی بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہی تھے کہ اس نے اپنی کتابیں درست کر کے بیگ میں رکھ دیں اور بالکل تیار ہو کر بیٹھ گیا تا کہ گھنٹی کے بجتے ہی کلاس روم سے نکل جائے۔

آج اُسے کام کے سلسلے میں اسکول سے سیدھا بینک جانا تھا۔ جس کے لیے اس کی ماں نے صبح نکلتے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ ''بیٹا، چھٹّی کے بعد بینک کا کام کرتے ہوئے آنا''۔ گھنٹی بجتے ہی وہ کلاس روم کے باہر اس لیے نکل جانا چاہتا تھا کیوں کہ چھٹی ہوتے ہی ذرا سی دیر میں اسکول کے گیٹ پر طلباء کی بھیڑ جمع ہو جائے گی اور بینک پہنچنے میں تاخیر ہوگی۔

گھنٹی بجتے ہی اس نے اپنا بیگ کندھے پر ٹانگا اور کلاس روم کے باہر آ گیا۔ دوسرے کلاس روم سے بھی جوق در جوق طلباء نکل کر گیٹ کی جانب دوڑنے لگے۔ وہ بھاگتا ہوا اسکول کے گیٹ سے باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوڑتے ہوئے لڑکے نے پوچھا جو اس کے ساتھ ہی کلاس روم سے باہر آیا تھا۔ ''دوڑ کیوں رہے تھے یار، تھکا دیا تم نے''۔

اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بینک تک جانا ہے یار، اس لیے''۔

اور دونوں پیدل ہی بینک کی جانب چل دیے۔ جو اسکول سے تقریباً پانچ سو میٹر کی مسافت پر واقع تھا.....۔

بینک کے کام سے فارغ ہو کر دونوں قصبے کی مین سڑک پر آ گئے۔ تھوڑی دیر وہیں پر کھڑے دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ساتھی کو یہ کہتے ہوئے رُخصت کر دیا کہ یار مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ وہ ہاتھ لہراتے ہوئے ہوا میں Bye,Bye کہتے ہوئے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ پیدل، پیدل تھوڑی مسافت طے کر کے وہ اس چوراہے پر آ گیا جہاں سے اس کے گاؤں کے لیے سڑک جاتی تھی۔ وہیں پر سڑک کے کنارے وہ کھڑا سواری کا انتظار کرنے لگا۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح آٹھ بجے گھر سے کچھ دور پیدل چل کر سڑک پر آتا پھر وہاں سے سواری میں بیٹھ کر

* شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.urduchannel.in

قصبے کے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اسکول سے واپسی میں پیدل ہی چوراہے تک آتا جہاں سے اس کے گاؤں کے لیے سواری ملتی تھی۔

روزانہ کی طرح آج بھی وہ اسی چوراہے پر کھڑا تھا، جہاں سے اس کے گاؤں کے لیے سواری ملتی تھی۔ چوراہے پر آمدورفت جاری تھی۔ لوگوں کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ چوراہا قصبے سے باہر تھوڑی دور پر واقع تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر ایک دو موٹر سائیکل، سائیکل والے آجا رہے تھے۔ دو ایک لوگ پان کی دُکان پر کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ چائے کی دُکان پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پاس ہی میں ایک جنرل اسٹور کی دُکان بھی تھی۔ چوراہے کے آس پاس ہی سڑک کے کنارے ٹھیلے پر سبزی اور پھل فروخت کرنے والے زور زور سے آوازیں لگائے جا رہے تھے۔ انتظار کرتے ہوئے اُسے دیر ہو چکی تھی۔ لیکن اب تک کوئی سواری نہیں آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک پولیس کی گاڑی اس کے پاس آ کر رُکی۔ ایک حولدار گاڑی سے باہر آیا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تیرا''۔ پہلے وہ تھوڑا سا ہچکچایا۔ پھر جواب دیتے ہوئے بولا!

''کریم نام ہے صاحب''۔

نام سنتے ہی حولدار بے ساختہ بولا، ''سالے کٹوے''۔ اور داروغہ کی جانب (جو گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا) دیکھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایسا کرنے میں اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں بازو کی ہتھیلی پر بالکل کھڑا کر کے رکھا تھا۔ جیسے چھری کو پکڑا جاتا ہے۔

سڑک کے دوسری جانب تھوڑی ہی مسافت پر کھڑے دو تین لوگ گاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ ان لوگوں کو آتا ہوا دیکھ کر گاڑی میں بیٹھا ایک دوسرا حولدار باہر نکلتے ہوئے بولا۔

''کیا ہے۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے۔ کیا جو منھ اُٹھائے چلے آ رہے ہو۔ چلو، جاؤ'' ''سالو'' یہ لفظ اس نے ذرا آہستہ سے کہا تھا۔ کریم کے پاس کھڑا حولدار زور سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''یہاں کیا کر رہا ہے بے سالے.....،

کریم نے کہا۔ ''سواری کا انتظار کر رہا ہوں صاحب''۔

دوسرا حولدار بھی اس کے پاس آیا اور بولا کیا کہا، ابے سالے مادر.....، جھوٹ بول رہا ہے۔

''جھوٹ نہیں بول رہا ہوں صاحب''، گالی مت دو ۔ کریم بولا

حولدار نے رعب جماتے ہوئے کہا۔ ''اکڑ دکھاتا ہے سالے۔ گالی نہ دوں'' اور اپنے دوسرے حولدار ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مار سالے کٹوے کو اس کی جات (ذات) کا.....، اور ایک ژنّاٹے کا تھپڑ کریم

www.urduchannel.in

کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ غصّے سے بولا۔ ''مار کیوں رہے ہیں صاحب۔'' ''کیا غلطی کی ہے میں نے''۔

دوسرے حولدار نے غُصّے سے کہا ''اکڑتا ہے سالے'' قصور پوچھتا ہے۔ رُک، دکھاتا ہوں قصور کیا ہے۔ اور تھپڑ، گھونسے اور بینت (لاٹھی) کی آوازوں کے ساتھ درد سے نکلتی چیخ فضا میں گونجنے لگی۔

دونوں حولداروں نے کریم کو خوب مارا پیٹا۔ وہ بالکل بے دم اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے زمین پر پڑا دونوں ہاتھ جوڑے روئے جا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ رونے کی آواز سُن کر لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ پولیس کی وجہ سے کوئی بھی کچھ بول نہیں رہا تھا، صرف کھڑے تماشا ہی دیکھ رہے تھے۔ کریم کو درد سے کراہتا دیکھ کر بھیڑ سے نکل کر ایک شخص تھوڑا آگے آیا اور حولدار سے بولا۔ ''بات کیا ہے حولدار صاحب، بچّے کو کیوں مار رہے ہیں''۔

اس شخص کی جانب بغیر دیکھے ہوئے حولدار کریم کو پیر سے مارتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ سالے لڑکی بھگا کر لے جائے گا۔ لوگوں کو دیکھ کر کریم کچھ بولنے ہی جا رہا تھا کہ دوسرے حولدار نے مارتے ہوئے کہا ''چُپ سالے چُپ۔'' زیادہ بھیڑ اکٹھا ہوتے دیکھ گاڑی میں بیٹھا داروغہ بولا۔

''اُٹھالاؤ، سالے کو گاڑی میں ڈالو۔ تھانے لے چلتے ہیں۔''

.....حولداروں نے کریم کو کھینچ کر گاڑی میں ڈال دیا۔ اور لے کر وہاں سے نکل گئے۔.....

داروغہ کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے ایک کنارے کھڑی کر دی۔ یہ جگہ بالکل سُنسان تھی سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ راستہ بھی بالکل سنسان تھا۔ کہیں کوئی شخص آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھیت اور درختوں کے علاوہ دور۔ دور تک آبادی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں کی چہچہاہٹ سے کبھی کبھی فضا میں پھیلی خاموشی ٹوٹ جاتی تھی۔

گاڑی کے پچھلی سیٹ پر بیٹھے دونوں حولدار کریم کو کھینچتے ہوئے گاڑی سے نیچے اُتار لائے۔ گاڑی سے باہر آتے ہوئے داروغہ نے حولدار سے پوچھا۔

''کیا نام بتایا تھا سالے نے'' ؟

''کریم بتایا تھا صاحب''

حولدار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اپنے بائیں ہاتھ کی مُٹّھی میں کریم ء کے سر کے بال پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچتے ہوئے داروغہ نے دو تین تھپّڑ رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''اکڑ دکھا رہا تھا سالے کٹوے،۔ کریم ہاتھ جوڑ کر سسکتے ہوئے بولا۔

''صاحب میں نے کیا غلطی کی ہے جو آپ مار رہے ہیں''۔ مجھے جانے دیجیے صاحب''۔

www.urduchannel.in

''جانے دوں'' یہ کہہ کر داروغہ نے ایک زوردار کِک (Kick) اس کے دونوں پیروں کے بیچ میں ماری۔ کریم کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔ اور وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ وہ ایسے تڑپ رہا تھا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ درختوں پر بیٹھے خوف زدہ پرندے اسے درد سے تڑپتا دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ اُڑ کر دور فضاؤں میں چلے گئے۔

داروغہ نے دونوں حولداروں سے کہا ''اُٹھاؤ سالے کو.....'' دونوں نے کریم کے بازوؤں کو پکڑ کر ٹانگ لیا۔ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک حولدار نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''کھڑا ہو ٹھیک سے.....''۔

کریم بار۔ بار کھڑا ہونے کی کوشش کرتا لیکن تکلیف کی وجہ سے اس کے پاؤں جسم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے وہ بیٹھا ہی جا رہا تھا۔ حولدار نے اس کے بازو اوپر کھینچتے ہوئے اپنی بینت اس کے دونوں پیروں کے درمیان لگا دی اور کریم کو اسی پر بٹھا دیا۔ داروغہ کی جانب دیکھتے ہوئے حولدار بولا۔

''دیکھ کیا رہے ہیں صاحب اُڑا دو سالے کٹوے کو''۔ دوسرا حولدار گھبراتے ہوئے بولا۔

''دماغ خراب ہے کیا بک رہا ہے ہوش میں تو ہے، مذاق سمجھ رہا ہے کیا ''اُڑا دو''، ''اُڑا دو''۔

حوالدار گھبرایا ہوا داروغہ سے بولا۔

''نہیں صاحب، بہت مار پیٹ دیا ہے ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی''۔

داروغہ نے حولدار کی جانب دیکھ کر چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اپنے جوتے سے ریوالور نکال کر کریم کے سینے پر رکھ دیا۔ کریم بالکل سہم گیا۔ شاید موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو جاری تھے لیکن آواز کہیں گُم ہو گئی تھی۔

داروغہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ہکلاتے ہوئے کریم بولا۔

''صاحب مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اسکول کی چھٹی کے بعد میں اپنے گھر جا رہا تھا''۔

''چُپ سالے.....'' ایک حولدار نے اونچی آواز میں کریم سے کہا، اور داروغہ کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''دیکھ کیا رہے ہیں صاحب؟ گھوڑا دبایئے اور ختم کر دیجیے سالے کٹوے کو۔ سالا آگے چل کر آتنکوادی ہی بنے گا''۔

داروغہ نے بھی یہی الفاظ اپنی زبان پر دہرائے۔

''سالے کٹوے، آتنکوادی تیری جات (ذات) کا.....''،

ایک زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ ایک دلخراش چیخ پوری فضا میں گونج گئی۔ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے خوف زدہ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے اُڑ کر دور آسمانوں میں نکل گئے.....۔ ○

www.urduchannel.in